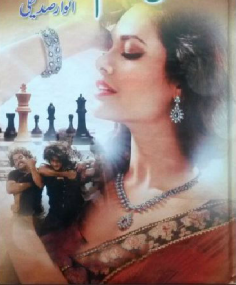


# ڈبل گیم

انوار صدیقی



ایک ایکسائز آفیسر کی پیشہ وارانہ زندگی میں  
پیش آنے والے جرم و سزا کے پیچیدہ کیسوں کی روداد

# ڈبل گیم

راوی: فیصل انوار

تحریر: انوار صدیقی

القُرَیْشِی پبلی کیشنز

سٹرکٹ روڈ چوکے اردو بازار لاہور

فون: 042-37652546, 37668958

www.alquraish.com email: info@alquraish.com

## جوڑ توڑ

خان گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کا مال بردار ٹرک نیٹھل ہائی وے پر برق رفتاری سے اپنی مسافت طے کرتا ہوا لمحہ بہ لمحہ شہری حدود کے قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص دراز قد اور چھریرے جسم کا مالک تھا۔ اس کے ہاتھ انتہائی مستعدی سے اسٹیرنگ پر جمے ہوئے تھے اور عقابی نظریں سامنے سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اگلی نشست پر تنہا نہیں تھا۔ اس کے برابر ادھیڑ عمر کا ایک اور شخص بھی بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر کھنی داڑھی اور بڑی بڑی مونچھیں نظر آ رہی تھیں، جنہیں وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے یوں تاؤ دینے لگتا تھا، جیسے اپنی شخصیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ ڈھیلے ڈھالے اور قدرے میلے شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔ سر پر موجود پکڑ چامی گرد آلودھی۔ اپنی گود میں اس نے بڑی بے پروائی سے دیہی ساخت کی ایک خود کار رائل ڈال رکھی تھی، جس کے میگزین میں پینچس گولیاں موجود تھیں۔

اس وقت رات کے ڈھائی تین کا عمل رہا ہو گا۔ ہائی وے پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ سامنے سے آنے والی اکاؤ گاڑیاں ٹرک کی تیز روشنی کی وجہ سے ڈپرمانتی ہوئی گزر رہی تھیں لیکن ٹرک ڈرائیور نے ان پر ایک ذرہ برابر توجہ دینا بھی ضروری نہیں سمجھی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آتا تھا۔ البتہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے اس کی نظریں اپنی ریڈیم ڈائل والی پرانی دستی گھڑی کی طرف گھوم جاتی تھیں۔ شاید اس طرح وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کے سلسلے میں صحیح وقت کا تعین کر رہا تھا۔

”کیا بات ہے شیرا؟“ خاصی دیر کی خاموشی کے بعد ادھیڑ عمر والے شخص نے حسب عادت اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ ”آج تو بہت چپ چپ سا ہے۔ کہیں تیری لیلیٰ کے باپ نے اپنی چھوری کو تجھ سے ملنے جلنے کو منع تو نہیں کر دیا؟“

”نہ تو جب بولے گا، بے سُر ہی بولے گا۔“ شیرا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اس بڑھے کھوسٹ کی بھلا کیا بھلا“ شیرا کی عاشقی مانتی کے معاملے میں روڑا اٹکانے کی

بہترین کتابیں.....  
جدید انداز اور معیار کے ساتھ  
ناشر: محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اوّل..... 2014ء

مطبع..... نیر اسد پریس

کمپوزنگ..... القریش گرافکس

قیمت..... 300/- روپے

کوشش کرے۔ جس دن اس نے ایسا کیا، اسی دن سالے کوڑک کے نیچے پھل کر ادھر والے کی خدمت میں پارسل کر دوں گا، وہ بھی بغیر ٹکٹ کے۔“

”اب توڑک کے بڑے اڈے پر بھی تیرے اور تیری لیلیٰ کے بارے میں لوگوں نے کھسر پھسر شروع کر دی ہے۔“ داڑھی والے نے جس کا نام دادل تھا، معنی خیز انداز میں الفاظ چباتے ہوئے کہا۔ ”میری مان تو دیر کرنے کے بجائے دو بول کسی قاضی سے پڑھو لے۔ چڑیا ایک بار بچرے میں بند ہو جائے تو پھر وہیں پھدکتی اور چپھکتی رہتی ہے۔ ادھر ادھر دانہ پکنے کے لئے منہ نہیں مارتی پھرتی۔“

”دادل.....!“ شیرا کے لہجے میں ناگواری آگئی۔ ”جانتا ہے، ٹو کیا بکواس کر رہا ہے؟ تیری میری پرانی یاری اور سا بھانہ ہوتا تو.....“

”گرمی نہ کھا میرے یار!“ دادل نے جلدی سے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تیرے فائدے کی بات کی تھی۔ آخر کب تک الاؤ کے قریب بیٹھا ہاتھ تپاتا رہے گا؟ ابھی سے رضائی دلائی کا بندوبست کر لے، ورنہ سردی زیادہ پڑی تو بس اندر ہی اندر ٹھٹھ کر رہ جائے گا۔“

”فکر نہ کر۔ دو چار کامیاب پھیرے اور لگا لینے دے۔ اس کے بعد اس سالے دھندے کو ہی لات مار دوں گا۔“

”کیا مطلب؟“ دادل چونک اٹھا۔ ”جانتا ہے ٹو کیا کہہ رہا ہے؟“

”کیا؟“

”سیٹھ تیرے جیسے آدمی کو آسانی سے نہیں چھوڑے گا۔“

”کیوں؟..... کیا میں نے تمام زندگی کی غلامی کا پٹا لکھ کر دیا ہے جو سیٹھ مجھے باندھ کر رکھے گا؟“

”یہ بات نہیں ہے، میرے یار!“ دادل نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”گاڑی کا جو پڑھ سب سے کارآمد ہو، اسی پر سب سے زیادہ دھیان دیا جاتا ہے۔ اور پھر ہم جس راستے پر قدم ڈال چکے ہیں، اس میں پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔“

”ٹو بیٹھ اور بکری کی بات کر رہا ہے، دادل! میزانا م شیرا ہے، شیرا..... کو لہو کا تیل نہیں ہوں، جس کی آنکھ پر پٹی اور گلے میں کھٹی ڈال کر جوت دیا جاتا ہے۔“ شیرا نے دبنگ آواز میں کہا۔ ”ابھی تک اس دھرتی پر کوئی ایسی باڑی نہیں جس میں شیرا کو باندھ کر رکھا جاسکے۔ اگر سیٹھ نے میرے آڑے آنے کی کوشش کی تو یہ سودا اسے بہت مہنگا پڑے گا۔ اس کے ہزاروں راز دفن ہیں اس سینے کے اندر۔“

”ایک بار پھر غور کر لے، شیرا! سیٹھ تیری ہر جائز اور ناجائز بات ماننے کو تیار ہو سکتا ہے،

لیکن وہ تجھے آسانی سے چھوڑنے پر کبھی آمادہ نہیں ہو گا۔“ دادل نے اسے کن انکھوں سے دیکھتے ہوئے عجیب بہم انداز میں کہا۔ ”اور پھر یہ دھندا چھوڑ کر ٹو کرے گا بھی کیا؟“

”یہ سوچنا میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تیرا یا سیٹھ کا نہیں۔“

دادل نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، اسے بخوبی علم تھا کہ سیٹھ کتنے من مانے اصولوں اور سفاک طبیعت کا مالک تھا۔ کام کرنے والوں کے سلسلے میں اس نے کبھی کبھو سے کام نہیں لیا تھا، کسی کامیاب پھیرے کے بعد وہ اکثر طے شدہ کمیشن یا اجرت کے علاوہ اپنے کارندوں کو انعام و اکرام سے بھی نوازتا رہتا تھا۔ لیکن وہ لوگ جو اسے چھوڑ کر علیحدہ ہونے کی کوشش کرتے تھے، ان کے لئے سیٹھ کا ایک ہی فیصلہ ہوتا تھا۔ موت کا اٹل حکم۔ سیٹھ کے حکم پر دادل بھی اب تک تین باغیوں کو ٹھکانے لگا کر خود اپنے ہاتھوں سے دفنانے کا اذیت ناک کام سرانجام دے چکا تھا۔ چند لمحے تک وہ دل ہی دل میں کوئی ایسی تدبیر سوچتا رہا، جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی پر کوئی خراش بھی نہ آنے پائے۔ دوسروں کے مقابلے میں شیرا سے اس کا پرانا یار نہ بھی تھا۔ دونوں میں خاصی گاڑھی چھنی تھی۔ بڑے کاموں میں سیٹھ ان دونوں کو ہمیشہ شانہ بشانہ رکھتا تھا۔ چنانچہ دادل کو کسی قیمت پر بھی یہ منظور نہیں تھا کہ شیرا پر کوئی بری گھڑی آئے اور وہ خاموش تماشا بنی رہے۔

دادل ابھی اپنی سوچوں میں غرق تھا کہ شیرا کی سرسراتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

”سرخ بتی۔ آگے خطرہ ہے۔“

دادل نے چونک کر سامنے کی جانب دیکھا، پھر اس کے لہو کی گردش بھی یلخت تیز ہو گئی۔ تقریباً سو فٹ کے فاصلے پر سرخ رنگ کی ایک روشنی بار بار جل بجھ رہی تھی۔ یہ سنبل اسی وقت دیا جاتا تھا، ج آگے کسی قسم کا خطرہ درپیش ہوتا تھا۔

”کیا فیصلہ ہے، شیرا؟“ دادل نے رائفل پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔ ”مقابلہ یا فرار؟“

”فرار۔“ شیرا نے جواب دیا، پھر اس نے بڑی مہارت سے ٹوک کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔ ”اس پھیرے کے سلسلے میں سیٹھ نے یہی اشارہ دیا تھا کہ مقابلے کی کوشش نہ کی جائے۔“

”اور مال؟“

”یہ سوچنا ہمارا نہیں، سیٹھ کا کام ہے۔“ شیرا نے کہا۔ ”میں رفتار اور کم کرتا ہوں۔ ٹو پھلانگ لگا کر کچے کی طرف نکل جا۔“

”اور تم؟“

”میری فکر مت کر، دادل! میں ان کے ہاتھ آنے والی اسامی نہیں ہوں۔ کل دس بجے ہماری ملاقات گوٹھ کی اسی دکان پر ہوگی، جہاں سے ہمیں اگلی ہدایت ملے گی۔ اچھا خدا حافظ!“ شیرا نے بریک پر قدموں کا دباؤ ایک دم بڑھایا تو نائر چڑھانے کی آواز سنانے میں دور تک پھیلی، اس کے ساتھ ہی دادل نے بھی خدا حافظ کہتے ہوئے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر رائل سمیت باہر چلا گیا۔ دادل کے چلاؤ لگانے کے بعد شیرا نے بھی اپنی جانب کا دروازہ کھولا اور ہوا میں قلابازی کھاتا ہوا سڑک پر پہنچ گیا۔ پھر اس نے ٹرک کی دائیں جانب ناک کی سیدھ میں پوری رفتار سے دوڑنا شروع کر دیے تھے۔ اس کی رفتار بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔



گہرے آسمانی رنگ کی کربولا ہر چند کہ نئی تھی، پھر بھی سڑک کے جا بجا ناہموار ہونے کی وجہ سے ہچکولے کھا رہی تھی۔ پچھلی سیٹ پر ایک شخص تھری پیس سوٹ میں بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ پرانی یادوں کو سوچنے میں مستغرق تھا۔ وہ یادیں یقیناً خوشگوار نہیں تھیں، ورنہ اس کے چہرے سے ناگواری اور اُجھٹن مترشح نہ ہوتی۔ اس کا نام خان محمد تھا۔ اپنی سیاسی پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے وہ معمولی درجے کا ایک ایڈووکیٹ تھا، جو چھوٹے موٹے کیس لینے میں بھی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کرتا تھا، تب کہیں جا کر مشکل سے دفتر کا خرچ اور گھر کے اخراجات جیسے تیسے پورے ہوتے تھے۔ شراب کی لت اسے شروع سے تھی، لیکن آمدنی کم ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ تر سستی اور گھٹیا قسم کی شراب استعمال کرتا تھا۔ آبکاری کے ایک بڑے آفیسر سے پرانے تعلقات کی وجہ سے اسے مہینے دو مہینے میں خوشامدی کرنے اور جوتے گھسنے کے بعد جب کبھی اعلیٰ درجے کی کوئی بوتل مفت میں مل جاتی تو وہ دن اس کے لئے عید سے کم نہیں ہوتا تھا۔

خان محمد چونکہ آبکاری آفیسر کے ملنے جلنے والوں میں شمار کیا جاتا تھا، اس لئے ماتحت عملہ بھی اس سے بخوبی واقف تھا۔ کبھی کبھار وہ دوستی کی آڑ میں کسی انسپکٹر سے بھی ایک آدھ بوتل جھٹک لیا کرتا تھا۔ لیکن ایک بار اسے بڑی سخت اٹھانی پڑی تھی۔

انسپکٹر فریدی نے جب شراب کا کیس پکڑا تو خان محمد بڑی امیدوں کے ساتھ اس کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ چونکہ وکیل تھا، اس لئے سارے ہتھکنڈوں سے واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسمگلنگ کی روک تھام کرنے والوں میں بھی بے شمار ایسی کالی بھیڑیں موجود تھیں، جو پکڑی جانے والی اصل مقدار یا تعداد میں ڈنڈی مار کر اپنے وہ اخراجات پورے کرتی تھیں، جو حکومت کی طرف سے انہیں ملتے تھے۔ ان افسروں کو ایک خاص حد تک اس بات کی اجازت

بھی تھی جو ہر چند کہ قانونی نہیں تھی، پھر بھی اعلیٰ افسران چونکہ اس بات سے واقف تھے کہ کسی کیس کے پیچھے کتنے اخراجات ماتحت عملے کی جیب خاص سے ادا ہوتے تھے۔ ماتحت عملہ اسی رعایت سے فائدہ اٹھا کر اکثر و بیشتر آٹے میں نمک ملانے کے بجائے نمک میں آٹا ملا دیا کرتا تھا۔ مجید کل جانے کی صورت میں وہ ہتھیائی گئی اسی اضافی رقم میں سے متعلقہ افسران کو نذرانہ پیش کر کے گلو خلاصی بھی حاصل کر لیتا تھا۔

بہر حال، خان محمد جب ایک غیر ملکی برانڈ بوتل کی خواہش لئے انسپکٹر فریدی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ماتحت عملے کا، جن میں سپاہیوں اور جمعدار کی تعداد زیادہ تھی، ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ جو افراد اس جھگے سے وابستہ رہ چکے ہیں، وہ بخوبی اس بات سے واقف ہوں گے کہ کسی کیس کی کامیابی کی صورت میں متعلقہ شعبے کے کارندوں کے چہرے خوشی سے دھنکتے لگتے ہیں۔ اس کامیابی سے ان کی معاشی زندگی کا بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ جتنی ہیرا پھیری ہوتی ہے، اسی مناسبت سے ان کی آسودگی اور خون کی گردش میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اور پھر یہی عارضی خوشی انہیں کسی خون آشام درندے کی طرح کسی نئے شکار پر جھپٹ پڑنے کی تحریک میں شد و مد پیدا کرتی ہے۔

انسپکٹر فریدی کو منشیات کے شعبے میں آئے بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، لیکن اس نے اپنی ذہانت، دور اندیشی اور معاملہ فہمی کے علاوہ اپنی بے جگرگی کا مظاہرہ کرنے کے بعد بہت جلد اعلیٰ افسران کی نظروں میں ایک خاص مقام پیدا کر لیا تھا۔ جھگے کے تمام متعلقہ افراد غیر متعلقہ افراد اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ جو کوئی اور نہ کر سکے، وہ انسپکٹر فریدی کو گزرتا تھا۔ اس کے لئے حسبِ منشا کسی کیس کا پکڑنا بہت آسان تھا۔ ایک طرف وہ جھگے کی خوشنودی حاصل کرتا تھا تو دوسری طرف کاروباری ناخداؤں کے دلوں میں اس کا اعتماد بھی اپنی جڑیں مضبوط کرتا جاتا تھا۔ اس کے پاس اللہ دین کا چراغ نہیں تھا، جو اس کی شہرت کا سبب بنا تھا۔ وہ غرور اور بے خوف تھا۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے کا عادی تھا، اس لئے اپنی بھائی خاطر بے شمار بڑے تاجر یکے بعد دیگرے اس کے دوست بنتے گئے۔ وہ اس کی آنکھ کے اشاروں پر چلتے تھے، دنیا کے ہر دھندے میں الٹ پھیر اور نفع و نقصان کا ہونا قدرتی امر ہے۔ لیکن جہاں تاجر اور آجر میں گٹھ جوڑ ہو، وہاں نقصان کا احتمال بہت کم ہو جاتا ہے۔ انسپکٹر فریدی کی کامیابی کا بھی ایک اہم راز یہ تھا کہ وہ بڑی بڑی پارٹیوں کو اپنی منہمی میں رکھتا تھا۔ ایک طرف وہ چشم پوشی سے کام لے کر ان کا لا دھندا کرنے والوں کی بڑی بڑی کھپ نکلا دیا کرتا تھا اور بلا شرکتِ غیرے مالی منفعت حاصل کرتا تھا اور دوسری طرف اپنی شہرت کے گراف کی خاطر وہ ان ہی تاجروں کے ایسے مال پر ملی بھگت سے عقاب بن کر ٹوٹ پڑتا تھا، جس کی قیمت وصول کی جا چکی ہوتی تھی۔ ہر کیس وہ بڑے چیلنج اور ڈرامائی انداز میں کرنے کا

عادی تھا۔ زیادہ تر وہ چرس، افیون اور ہیروئن کے کیس میں دلچسپی رکھتا تھا۔ لیکن کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کی خاطر شراب وغیرہ کے کیس بھی تفریحا کر لیا کرتا تھا۔

اس وقت بھی وہ کسی فاحش جرنیل کی طرح اپنے مختصر مگر خوب صورت آفس میں بیٹھا حسب معمول سگریٹ کے لمبے کش لے رہا تھا، جب خان محمد داخل ہوا اور فریدی کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ غلط کام کرنے کے باوجود وہ بڑی کھری طبیعت کا مالک تھا۔ کسی سے ڈرنا یا مرعوب ہو جانا اس کی سرشت کے خلاف تھا۔ وہ ہر بات دو ٹوک اور ہر فیصلہ بر ملا کرنے کا عادی تھا۔ یہ بات معلوم ہو جانے کے باوجود، خان محمد اور اس کے آفسر میں گاڑھی چھتی تھی اور وہ دونوں ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھے۔ وہ خان محمد کو پسند نہیں کرتا تھا، اپنی مرضی سے وہ کسی کی خاطر کچھ بھی کر گزرتا تھا۔ لیکن دھونس دھڑلے سے کسی کو ایک پھوٹی کوڑی دینا بھی اس کی جارحانہ فطرت کے خلاف تھا۔ خان محمد کے کمرے میں قدم رکھتے ہی وہ اس کی آمد کا مقصد سمجھ گیا تھا۔ اس نے ایک بار اسے بڑی چٹکی نظروں سے دیکھا، پھر ہونٹوں پر وہی معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی، جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ اس نے خان محمد کو بیٹھنے کا اشارہ بھی نہیں کیا لیکن خان محمد اس کے باوجود اس کرسی پر بیٹھ گیا، جو ایک سپاہی نے اسے دیکھنے کے بعد دل برداشتہ ہو کر خالی کر دی تھی۔ خان محمد نے کرسی پر براہمان ہونے کے بعد ایک نظر ان بوتلوں پر ڈالی، جن کے لیبل کسی شفاف موتی کی طرح چمک رہے تھے۔ پھر فریدی کو تشریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے خوشامدی لہجے میں بولا۔

”اور سناؤ، دلبر! آج تو تم نے پھر لہا ہاتھ مارا ہے۔“

”یہ شکار تو لوٹریوں کے لئے ہے۔“ فریدی نے سپاہیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ورنہ ہم تو شیر کے شکاری ہیں۔“

”کس کا مال ہے؟“ خان محمد نے دبی زبان میں پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے، اسامی کیسی ہے؟“

”ہے ایک اے ایس آئی۔“ فریدی نے سگریٹ کا طویل کش لے کر دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔ ”اس نے اپنی وردی کی دھونس میں ہمارے ایک سپاہی کو گولی دی تھی۔ آج ہم نے اس کے سالے کے گولی فٹ کر دی تو ناچتا پھر رہا ہے۔“

”نام کیا ہے اس کا؟“

”رحمت مرزا۔ مگر آج زحمت میں پڑ گیا۔“

”اسے تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ خان محمد نے تیزی سے کہا۔ ”معاطے کی کوئی بات ہوئی یا نہیں؟“

”نہیں.....“ فریدی نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”لیکن ساری خدائی ایک طرف

اور جو روکا بھائی ایک طرف والا معاملہ درپیش ہے۔ اس لئے جال میں تو اسے پھنسا ہی پھنسا ہے۔“

”کہاں تک توڑ کی امید ہے؟“

”بہت زیادہ نچوڑا تو آٹھ دس میں بات ہوگی، جس سے کم از کم سپاہیوں کی داڑھ ضرور گرم ہو جائے گی۔“

”میں جانتا ہوں، دلبر! اس سے چار گنا رقم تو تم ریس کے گھوڑوں اور کوٹھے کی گھوڑیوں پر محفل میں اڑا دیتے ہو۔“ خان محمد نے خوشامدی انداز میں ہنس کر کہا، پھر میز پر کھنی ٹکا کر کسی سردار کھانے والے گدھ کے مانند گردن لمبی کرتے ہوئے رازداری سے بولا۔ ”کہو تو میں معاملہ فٹ کرادوں؟..... یار ہے اپنا، ایک دو معاملات میں اس کے کام بھی آچکا ہوں۔“

”شہنشاہ اکبر سے بات کرلو۔“ فریدی نے اکبر نامی سپاہی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اسی کی شان میں گستاخی کی تھی تمہارے یار نے۔“

”میرے ہاتھ میں اس کی ایک ڈکھتی رگ بھی ہے۔“ خان محمد نے اکبر والی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے معنی خیز انداز اختیار کیا۔ ”تم آٹھ دس کی بات کر رہے ہو اور میں چاہوں تو اسے بیس تک بھی تھسٹ سکتا ہوں۔ سوچ لو۔“

”کمیشن کیا لو گے؟“ فریدی نے تعجب آمیز اور سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”دس فیصد اور..... دو بلیک ڈاگ۔“ خان محمد نے ایک بار پھر لچائی ہوئی نگاہوں سے شراب کی بوتلوں کی طرف دیکھا، جو زمین پر بھی ہوئی تھیں۔

”بلیک ڈاگ۔“ فریدی مسکرایا۔ ”پینے کے معاملے میں بھی اقرباء پروری سے کام لے رہے ہو؟“ لیکن فریدی کا بھرپور طنز خان محمد کے سر سے گزر گیا۔ ہونٹوں پر خشک سالی کے عالم میں زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

”ویسے تو جانی داکر بھی چلے گی، لیکن بلیک ڈاگ منہ کو لگ گئی ہے۔“

”کیوں اکبر؟“ فریدی نے سپاہی کو مخاطب کیا۔ ”تو کیا بولتا ہے؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ سر.....! اکبر نے خان محمد کو قدرے سہمے ہوئے انداز میں دیکھتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔ ”خان صاحب، اپنے بڑے صاحب کے دوستوں میں سے ہیں، اس لئے.....“

”پھر دم ہلانا شروع کر دی، ٹوٹے۔“ فریدی کو غصہ آ گیا۔ ”کتنی بار سمجھا چکا ہوں کہ تجھے اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو سینہ تان کر چلا کر۔ یہ چھوٹے صاحب اور بڑے صاحب کی بات کر کے میرا موڈ خراب نہ کیا کر۔ اس حمام میں سب سالے ننگے ہیں۔ ویسے تو مونچھوں پر تاؤ

دیتے ہیں، لیکن وقت پڑنے پر بکھروں کی طرح میدان چھوڑ کر بھاگ لیتے ہیں۔“

”آپ جو فیصلہ کر دیں صاحب!“ اکبر شپٹا گیا۔ ”مجھے سب منظور ہوگا۔“

”یہ بات ہے تو پھر اٹھا بلیک ڈاگ کی ایک بوتل اور خان محمد صاحب کے آگے ڈال دے۔“ فریدی نے حقارت سے کہا۔ ”ویسے بھی میں کسی کی دلالی کا مال کھانا حرام سمجھتا ہوں۔ اپنا شکار خود کر کے کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔“

خان محمد اپنی کرسی پر پہلو بدل کر رہ گیا، اسے فریدی کا انداز اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ فریدی اسے انسان سمجھ کر بوتل نہیں دے رہا، بلکہ کتاب سمجھ کر اس کے آگے ہڈی ڈالنے کی بات کر رہا ہے۔ ایک لمحے کو اس کی غیرت نے کسی دم توڑتے ہوئے جانور کی طرح زندگی برقرار رکھنے کی خاطر جوش مارا لیکن دوسرے ہی لمحوں میں اس کی ساری غیرت بوتل کے نشے میں ڈوب کر رہ گئی، اس نے بے غیرتی کی ہنسی ہنستے ہوئے اکبر سے بوتل لی اور کسی کتے ہی کی طرح ڈم ہلاتا ہوا فریدی کے دفتر سے باہر نکل گیا۔

آج ان ہی بیٹے ہوئے دنوں کی یاد اور فریدی کا کہا ہوا جملہ، خان محمد کے ذہن میں بری طرح کھلک رہا تھا، اب وہ فٹ پاتھ پر پیدل چلنے والا اور رکشوں میں سفر کرنے والا معمولی ایڈووکیٹ نہیں تھا، وہ جس سیاسی پارٹی سے وابستہ تھا، اس کے برسرِ اقتدار آتے ہی اس کی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہو گیا تھا۔ اب وہ محکمہ داخلہ کا ایک ایسا آفیسر تھا، آئی جی اور ڈی آئی جی بھی جس کی نگاہوں کے اشاروں کے محتاج رہتے تھے۔ اب اس کے پاس حکومت کی دی ہوئی برائڈ نیو اور جم جم کرتی کروڑا تھی، جس کا باردردی ڈرائیور اسے دور سے آتا دیکھ کر ہی لپک کر دروازہ کھول کر باادب کھڑا ہو جاتا تھا۔ وہ جب بھی کہیں جاتا، سادہ لباس میں کوئی نہ کوئی گاڑی بڑی مستعدی کے ساتھ اس کی حفاظت پر مامور رہتا تھا۔ اس وقت بھی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ ایک گاڑی موجود تھا، جو پوری طرح مسلح تھا۔

”کیا بات ہے، خان صاحب؟“ مچھلی نشست پر اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے

بڑے مدھم لہجے میں پوچھا۔

”آپ کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں؟ اب تو خطرہ ٹل چکا ہے۔“

”آں..... ہاں۔“ خان محمد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، پھر باپ کا ایک کش لگا

کر بولا۔ ”ایک اہم مسئلے پر غور کر رہا ہوں۔“

”کیا مطلب؟ کیا خدا نخواستہ ہمیں آپ کا تادلہ.....“

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس بار خان محمد نے کسی زہریلے ناگ کی طرح

پھٹکارنے ہوئے کہا۔ ”ایک پچھلا حساب یاد آ گیا۔ اسے چکتا کرنے کے بارے میں غور کر رہا تھا۔“

”کوئی ایسی ویسی بات ہو تو بندہ حاضر ہے۔ آپ حکم دے کر تو دیکھیں، لاش تو کیا، جسم کے ٹکڑوں کا بھی کوئی نشان نہیں ملے گا۔“

”میں جانتا ہوں۔ تم خاصے کام کے آدمی ہو۔“

”بس، آپ کا تابعدار ہوں جناب! آپ ہی کی بدولت روکھی سوکھی کھا کر گزرا کر رہا ہوں۔“ دوسرے شخص نے جوشیل سے ہی بہت گھاگ نظر آ رہا تھا، بڑے انکسار سے کام لیتے ہوئے کہا۔ خان محمد نے کوئی جواب نہیں دیا، باپ کا دھواں اڑانے لگا۔

تیس منٹ بعد اس کی کار سوسائٹی کے علاقے میں ایک شاندار بنگلے کے قریب پہنچی تو گیٹ پر موجود باردردی سپاہی نے لپک کر پھانک کھولا اور پھر سیلوٹ کرنے کی خاطر انٹینشن ہو گیا۔ خان محمد نے سر کی ایک خفیف قبضش سے اس کے زوردار سلام کا جواب دیا۔ دو منٹ بعد وہ اپنے خاص ڈرائنگ روم میں اس شخص کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کر رہا تھا، جو تھیلی نشست پر اس کا ہم سفر تھا۔

”جانتے ہو دلادر خان! کہ آج ہم نے خود تمہارے ساتھ سفر کرنے کی رحمت کیوں مول لی؟“

”ہماری سرپرستی کی خاطر۔“ دلادر خان نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا ذنی بریف کیس خان محمد کے صوفے کے قریب دبیز اور قیمتی قالین پر رکھتے ہوئے کہا۔

”سرپرستی نہیں، سیاست کی خاطر۔“ خان محمد کے لہجے میں نفرت تھی۔ ”آج میں نے کسی کتے کے آگے ہڈی ڈالنی ہے، لیکر، اس ہڈی میں ایسا زہر بھی شامل ہے، جسے کھانے کے بعد وہ پاگلوں کی طرح بھونکنے لگے گا۔ سیاست میں جوڑ توڑ کے بغیر کوئی کام نہیں چلتا۔“

”میرا بریف کیس آپ کی گاڑی میں ہی رہ گیا۔“ دلادر خان نے اپنے مطلب کی بات کی۔

”فکرمٹ کرو۔“ خان محمد مسکرایا۔ پھر سوٹ کی اندرونی جیب سے ایک کی جین نکال کر

دلادر خان کے حوالے کر تا ہوا بولا۔ ”میں نے اسی لئے ایک ہی جیسے دو سوٹ کیس ساتھ رکھنے کی تجویز پیش کی تھی۔ تمہارا مال اسی کے اندر محفوظ ہے۔ میری گاڑی تمہیں دفتر تک چھوڑ دے گی، جہاں تمہاری اپنی گاڑی موجود ہے۔ اس کے آگے تمہاری اپنی ذمہ داری ہوگی۔ اور ہاں، آج میں نے یہ رسک پہلی اور آخری بار لیا ہے۔“

”آپ چاہیں تو رقم گن لیں۔“ دلادر خان نے بریف کیس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے دبی زبان میں کہا، اس نے خان محمد کے آخری جیلے کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

”مجھے تمہارے اوپر اعتماد ہے۔ اور ویسے بھی تم ہم سے بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو؟“

جواب میں دلادر خان نے کچھ عجیب نظروں سے خان محمد کو دیکھا، پھر جھک کر سلام کیا

اور ڈرائنگ روم سے باہر آگیا۔



لنڈی کوتل کے بیشتر تاجر ایک ایک کر کے کراچی کے سہراب گوٹھ کے اس بازار میں منتقل ہو رہے تھے، جو بڑی تیزی کے ساتھ کسی ڈیوٹی فری پورٹ کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ بیرونی منڈیوں سے اسمگلنگ کے ذریعے درآمد کیا گیا سارا مال اس بازار میں کھلے عام فروخت ہو رہا تھا، جو کلکڑی کی چھوٹی چھوٹی دکانوں پر مشتمل تھا۔ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے، ہارس پاور سے بھی زیادہ۔ اور جب اس طاقت کا استعمال کھلے عام شروع ہو جائے تو پھر اس کے آگے ساری قوتیں ٹھپ ہو جاتی ہیں۔ کچھ بھی حال سہراب گوٹھ کی اس مارکیٹ کا تھا، جس میں دکانوں کی تعداد اور ناجائز کاروبار بڑے دھڑلے کے ساتھ ترقی پا رہا تھا۔

یہ بازار ایک ایسی زمین پر واقع تھا، جو حکومت کی ملکیت تھی، لیکن متعلقہ محکمے کے کسی بھی ذمے دار آفیسر نے اس پر ہونے والے ناجائز قبضے کے سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کی۔ قانون کے محافظوں کے تمام بڑے دفاتر اور اعلیٰ افسران کی رہائش گاہیں بھی اسی شہر کراچی میں واقع ہیں، جسے پاکستان میں وہی حیثیت حاصل ہے، جو کسی ملک میں سونے کی کان کو ہوتی ہے۔ تجارت اور حصولِ رزق کی خاطر انسان تو کیا، جانور اور پرندے بھی نقل مکانی کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سائبیریا کے مخصوص برڈس (BIRDS) ایک خاص بیزن میں کراچی سے قریب کلری جھیل کی حدود میں شکار ہوتے ہیں۔ کراچی سے قریب کلری جھیل کی حدود میں شکار ہوتے ہیں۔ پانی کی تلاش میں یہ معصوم پرندے ہزاروں اور لاکھوں میل کی پرواز کے بعد اپنی منزل تک پہنچتے ہیں، لیکن شکاری انہیں بھی شکار کر لیتے ہیں۔ لیکن ناجائز تجارت کے سلسلے میں نقل مکانی کرنے والے ان خطرناک افراد کے خلاف ایک طویل عرصے تک کسی قانونی چارہ جوئی کی مطلق کوئی ضرورت نہیں محسوس کی گئی، جو ملکی معیشت کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہے تھے۔ مقامی تاجروں نے اس کھلے عام دھندے کے خلاف شور غوغا کیا، اخباروں نے ادارے لکھے، ایماندار افسران نے اس کی بیخ کنی کے سلسلے میں آواز بلند کی، لیکن کسی ادارے نے بھی پیش قدمی کے سلسلے میں پہل نہیں کی۔ پیسے کی ہارس پاور اور مخصوص سربراہوں کے کسی خفیہ اشارے نے ان تمام ذمے دار اداروں کی نفی کے آگے بند باندھ دیا تھا، جسے عبور کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ جن کو بھتہ ملتا رہا، وہ دکانوں میں تیل ڈالے بیٹھے رہے اور جو رشوت کی اس لعنت کے مخالف تھے، وہ اندر ہی اندر بیچ و تاب کھاتے رہے۔

لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ صوبائی حکومت کے حساس اداروں نے اس بازار کے خلاف کوئی

نوش ہی نہ لیا ہو، ان کے سخت نوش آئے دن اخبارات کے ذریعے عوام کی توجہ اور دلچسپی کا ذریعہ بنتے رہے۔ یہ ادوار بات ہے کہ اس نوش پر کوئی نوش نہیں لیا گیا، یا پھر اس کی مدت میں بار بار اضافہ ہوتا رہا اور اس آنکھ بھولی کے دوران مچی دکانیں مچی ہونے لگیں، رہائش گاہیں بھی تعمیر ہوئیں اور طرفہ تماشا یہ کہ بازار میں داخل ہونے سے پیشتر ایک مسجد بھی پوری آب و تاب سے ابھر کر عالم وجود میں آگئی۔ بازار کا حدود اربعہ امرتیل کی طرح پھیلتا رہا اور اس کے خلاف سخت کارروائی اور آہنی ہاتھوں سے نمٹنے کی دھمکیاں بھی شائع ہوتی رہیں، لیکن بات کبھی دفتری اور کاغذی کارروائی سے آگے نہیں بڑھی۔ البتہ ان ناجائز قابضین کی دکانوں اور مکانوں میں بجلی، پانی اور گیس کی تمام سہولتیں بھی فراہم کر دی گئیں۔

اس بازار میں جہاں دکانوں پر کھلے عام دنیا کی تمام ممنوع مصنوعات فروخت ہو رہی تھیں، وہیں ایسے پُر بیچ راستوں سے گزر کر زمین دوزت خانے بھی وجود میں آ رہے تھے، جو منشیات کے بڑے بڑے تاجروں کے گودام کا کام سرانجام دیتے تھے۔ آبکاری کے محکمے کے کچھ سرپھرے ایماندار افسران نے وہاں ریڈ کرنے کی کوشش بھی کی، لیکن دوسری جانب سے گولیوں کی بوچھاڑ نے انہیں جان بچا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ان دنوں خانوں تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکے، جو ایسے قلعوں کے طرز پر تعمیر کئے گئے تھے، جہاں اوّل تو کسی آدمی کا پہنچنا مشکل تھا اور پھر اس کے علاوہ ان پُر بیچ راستوں پر جا بجا محافظ دستے کے ایسے مسلح نوجوان بھی تعینات تھے، جو ہلکے جھپکتے میں فائر کھول دینے میں کوئی عار نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک منشیات کا ذخیرہ قانون کے محافظوں کی زندگیوں سے زیادہ قیمتی تھا، وہ اس منڈی کی تباہی نہیں برداشت کر سکتے تھے، جہاں سے پوری دنیا کو سپلائی ہوتی تھی۔

جرم اور قانون کی اسی آنکھ بھولی میں پولیس کا ایک ایسا افسر بھی کام آگیا، جس نے اپنے سینے پر بہادری اور جرأت کا تمغہ سجانے کے خواب دیکھے تھے۔ اس افسر کے ساتھ میر جعفر کی فوج کی ایسی نفی شریک تھی، جو مجبوراً افسر کا حکم ماننے پر آمادہ تھی۔ لیکن نتیجہ وہی نکلا، جو نکلتا چاہئے تھا۔ پولیس کی کسی کالی بھیڑ نے اس چھاپے کی اطلاع مخالف پارٹی تک پہنچادی اور وہ چھاپے والے دن عین اس وقت بڑی بے جگری کے ساتھ اپنی اپنی جان بچا کر بھاگ نکلے۔ دوسری جانب سے اس پولیس افسر کو گولیوں کی زبان میں واپسی کا حکم دیا گیا، جسے غازی یا شہید ہو جانے کے جذبات نے سرشار کر رکھا تھا۔ وہ غازی تو نہ بن سکا، البتہ جامِ شہادت پینے میں ضرور کامیاب ہو گیا۔ اس کا کشادہ سینہ گولیوں سے چھلکی کر دیا گیا، وہ سڑک کے درمیان پڑا موت اور زندگی کی کشمکش سے دوچار رہا، پھر اس کی روح جسم سے پرواز کر گئی۔

دوسرے روز اس پولیس افسر کو اس کی بہادری کے اعتراف کے صلے میں پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ اس کے جنازے میں تمام بڑے بڑے سرکاری افسر شریک



تھے، جن کی تصویریں دوسرے دن شائع ہونے والے اخبارات میں نمایاں طور پر شامل اشاعت کی گئیں۔ اسی روز مجرموں کے خلاف ایک نئی فائل کھولی گئی، تفتیشی افسر کو سختی سے ہدایت کی گئی کہ مطلوبہ مجرموں اور قاتلوں کو جلد از جلد قانون کے شکنجوں میں جکڑ کر قرار واقعی سزا دی جائے۔ کچھ روز تک خاصی گہما گہمی رہی۔ متعلقہ حلقوں میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں، پھر ہمیشہ کی طرح گزرتا وقت مرحوم کے لواحقین کے لئے مرہم بن گیا اور زخم آہستہ آہستہ مندمل ہو گئے۔

اس واقعے کا اثر سہراب گوٹھ کے تاجروں پر بھی پڑا۔ ان کا کاروبار ہفتے دس دن مندی کا شکار رہا، پھر دوبارہ وہاں بڑی بڑی قیمتی اور جھلملاتی گاڑیوں کا جہوم نظر آنے لگا۔ بڑے بڑے خاندانوں کی فیشن پرست خواتین جو اپنے ملازمین سے بھی سیدھے منہ بات کرنا کسر شان سمجھتی تھیں، پھر اس بازار کی تنگ گزرگاہوں کی زینت بن گئیں، جہاں جہوم کے سبب کھڑے سے کھڑا چھلٹا تھا۔ غیر ملکی اشیاء کی طلب انہیں جوق در جوق اس بازار تک پہنچ لاتی تھی، جہاں ان کی پسند کی اشیاء چھوٹی چھوٹی دکانوں یا پھر زمین پر بھی کسی میلی چادر پر بکھری پڑی ہوتی تھیں۔

اس وقت بھی بازار کے ہنگامے پورے شباب پر تھے، جب ایک درمیانے درجے کی دکان کے بیرونی حصے میں کاروباری لین دین ہو رہا تھا۔ لیکن اس کے اندرونی حصے میں زمین پر بچے قالین پر گاؤٹیکے سے ٹیک لگائے دلاور خان کسی بڑے نواب کی طرح پورے طمطراق سے بیٹھا اپنے دو خاص آدمیوں دادل اور شیرا کے ساتھ جو گفتگو تھا۔ گفتگو کے ساتھ ”چینک چائے“ کا دور بھی چل رہا تھا۔

”دلاور خان تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہے۔“ وہ شیرا سے مخاطب تھا۔ ”تم نے جس مہارت اور خوب صورتی سے اپنا کام انجام دیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔“ میں نے کوئی خاص کمال نہیں کیا، خان!“ شیرا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”وہی کیا، جس کا حکم تمہاری جانب سے ملا تھا۔ نفع نقصان اور اونچ نیچ کے بارے میں سونا تمہاری ذمہ داری ہے۔ ہم تو صرف حکم کے بندے ہیں، بس اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔“

”اسی لئے میں تمہاری قدر کرتا ہوں کہ تم صرف ہمارے اشاروں پر عمل کرتے ہو۔“ دلاور خان نے چائے کا ایک مختصر گھونٹ لے کر کہا۔ ”میں تمہارے لئے بطور انعام دس ہزار کا اعلان کرتا ہوں، جو تمہیں اعلیٰ کھپ میں کمیشن کے ساتھ مل جائیں گے۔“

”میں نے بھی شیرا ہی کے فیصلے کے بعد ٹرک سے چھلانگ لگائی تھی، ورنہ آٹھ دس آدمیوں کو بھون دینا میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔“ دادل نے کہا۔

”میں جانتا ہوں۔“ دلاور خان مسکرایا۔ ”تم دونوں میرے دو ہاتھ ہو، جنہیں میں بہت

بچا کر خاص خاص مہم پر استعمال کرتا ہوں۔ شیرا کی طرح تم بھی دس ہزار کے انعام کے مستحق ہو۔“

”تمہاری مہربانی ہے، سیٹھ! لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ دادل نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”ہمیں مقابلے کے بجائے فرار ہونے کا حکم کیوں ملا تھا؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ دلاور خان نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

”شکاری کتوں کی تعداد زیادہ رہی ہوگی۔“ دادل نے نفرت سے جواب دیا۔

”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں تھی۔“ دلاور خان نے کہا۔ ”جو افسر ہمارے ٹرک کے

انتظار میں جال بچھائے بیٹھا تھا، وہ بھی اپنا ہی آدمی تھا۔“

”کون تھا؟“ دادل نے اپنی معلومات کی خاطر دریافت کیا۔

”وہی اپنا پرانا یار..... انسپکٹر فریدی۔“

”فریدی“ شیرا نے تیزی سے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ”وہ مرد کا بچہ ہے، سیٹھ! زبان کا

دھنی اور..... یاروں کا یار ہے۔“

”تم کیسے جانتے ہو اسے؟“ دلاور خان کے لہجے میں تجسس تھا۔

”پہلی ملاقات تم ہی نے کرائی تھی۔“ شیرا نے کہا۔ ”اس کے بعد ایک دو بار میں ذاتی

طور پر بھی کام کے سلسلے میں اس سے ملا تھا۔ اس نے میری بات ماننے میں کوئی دیر نہیں لگائی۔

بغیر جوڑ توڑ کے کام نمٹا دیا تھا۔

”کون سا کام؟“

”ہے اپنا ایک پرانا واقف کار۔“ شیرا بے پروائی سے بولا۔ ”چھوٹے موٹے کام کرتا

رہتا ہے۔ وہی فریدی صاحب کے ایک دفعدار ہاتھ چڑھ گیا تھا۔ آدھا کلو ایفون کا معاملہ تھا،

جسے وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچانے جا رہا تھا۔ قسمت خراب تھی کہ راستے میں دھریا

گیا۔ میری ہی ہستی میں رہتا ہے، اس کی بیوی میرے پاس روتی دھوتی آئی تھی۔ بس مجھے

اس پر ترس آ گیا۔ جانتے ہو استاد! کہ وہ دفعدار آدھا کلو ایفون کے معاملے کو رفع دفع کرنے

کے کتنے پیسے مانگ رہا تھا؟ پورے پانچ ہزار..... فریدی صاحب نے چٹکی بجاتے میں

معاملہ نمٹا دیا۔ ایفون بھی واپس کرادی تھی۔“

”اور اس مہربانی کے عوض اس نے تم سے کیا مطالبہ کیا تھا؟“

”میں سمجھا نہیں۔“ شیرا کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

”فریدی کی بات اور ہے، شیرا! لیکن پولیس والوں سے پاری اچھی نہیں ہوتی۔“ دلاور

خان ساٹ آواز میں بولا۔ شاید اسے شیرا کا فریدی سے ملنا ناگوار گزر رہا تھا۔

”مگر تم تو ہمیشہ اس کے نام کا کلمہ ہی پڑھتے ہو۔“ شیرا نے تکیے لہجے میں کہا۔

”ہاں..... اس لئے کہ وہ بڑا کھرا آدمی ہے۔ بالکل قہری نائن سونے کی طرح۔“  
دلاور خان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اگر وہ کھرا آدمی ہے اور تمہارا دوست بھی ہے تو پھر اسے ہمارے ٹرک کے پیچھے آنے کی کیا ضرورت تھی؟“ دادل نے وضاحت چاہی۔  
”اسے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ وہ ٹرک کس کا ہے۔“  
”کیا مطلب.....؟“ دادل چونکا۔ ”کیا کسی دوسری پارٹی نے ہمارے خلاف خبری کی تھی؟“

”جسید انصاری کا نام سنا ہے کبھی؟“ دلاور خان کے لہجے سے حقارت مترشح تھی۔ ”وہی جو تمہاری طرح اپنی جنگلی موچکوں کو ہر وقت تاؤ دیتا رہتا ہے۔“  
”وہ..... تو فریدی کا بڑا افسر ہے۔“ دادل نے حیرت سے کہا۔

”ہاں وہی..... اوپر سے سالا بڑا میٹھا نظر آتا ہے، لیکن اندر سے اتنا ہی کڑوا ہے۔“  
دلاور خان نے سوار کی ایک چٹکی منہ میں دباتے ہوئے نفرت سے کہا۔ ”دونوں ہاتھوں سے مال بھی سمیٹ رہا ہے اور غزوات بھی ہے۔ نچلے عہدے سے ترقی کرتے کرتے اوپر پہنچا ہے، اس لئے سارے گندے ہتھ کنڈوں سے واقف ہے۔ نام بھی بڑا کمایا ہے، حرام کے ختم نے۔ کراچی سے سرحد کے آخری سرے تک اس کی دھوم مچی ہے، لیکن ایک نمبر کا فریبی اور مکار ہے۔ سانپ کی طرح کینچلی بدلنے میں تو اس کا جواب نہیں۔ جس تھالی میں کھاتا ہے، اس میں وقت پڑنے پر چھید کرنے سے دریغ بھی نہیں کرتا۔ جھڑوس ہو گیا، مگر اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ فریدی کی وجہ سے ابھی تک اس کے نام کا ڈنکان بج رہا ہے، لیکن اب وہ اس کے ساتھ بھی دغا کرنے لگا ہے۔“

”سمجھ گیا سیٹھ!“ دادل نے انصاری کی شان میں ایک موٹی گالی بکتے ہوئے کہا۔ ”اس نے تمہارے اور فریدی صاحب کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی ہوگی۔“

”ہاں۔“ دلاور خان نے آہستہ سے جواب دیا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”اسے تو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی، البتہ مجھے فریدی کا خیال ستا رہا ہے۔“

”کوئی خاص بات؟“ شیرا جو خاموش بیٹھا تھا، دلاور خان کا آخری جملہ سنتے ہی چونک اٹھا۔

”یہ پہلا اتفاق ہو گا شاید جب فریدی کو اپنے مقصد میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔“  
”میں سمجھا نہیں؟“ شیرا نے پوچھا۔

”جو ٹرک اس نے پکڑا تھا، اس میں کوئی مال نہیں تھا۔“  
”پھر.....“ اس بار دادل کے چونکنے کی باری تھی ”تم نے تو کہا تھا کہ اس بار ہیر وٹن کی

کسی کھپ کا معاملہ ہے۔“

”میں نے غلط نہیں کہا تھا۔“ دلاور خان مسکرا کر بولا۔ ”خبری کی اطلاع مل جانے کے بعد میں نے وہ مال ذاتی طور پر دوسرے راستے سے تری پار کر دیا، اس کے لئے مجھے خاصی بڑی رقم خرچ کرنی پڑی۔ لیکن اب ایک ایسا مہرہ ہاتھ لگ گیا ہے، جو ہمارے لئے سونے کی چڑیا سے زیادہ کارآمد ثابت ہوگا۔“

”سرکار کا کوئی خاص بندہ؟“ دادل نے بڑی رازداری سے سوال کیا۔  
”خاص نہیں، بلکہ خاص الخاص۔“ دلاور خان نے منہ پیچھے کر کے سوار کی پیک بھوکے ہوئے کہا۔

”ٹرک میں کیا مال بھرا تھا؟“ شیرا نے پوچھا۔  
”ایسی کوئی اہم چیز نہیں تھی، جو قانون کی گرفت میں آسکے۔ تمہارا کیا خیال ہے، کیا دلاور خان خبری کی بجٹ مل جانے کے بعد بھی کوئی کچا کام کر سکتا ہے؟“  
”مگر ٹرک تو ہاتھ سے گیا نا، سیٹھ!“ دادل نے افسوس کا اظہار کیا۔ ”تم نے اشارہ کر دیا ہوتا تو ہم اسے بھی بیچ راستے سے تری پار کر دیتے۔“

”فکر مت کرو۔ میں نے جو مہرہ گانٹھا ہے، اس کے ایک فون پر ٹرک بھی واپس مل جائے گا اور وہ مال بھی، جو اس میں بھرا ہے۔“

”وہ تو خیر ٹھیک ہے، لیکن انصاری نے اچھا نہیں کیا۔“ شیرا نے کسی زخمی شیر ہی کی طرح خوف ناک انداز میں کہا۔ ”کھرے آدمی کے ساتھ کھوٹا سلوک کرنا مردانگی نہیں ہے۔ تمہاری اجازت ہو تو میں اس ولد الحرام کو کرنٹ کا ایک معمولی جھکا لگا دوں۔ سالا زندگی بھر اس نشانی کو یاد رکھے گا، جو اس کے چہرے پر اس کی کمینگی کی علامت بن کر ابھرے گی۔“

”نہیں۔“ دلاور خان تیزی سے بولا۔ ”ایسی غلطی کبھی نہ کرنا۔ میری ایک بات گانٹھ سے باندھ لو، پولیس والوں کے ساتھ دوستی اور دشمنی دونوں ہی اکثر بڑی مہنگی پڑتی ہے۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے، انہیں آپس میں نمٹانے دو۔“

”پر اس نطفہء تحقیق کو سوچھی کیا تھی؟“ دادل نے اپنی خفگی کا اظہار کیا۔ ”فریدی ہی کے ذریعے سے تو اس کے نام کا سکھ چل رہا ہے، اسی کی بدولت مال بھی کم رہا ہے اور اسی کو چکر میں ڈالنے کی حماقت بھی کر رہا ہے۔“

”ختم کر دو اس بات کو۔“ دلاور خان نے اُکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ پھر موضوع بدلتے ہوئے شیرا اور دادل کو اپنے آئندہ پروگرام کے سلسلے میں ضروری ہدایت دینے لگا۔

دادل کی طرح شیرا بھی بظاہر ہمہ تن گوش تھا، لیکن اس کے ذہن میں رہ رہ کر فریدی کا خیال ابھر رہا تھا، جسے چھاپے میں ناکامی کے بعد خفت برداشت کرنی پڑی ہوگی۔



دوروز بعد فریدی کی طلبی سیکرٹری کی طرف کی گئی تو اس نے اس طلبی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اوپر سے کسی فوری طلبی کا مفہوم وہ بخوبی سمجھنے لگا تھا۔ ایسی طلبی زیادہ تر اسی وقت ہوتی تھی، جب یا تو سیکرٹری کو اپنے کسی نجی کام کے سلسلے میں اس کی خدمات درکار ہوتی تھیں یا پھر کسی اہم ذاتی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اسے فریدی کا خیال آتا تھا۔ یہ معمولات نئے نہیں تھے، ماتحت عملے اور ان افسران کو جن کی تعیناتی خاص خاص جگہوں پر ہوتی تھی، اس قسم کی پیشیاں اکثر جھلکانی پڑتی تھیں۔ بیس پچیس ہزار کے خرچے کے بعد اگر کسی کو لاکھ ڈیڑھ لاکھ کمانے کا موقع مل جائے تو یہ سودا ان کو زیادہ مہنگا بھی نہیں پڑتا تھا۔ وہ افسران جن کا مستقل آمدنی ماہانہ اعتبار سے تین چار لاکھ روپے سے زیادہ ہوتی تھی، وہ اوپر والوں کی خوشنودی کو برقرار رکھنے کی غرض سے بغیر پلائے ہی ہر ماہ بڑی پابندی سے ان کی خدمت میں حاضری دیتے رہتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ چار پانچ سال سے بھی زیادہ عرصے تک ایک ہی جگہ پر تعینات رہتے تھے اور اگر مرکز کی جانب سے کوئی سختی کے احکامات موصول ہوتے تھے تو محض کاغذی کارروائی پوری کرنے کے لئے۔ چہیتے اور کماؤ پوت افسران کو کچھ دنوں کے لئے ہٹایا جاتا تھا، پھر گھما پھرا کر انہیں دوبارہ اسی جگہ تعینات کر دیا جاتا اور اس عارضی تعطل کو دور کر دیا جاتا تھا، جو ہنگامی حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کی خاطر عمل میں آتے تھے۔ اس کے بعد ”طلب اور رسد“ کا سلسلہ پھر معاشی اصول کے پیش نظر شروع ہو جاتا تھا۔ اس قسم کے عارضی بحران زیادہ تر اسی وقت پیش آتے تھے، جب محکمے کا سربراہ بھی اوپر والوں کے احکامات کی پیروی کے لئے خود کو بے دست و پا محسوس کرتا تھا۔

بہر حال، فریدی چونکہ محکمے کا پرانا افسر تھا، اس لئے تمام اونچ نیچ اور داؤ بیچ بے پوری طرح واقف تھا۔ وہ صرف ایک دلیر اور نڈر افسر ہی نہیں تھا، بلکہ اس کے ذاتی تعلقات بھی صوبائی اور مرکزی وزارتوں کے ایسے چیدہ چیدہ اور اہم افسروں سے تھے، جن کی پیشانی کی محض ایک شکن بڑے بڑوں کے پتے پانی کر دینے کے لئے کافی تھی۔ یہ تعلقات رسمی نہیں تھے بلکہ خاصے پائیدار تھے۔ فریدی نے کسی غنٹی اور جفاکش کسان کی طرح دن رات محنت کر کے سم زدہ غمزدہ زمینیں کا تباہ کاشت بنایا تھا۔ اب وہ اس پوزیشن میں تھا کہ اپنی محنت کا پھل یا آسانی کھا سکتا تھا۔ اس کی ایک درخواست پر اس کے اپنے سربراہ کی کرسی بھی متزلزل ہو سکتی تھی، لیکن اس نے ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔ وہ ہر شخص سے بنا کر رکھنے کا عادی تھا۔ شاید اس لئے کہ اسے معلوم تھا کہ حکومتوں اور کرسیوں کی چھینا چھٹی کسی وقت بھی بچھائی بساط کو پلٹ سکتی ہے۔ دزیوں کے عہدے مستقل نہیں ہوتے، عارضی ہوتے ہیں، جو حکومتوں کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ جب کہ دوسری کرسیاں زیادہ پائیدار ہوتی ہیں، وہ ان پائیدار

کرسیوں کی ناراضگی پسند نہیں کرتا تھا، چنانچہ اس وقت بھی جب وہ اپنے محکمے کے سربراہ کے پی اے، کریم صاحب کے دفتر میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر کسی قسم کے تردد یا پریشانی کے کوئی آثار نہیں تھے، ہمیشہ کی طرح وہ مسکراتا ہوا اور سینہ تان کر اس کمرے میں داخل ہوا تھا۔ جبکہ اس سے بڑے بڑے افسران بھی کریم صاحب کو جھک جھک کر سلام کرنے کے عادی تھے اور ان کی روزمرہ کی دفتری ضرورتوں کا بھی اُن کے بڑے پابندی سے خیال رکھتے تھے۔ ان ہی کی بدولت تو بڑے سرکاری دفاتروں میں پی اے کے کمروں میں ہر وقت چائے اور دیگر لوازمات کا لنگر جاری رہتا ہے۔

”اور سنو، پرنس!“ کریم صاحب نے فریدی کو دیکھ کر بڑی بے تکلفی سے دوستانہ لہجے میں مخاطب کیا۔ ”کیا حال چال ہیں؟“

”بس، زندہ ہوں، آپ لوگوں کی دعا سے۔“ فریدی نے کوئی اجازت ضروری سمجھے بغیر ایک صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ سلگاتے ہوئے بڑی بے پروائی سے کہا۔

”کل سے بڑے صاحب کا موڈ بہت خراب ہے۔“ کریم صاحب نے اس بار سنجیدگی سے کہا۔ ”خدا جانے کیا بات ہے۔“

”فلمی جوڑے اسی طرح آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ پھر دو چار روز میں ان کے درمیان صلح ہو جاتی ہے۔“ فریدی نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”میں سمجھا نہیں؟“

”یار! اب اتنے بھولے بھی نہ بنو۔“ فریدی سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے بولا۔ ”کیا آپ کو نہیں معلوم کہ اپنا بڑا صاحب خود کو وحید مراد سے کم نہیں سمجھتا اور اسی مناسبت سے اداکاری بھی کرتا ہے۔“

”تمہیں صبح سے دو بار پوچھ چکے ہیں۔“

”مجھے گیارہ بجے طلب کیا گیا تھا اور ابھی گیارہ بجنے میں بھی دس منٹ باقی ہیں۔“

فریدی نے دتی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”بات کیا ہے؟..... میرا مطلب ہے، پرنس! کہ تمہیں تو اپنی طلبی کی وجہ معلوم ہوگی۔“

کریم صاحب نے دبی زبان میں مسکراتے ہوئے دریافت کیا، اس وقت ان کے دفتر میں کوئی تیسرا آدمی نہیں تھا۔

”نہیں، مجھے نہیں معلوم۔“

”یاروں سے اڑنے کی کوشش کر رہے ہو۔ تمہیں طلب کیا جائے اور تمہیں اس کی وجہ نہ معلوم ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”موسم کو رنگ بدلتے دیر بھی نہیں لگتی۔ کون جانے آج اندر کا موسم کیا ہو۔“ فریدی نے

سگریٹ کا طویل کش لے کر دھواں اُڑاتے ہوئے کہا۔

”ہاں، یہ تو ہے۔“ کریم صاحب نے دہی زبان میں تنقید کی۔ ”اپنے صاحب کے موڈ کا بھی کوئی بھروسہ نہیں۔“

”اندر اور کون کون ہے؟“ اس بار فریدی نے بظاہر ایک رسمی سا سوال کیا۔

”جشید انصاری صاحب۔“ کریم صاحب نے کہا۔ ”ایک گھنٹے سے اندر کوئی اہم میٹنگ چل رہی ہے۔ صاحب کا حکم ہے کہ کسی کو بھی اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔“

فریدی کے ہونٹوں پر جشید انصاری کا نام سن کر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھری، پھر اس نے بڑی تیزی سے خود کو تارل کرتے ہوئے کہا۔

”کریم صاحب! کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ اپنے وحید مراد کو میری آمد سے مطلع کر دیں؟“

”ابھی لو۔“ کریم صاحب نے ریسیور اٹھا کر بزر پر انگلی رکھی اور دوسری طرف سے رابطہ قائم ہوتے ہی فریدی کی آمد کی اطلاع پاس آن کر دی، پھر ”لیس سر“ کہہ کر ریسیور رکھتے ہوئے فریدی سے بولے۔

”جاؤ پرنس! صاحب تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔“

فریدی نے بڑی بے پروائی سے سگریٹ زمین پر پھینک کر اس کو جوتوں سے مسل کر بھجایا، پھر اپنا سفاری سوٹ ٹھیک کرتا ہوا اٹھا اور بے دھڑک اندر داخل ہو گیا، جہاں جشید انصاری اس کی توقع کے عین مطابق پہلے سے موجود تھا۔ سیکرٹری اور انصاری کے درمیان گفتگو کا سلسلہ فریدی کے اندر داخل ہوتے ہی منقطع ہو گیا تھا۔ فریدی اپنے ہمراہ جو فائل لایا تھا، اسے بدستور ہاتھوں میں دبائے سیکرٹری کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بلند آواز میں سلام کرنے کے بجائے محض سر کی ایک خفیف جنبش سے کام لیا تھا۔

”بیٹھو.....!“ اسے حکم ملا۔

”شکریہ۔“ اس نے حکم کی تعمیل میں کہا اور بڑی بے پروائی سے ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ فائل اس نے گود میں رکھ لی تھی۔

”اور سنائیے۔ آج کل آپ کے کیا مشاغل ہیں؟“ سیکرٹری کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔

”اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہا ہوں۔“

”سنا ہے، آج کل آپ نے بڑے اونچے اونچے ہاتھ مارنے شروع کر دیئے ہیں؟“

”میں چھوٹا افسر ہوں، جناب! بھلا اونچے اونچے ہاتھ کس طرح مار سکتا ہوں؟“ فریدی

کا جواب معنی خیز تھا۔

”جانتے ہو، میں نے اس وقت تمہیں کیوں بلایا ہے؟“ سیکرٹری نے اپنا انداز گفتگو تبدیل کیا۔

”نوسر!“ فریدی انجان بننے ہوئے بولا۔

”محکمہ داخلہ سے تمہارے خلاف ایک اہم شکایت آئی ہے، جس کی تصدیق انصاری صاحب بھی کر چکے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں، جناب!“ فریدی نے بڑی مصومیت سے وضاحت چاہی۔

”دوروز پہلے تم نے نیشنل ہائی وے پر پولیس کی چوکی سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک ٹرک پکڑا تھا۔“

”لیس سر.....!“ فریدی سنبھل کر بولا۔ ”اس کی اطلاع مجھے انصاری صاحب ہی نے دی تھی۔“

”میں نے صرف یہ کہا تھا، مسٹر فریدی! کہ..... آپ ہائی وے کی طرف بھی دھیان دیں۔ اس لئے کہ منشیات کی اسمگلنگ زیادہ تر اسی طرف سے ہوتی ہے۔“ جشید انصاری نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے تیزی سے کہا۔

جواب میں فریدی نے جشید انصاری کو ایک لمحے کے لئے گھور کر دیکھا، پھر بڑے اطمینان سے سیکرٹری سے بولا۔

”جی ہاں سر! مجھے انصاری صاحب نے یہی حکم دیا تھا۔“

”تم نے وہ ٹرک روکنے کی ضرورت کیوں محسوس کی تھی؟“

”میں اس کی تلاشی لینا چاہتا تھا، جناب! لیکن وہ خود ہی جھٹکے کھاتا ہوا رک گیا۔“

”کیا مطلب.....؟“

”ڈرائیور ٹرک چھوڑ کر نہ جانے کیوں فرار ہو گیا تھا۔“

”فرار ہو گیا تھا یا تم نے اسے یہ موقع فراہم کیا تھا؟“ سیکرٹری نے اسے گھورتے ہوئے قدرے سخت آواز میں کہا۔

”سوری سر!“ فریدی نے تیزی سے جواب دیا۔ ”میں نے اس قسم کی گھٹیا حرکت کبھی نہیں کی۔ میرا ریکارڈ ہمیشہ سے بے داغ رہا ہے۔“

”جو چیزیں بے داغ ہوں، ان ہی پر دھجے نمایاں نظر آتے ہیں۔“ سیکرٹری نے تمللا کر کہا۔ ”محکمہ داخلہ کی جانب سے جو رپورٹ ملی ہے، اس میں درج ہے کہ آپ نے خان گڈز ٹرانسپورٹ کے ایک مال بردار ٹرک کو روک کر اس کی تلاشی لی اور جب آپ کو ٹرک سے کوئی قابل ذکر اور قابل گرفت شے نہیں مل سکی تو آپ نے ڈرائیور اور اس کے ساتھی کی جامہ تلاشی

لی اور ان کے پاس موجود تقریباً پچھتر ہزار کی رقم زبردستی چھین کر انہیں سنگین نتائج کی دھمکی دے کر وہاں سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا اور ٹرک کو بلا جواز پکڑ کر لے آئے۔

”سر! کیا میں یہ دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ میرے خلاف رپورٹنگ آفیسر کون ہے؟“

”مسٹر فریدی! تم شاید بھول رہے ہو کہ اس وقت اپنے سیکرٹری سے مخاطب ہو۔“

سیکرٹری نے غصے سے کہا۔ ”مسٹر انصاری نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ تم نے آؤٹ شرح مشیر نامہ بنانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی، جو ایسے موقعوں پر ضروری ہوتا ہے۔ کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ تم موقع واردات سے آؤٹ شرح مشیر نامہ بنائے بغیر کیوں بٹے تھے؟“

”میں نے آؤٹ شرح مشیر نامہ.....“ فریدی کچھ کہتے کہتے یک لخت خاموش ہو گیا، پھر جلدی سے بولا۔ ”میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا، جس کی نشاندہی نامعلوم رپورٹ میں درج ہوگی۔ ٹرک کو میں اس لئے لے آیا تھا کہ دوسری شکل میں اس پر جو مال لوڈ تھا، شاید وہ بھی میرے کھاتے میں درج کر دیا جاتا۔ میں ہمیشہ آنکھیں کھلی رکھ کر کوئی قدم اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں، سر!“

”گویا تم اپنا جرم تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہو؟“

”جب میں نے کوئی جرم سرے سے کیا ہی نہیں تو پھر انکار یا اقرار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ فریدی نے بڑی بے پروائی سے جواب دیا، اس کے چہرے سے اب بھی کسی الجھن یا پریشانی کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ بالکل نارمل نظر آ رہا تھا۔

”صاحب تم پر مہربان ہے، مسٹر فریدی!“ جمشید انصاری نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”محکمہ داخلہ کی رپورٹ کو یوں ہی داخل دفتر بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اگر تم صاف صاف سب کچھ بتا دو تو صاحب تمہارے لئے سب کچھ کر سکتا ہے۔ رقم واپس کر دینے کی صورت میں کوئی نہ کوئی صورت نکالی جاسکتی ہے۔“

”دو چار ہزار کی بات ہوتی تو میں اس صورت میں بھی دروغ سے کام لے کر خود کو بچانے کی کوشش بھی نہ کرتا۔“ فریدی سپاٹ آواز میں بولا۔ ”پچھتر ہزار کی رقم تو اچھی خاصی بڑی رقم ہے۔“

”کیا تم نے اس سامان کی فہرست بھی بنائی ہے، جو ٹرک پر لوڈ تھا؟“ سیکرٹری نے بات سمجھانے کی کوشش کی۔

”مجھے افسوس ہے سر! کہ میں فی الحال کوئی جواب نہیں دے سکتا۔“ فریدی نے دبنگ آواز میں جواب دیا۔ ”تحریری رپورٹ کا جواب بھی تحریری ہوگا، مگر وقت آنے پر۔“

”گویا مجھے تمہارے خلاف باقاعدہ انکوائری کا حکم جاری کرنا پڑے گا؟“

”ایزنڈ وٹ سر!“

”او۔ کے۔“ سیکرٹری بل کھاتے ہوئے غصے سے بولا۔ ”میں تمہیں فوری طور پر آبکاری سے ہٹانے کے آرڈر کر رہا ہوں، اس کے بعد تمہیں باقاعدہ چارج شیٹ ملے گی۔“

فریدی نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش بیٹھا رہا۔

”مسٹر انصاری!“ سیکرٹری نے جمشید انصاری کو مخاطب کیا۔ ”آپ ابھی جا کر ٹرک اس کے مالک کے حوالے کر دیں۔ اور ہاں، اس سامان کی باقاعدہ تفصیل بھی بنا لیجئے گا، جو ٹرک کے ساتھ واپس کیا جائے گا۔“

”رائٹ سر!“ انصاری نے بڑی فرماں برداری سے کہا۔

”ناؤ..... یو گیٹ لاسٹ، مسٹر فریدی! لیکن جانے سے پہلے اپنے ٹرانسفر آرڈر کریم سے لیتے جانا۔“

”ٹھیک ہے۔“ فریدی نے خشک لہجے میں جواب دیا اور اپنی فائل اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔ جاتے وقت اس نے سیکرٹری کو سلام کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔

دو گھنٹے بعد فریدی شعبہ آبکاری سے اپنا چارج چھوڑ کر جانے لگا تو جمشید انصاری نے اسے اپنے آفس میں بلا کر بڑے دوستانہ انداز میں کہا۔

”تم کوئی فکر نہ کرنا، دلبر! میں نے سیکرٹری سے اکیلے میں تمہارے لئے بات کر لی ہے۔ میں تمہیں بہت جلد واپس بلا لوں گا۔ سچ پوچھو تو خود سیکرٹری بھی تمہارا تبادلہ نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن.....“

”میرے خلاف رپورٹ کس نے کی ہے؟“ فریدی نے سنجیدگی سے سوال کیا، پھر خود ہی سرسراتے لہجے میں بولا۔ ”خان محمد نے.....؟“

”ہاں۔ یہ شرارت اسی کبجے نے کی ہے۔“ انصاری نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”کل تک حرامی میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تھا، آج کرسی کیال گئی، اپنی اوقات ہی بھول گیا۔ میں اس کبجے سے بھی بات کروں گا۔“

”نہیں۔ آپ ایسا نہیں کریں گے۔“ فریدی نے تیزی سے کہا۔ ”وہ میرا شکار ہے اور میں اپنا شکار کسی دوسرے کے حوالے نہیں کرتا۔“

”سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا۔“ انصاری نے دبی زبان میں جواب دیا۔ ”تمہیں شاید یہ بات نہیں معلوم کہ اسے اتنی اہم کرسی کیوں ملی ہے۔ سالہا دو پھیوں کی ٹیکسی اپنے خرچ پر اوپر والوں کی دل پشوری کرنے کے لئے پہنچاتا رہتا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے، یہ جو توڑ کا زمانہ ہے۔ ہارڈ کیش اور دوسروں کے عیش کی سپلائی کے

بغیر کام نہیں چلتا۔“ فریدی نے بے پروائی سے کہا، پھر یک لخت گہری سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے اپنے ٹرانسفر کا کوئی افسوس نہیں ہے، سیکرٹری جیسے لوگ میری جیب میں ریز گاری کی طرح پڑے رہتے ہیں۔ میں چاہوں تو ایک کال پر اس کی کرسی بھی ہل سکتی ہے۔ لیکن فی الحال میں ایسا نہیں کروں گا۔ پہلے مجھے کچھ پرانے حساب بے باق کرنے ہیں۔ رہا خان محمد تو میں جانتا ہوں، اس کی کیا اوقات ہے۔ کتے کی دم جب تک ٹکلی میں نہ ڈالی جائے، کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔“

”تم فکر نہ کرو، دلبر! انصاری تمہارے ساتھ ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ فریدی نے انصاری کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا، پھر تھوڑے توقف سے بولا۔ ”میں دراصل ایک لمبے کیس پر کام کر رہا تھا، مجھے اپنی کامیابی کا یقین تھا، اسامی بھی خاصی مالدار ہے۔ دو ڈھائی لاکھ کا توڑ بڑی آسانی سے ہو سکتا تھا اور مال چھوڑ دینے کی صورت میں اس کی پوری قیمت کا نفی فنفی۔ لیکن شاید اس کی قسمت اچھی تھی، جو فریدی کے چنگل میں آتے آتے نکل گیا۔“

”دلبر.....“ انصاری نے خوشامدی انداز میں کہا۔ ”تم مجھ پر بھروسہ کرو۔ وہ کیس میرے حوالے کر دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں، تمہیں تمہارا پورا حصہ ملے گا۔“

”ایک شرط پر۔“ فریدی نے کچھ تامل سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”کام چونکہ لمبا ہے، اس لئے آپ اسے خود کریں گے۔ کسی دوسرے ماتحت کے حوالے نہیں کریں گے۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو دلبر!“ انصاری نے حسب عادت اپنا تکیہ کلام استعمال کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ”کیا تم سوچ سکتے ہو کہ انصاری سوچنے کی چڑیا کو کسی اور کے حوالے کر کے خود اپنے پیروں پر کھڑا کر سکتا ہے؟“

”میری ایک شرط اور بھی ہے۔“

”وہ کیا؟“

”میرے اور خان محمد کے درمیان جو جنگ ہوگی، اس میں آپ کسی قیمت پر ثالث بننے کی کوشش نہیں کریں گے۔“

”منظور ہے۔“

”پھر ٹھیک ہے۔“ فریدی اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں دو چار روز کیس کی مزید چھان بین کرنے کے بعد آپ سے رابطہ قائم کروں گا۔“



خان محمد کا اسٹینو کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایک بہت ہی اہم فائل تھی، جو

چاروں طرف سے سرخ رپر کے اندر بند تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہونے کے بعد جھک کر رک گیا۔ خان محمد اس وقت ایک بہت ہی حسین و جمیل لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہنس ہنس کر رازداری کی باتیں کر رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ خان محمد نے اسٹینو کو گھورتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔

”آٹھ نمبر کی کیس فائل لایا ہوں سر!“ اسٹینو نے بڑے ادب سے کہا۔

”آٹھ نمبر کی کیس فائل؟..... ادہ..... ہاں، ٹھیک ہے۔“ خان محمد نے اس بار نرم انداز میں کہا۔ ”تم نے جو رپورٹ ٹائپ کی ہے، اس پر کسی تیسرے آدمی کی نظر تو نہیں پڑی؟“

”جی نہیں سر! میں نے اسے پرائیویٹ روم کو اندر سے لاک کرنے کے بعد ٹائپ کیا ہے۔“ اسٹینو نے جواب دیا۔ ”کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی۔“

”گڈ! تم میرے اعتبار کے آدمی ہو۔ اپنی زبان بھی بند رکھنا۔ کیا سمجھے؟“

”سمجھ گیا سر!“ اسٹینو نے کہا، پھر آگے بڑھ کر لڑکی پر ایک سرسری نظر ڈالی اور فائل میز پر رکھ کر باہر نکل گیا۔

”دن منٹ، ہنی!“ اسٹینو کے جانے کے بعد خان محمد نے بڑے نشیلے انداز میں لڑکی سے کہا جو اس کی کرسی کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ ”میں ذرا یہ فائل سیف میں بند کر دوں۔“

”کیا یہ فائل مجھ سے بھی زیادہ اہم ہے؟“ لڑکی نے توبہ شکن انگڑائی لیتے ہوئے سوال کیا۔

”تم اپنی جگہ بے مثال ہو، مائی ڈیئر!..... لیکن یہ فائل بھی ٹاپ سیکرٹ ہے۔“ خان محمد فائل لے کر اٹھا پھر پشت پر دیوار میں لگی ہوئی سیف کھول کر فائل کو اس میں رکھنے لگا۔ جتنی دیر میں وہ فائل سیف میں رکھتا، اتنی دیر میں لڑکی اپنا کام کر چکی تھی۔ اس نے اپنے پرس سے ایک براؤن رنگ کا دزنی لفافہ نکال کر اسے بڑی خوب صورتی سے خان محمد کی میز کی چمکی دراز میں رکھی ہوئی فائلوں کے درمیان چھپا دیا تھا۔

”اور سناؤ، کیا پیوگی؟“ خان محمد نے دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”یہ دفتر ہے، اس لئے یہاں ٹھنڈے یا چائے کے سوا اور کوئی چیز نہیں مل سکتی۔“

”میں اب چلوں گی۔“ لڑکی نے ایک ادا سے جواب دیا۔ ”مجھے ایک جگہ اور بھی کام سے جانا ہے۔“

”پرسوں کا دن بھول نہ جانا۔“ خان محمد نے لڑکی کے ساتھ ہی اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں رات نو بجے تمہیں گھر سے پک کر لوں گا۔ تمہیں ٹھیک دس بجے وہاں پہنچنا ہے۔“

”کیا تم کوئی متبادل انتظام نہیں کر سکتے؟“ لڑکی نے قدرے بے زاری سے جواب دیا۔

”نوفلس آرگومنٹس۔“ بڑے افسر نے انتہائی نفرت و حقارت سے کہا۔ ”ہر مجرم پکڑے

”مم..... میں سمجھا نہیں.....“ خان محمد نے اُلجھتے ہوئے کہا۔ وہ بذاتِ خود بھی ایک اہم عہدے پر فائز تھا، لیکن اس وقت ملٹری انسٹیٹوٹ کے سامنے اس کی ایک نہ چل سکی۔ چنانچہ

جانے کے بعد اسی طرح خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمیں تمہارے سلسلے میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ معلوم ہے۔“

خان محمد نے جواب دینے کی کوشش کی، لیکن الفاظ اس کے حلق میں ہی پھنس کر رہ گئے۔ وہ پوری طرح ٹھکنے میں جکڑا جا چکا تھا۔ کچھ دیر تک مجسٹریٹ کی موجودگی میں ضروری قانونی کارروائی ہوتی رہی، پھر ملٹری آفیسر کے حکم پر ملٹری پولیس کے کارندے نے آگے بڑھ کر خان محمد کے ہاتھوں میں جھٹکڑی ڈال دی۔

دوسری صبح شائع ہونے والے اخبارات نے خان محمد کی فوج کے ہاتھوں پکڑے جانے کی خبر کو بڑی تفصیل سے شائع کیا۔ اس کی اور شیخ امتیاز کی تصویریں بھی صفحہ اوّل پر چھپی تھیں۔ فوجی افسروں نے اس خبر کا نام بتانے سے بڑی سختی سے گریز کیا تھا، جس کی خبری کے بعد خان محمد کی گرفتاری عمل میں آئی تھی۔ اس خبر نے اونچے حلقوں میں بھی ہر طرف ایک بے چینی کی لہر دوڑا دی تھی۔



رات کے ٹھیک دس بجے جمشید انصاری اور اس کے مسلح سپاہیوں نے ریلوے کالونی کے اس کوارٹر کو گھیرے میں لے لیا، جس کی نشاندہی پہلے سے کردی گئی تھی۔ ٹرین لائن سے بائیں جانب کچے میں اتر کر سڑک سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر بارہ کوارٹروں پر مشتمل وہ آبادی قائم تھی، جس میں ریلوے کے چھوٹے درجے کے ملازمین رہتے تھے۔ اس کے قرب و جوار میں کوئی آبادی نہیں تھی۔ انصاری اور اس کے سپاہیوں نے جو سادہ لباس میں تھے، تینوں گاڑیاں سڑک کے کنارے ہی چھوڑ دی تھیں۔ مطلوبہ کوارٹر کو گھیرے میں لینے کے بعد وہ کچھ دیر تک اندر کی سن گن لیتے رہے، پھر دو سپاہیوں نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ تقریباً سات منٹ بعد ایک دُپٹے پتلے، مدقوق آدمی نے دروازے کی کدڑی کھولی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی لائٹیں موجود تھیں۔

”کون ہو تم لوگ؟“ اس نے لائٹیں کی مدھم روشنی میں دروازے کے باہر کھڑے دونوں آدمیوں کو باری باری دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کس سے ملنا ہے؟“

”ہم ہاشم خان کی سسرال سے آئے ہیں، پھر جھینگے!“ چوڑے چکلے سینے والے سپاہی نے، جس کا نام یعقوب تھا، لائٹیں والے دُپٹے پتلے آدمی کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ”ہاشم خاں ہے اندر؟“

”اندر کوئی بھی نہیں ہے اور..... ہاشم خان نام کا کوئی آدمی یہاں نہیں رہتا۔“ مدقوق شخص نے اس بار دروازے پر کھڑے ہوئے سپاہیوں کو مشکوک نظروں سے گھورتے ہوئے

کہا۔ ”یہ کاٹنا بدلنے والے چودھری کرم دین کا کوارٹر ہے۔ کرم دین اپنے بیوی بچوں سمیت ایک ہفتے کی چھٹی لے کر گاؤں گیا ہے، دو ایک روز بعد واپسی ہوگی اس کی۔“

”ہم بھی کاٹنا ہی بدلنے آئے ہیں پڑا!“ سپاہی نے اپنا دیسی ساخت کا ریوا لور نیفے سے نکال کر دُپٹے پتلے آدمی کے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”بچ بچ بول اوئے، ہاشم خان کہاں ہے؟“

”وہ..... وہ.....“

”ہٹ پرے، ہم آپ ہی تلاش کر لیں گے اسے۔“ یعقوب سپاہی نے اسے دھکا دے کر راستے سے ہٹاتے ہوئے کہا، پھر بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ اس کے دو منٹ بعد ہی جمشید انصاری تین سپاہیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ سب نے اپنے اپنے ریوا لور اور رائفلوں کے دستوں پر مضبوطی سے ہاتھ جمار کھے تھے۔

”اب بتا..... کہاں ہے ہاشم خان؟“ یعقوب سپاہی نے لائٹیں والے کو گلے سے قہام کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ”اگر جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو ایک منٹ میں تیری کھاٹ کھڑی کر دوں گا۔“

”وہ..... وہ کوئی ایک گھنٹے پہلے آیا تھا۔“ دُپٹے پتلے آدمی نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”دوبارہ کب آئے گا، مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔“

”اب جلدی سے یہ بھی دس دے (بتا دے) کہ مال کہاں ہے؟“

”مم..... مال.....“

”تلاش لو اندر جا کر۔“ جمشید انصاری نے غزاتے ہوئے کہا۔ ”یہ سالے ایک نمبر کے ولد الحرام ہوتے ہیں، سیدھی طرح قبول داری نہیں کریں گے۔“

پھر سپاہیوں کو زیادہ تنگ و دو نہیں کرنی پڑی۔ ایک کمرے کے کوارٹر میں دو پلنگ ساتھ ساتھ بچھے تھے، جن کے نیچے اندر کی طرف دیوار سے لگا کر دو بوریاں کھڑی کی گئی تھیں، ان بوریوں کے نظر آتے ہی سپاہیوں کی آنکھیں کامیابی سے چمک اٹھیں۔ دو سپاہیوں نے پلنگوں کو ایک طرف کھڑا کر کے بوریاں کھولیں تو ان میں بہت ساری پلاسٹک کی تھیلیاں موجود تھیں۔ ہر تھیلی میں ایک کلو چرس موجود تھی۔ انصاری نے ایک تھیلی پھاڑ کر اندر سے برآمد ہونے والی چرس کی موٹی پٹی کو سونگھا تو اس کی آنکھیں بھی چمک اٹھیں۔ جب وہ محکمے میں دو فیٹوں والے جمعدار کی حیثیت سے بھرتی ہوا تھا، تب سے وہ اس خوشبو کو سونگھتا چلا آ رہا تھا۔ وقت، عمر اور ترقی کے ساتھ ساتھ کسی ماہر جوہری کی طرح اسے بھی کھرے کھوٹے کی پہچان ہو گئی تھی۔ بوریوں سے جو مال برآمد ہوا تھا، وہ سو فیصد کھرا اور اعلیٰ درجے کا تھا۔ اس نے احتیاطاً دونوں بوریوں کے اوپر سے دو دو، چار چار تھیلیوں کو پھاڑ کر دیکھا، پھر اندازے سے



”مال وزن کے اعتبار سے چار من سے کچھ اوپر ہی ہوگا۔“

پھر تھیلیوں کی کُل تعداد کو شمار کرنے کے بعد اس کا اندازہ درست ہی ثابت ہوا تھا۔

ڈبلا پتلا آدمی ان کے سامنے خاموش کھڑا خوف سے تھر تھرا کانپ رہا تھا۔ یعقوب کے علاوہ ایک اور سپاہی نے بھی اپنی پوری قوت سے تھپڑ لگا کر اس کی قوت مدافعت کو آزما دیا تو وہ کراہتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ پھر اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ جمشید انصاری کوارٹر کے احاطے میں ایک کونے میں کھڑا اپنے دست راست جعدار روشن علی سے کھسر پھسر کر رہا تھا۔ روشن علی اس کا منہ چڑھا آدمی تھا۔

”انفارمیشن سو فیصد ٹھیک نکلی، لیکن ہاشم خان.....“ انصاری اپنا جملہ مکمل کرنے کے بجائے کسی سوچ میں پڑ گیا۔

”ہو سکتا ہے، ہم سے دیر سویر ہو گئی ہو۔“ روشن علی نے کہا۔ پھر بڑے وثوق سے بولا۔  
”اب اس کا ہاتھ آنا مشکل ہے۔ اسے اب تک ہمارے ریڈ کرنے کی اطلاع مل چکی ہوگی۔ اور ایسی صورت میں وہ سامنے آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔“

”پھر..... کیا خیال ہے؟“ انصاری نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا سونے کی چڑیا کو ہاتھ سے نکل جانے دیں؟ تمہیں تو اس کا ٹھکانہ معلوم ہوگا۔“

”ہاشم خان بڑی اونچی شے ہے، جناب!“ روشن علی نے کہا۔ ”اس کے ایک دو نہیں، دس بارہ ٹھکانے ہیں۔ ہم کہاں کہاں رُلتے پھریں گے؟ اس طرح بات پھیل جانے کا ڈر بھی ہے۔ ویسے ہاشم خان اگر ہاتھ آ گیا تو بھی وہ اس مال کو اپنی ملکیت ماننے کی ہامی کبھی نہیں بھرے گا۔ مال کے ساتھ ہمارے ہتھے چڑھ گیا ہوتا تو اور بات تھی۔ اب تو بس ایک ہی راستہ ہے، ہم اس مال کو چھپر میں اپنے ساتھ لے چلیں۔ غلام حسین سے اپنا پرانا یا رانہ ہے، وہ آپ کو بھی مانتا ہے، دوسروں کے مقابلے میں وہ زیادہ اچھی رقم ادا کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔“

انصاری نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا، پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

”ٹھیک ہے، پہلے ہم ضروری کاغذات تیار کر لیں، پھر مال کو اپنے ساتھ لے چلتے ہیں۔“

”کیا کاغذی گھوڑے دوڑانا ضروری ہے؟“

”روشن علی.....!“ انصاری نے بڑی گمبیر آواز میں جواب دیا۔ ”میری ایک نصیحت ہمیشہ یاد رکھنا۔ موقع واردات سے ضروری کاغذات اور قانونی کارروائی مکمل کئے بغیر کبھی ایک قدم بھی آگے بڑھنے کی حماقت نہ کرنا، ورنہ کسی دن بری طرح پھنس جاؤ گے۔“

”جیسی آپ کی مرضی۔“ روشن علی نے شانے اُچکاتے ہوئے کہا۔

کاغذات کی کارروائی میں آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت صرف نہیں ہوا تھا۔ مشیر نامے پر دو قابلِ اعتماد سپاہیوں کے ہاتھ سے دو پرانے اور پیشہ ور گواہوں کے نام کے جعلی دستخط لگے گئے، پھر دونوں بوریاں ایک گاڑی نیچے منگوا کر اس کی ڈگی میں لوڈ کر دی گئیں۔ انصاری اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ روشن علی بھی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔



جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، جمشید انصاری کی پریشانی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ صبح کے دو بج جانے کے باوجود ابھی تک وہ آبکاری تھانے میں اپنے کمرے میں بیٹھا بڑی بے چینی سے روشن علی کا منتظر تھا، جو غلام حسین کے ہاتھوں پکڑی جانے والی چرس فروخت کرنے گیا تھا۔ اسے روشن علی پر بھی اعتماد تھا اور غلام حسین پر بھی۔ غلام حسین ایک معروف اسمگلر ہونے کے باوجود جمشید انصاری کے پرانے واقف کاروں میں سے تھا اور اب تک انصاری کے کئی کھپے اچھے داموں خرید چکا تھا، جس کے عوض اسے بہت ساری مراعات حاصل ہو جاتی تھیں۔

ڈھائی بجے تک روشن علی کی واپسی نہیں ہوئی تو انصاری نے یعقوب سپاہی کو کمرے میں بلا کر اسے اصل صورتِ حال معلوم کرنے کی خاطر غلام حسین کی طرف جانے کی ہدایت کی۔ لیکن ابھی یعقوب کمرے میں ہی تھا کہ اینٹی کرپشن کا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ خالد، آبکاری مجسٹریٹ کے ساتھ تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ ہاشم خان کے پکڑے جانے والے مال کی کیس فائل انصاری کے سامنے اس کی میز پر ہی رکھی تھی اس کا خیال تھا کہ رقم موصول ہو جانے کے بعد ہی وہ اس فائل کو بھی جلا کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دے گا، لیکن اسے موقع نہ مل سکا۔ ڈی ایس پی خالد اور آبکاری مجسٹریٹ سروہی کو دیکھتے ہی وہ سمجھ گیا تھا کہ دال میں کہیں کالا ضرور ہے۔

”مجھے افسوس کے ساتھ آپ کو یہ اطلاع دینی پڑ رہی ہے، مسٹر انصاری! کہ آپ جس روشن علی کا انتظار کر رہے ہیں، وہ مال کے ساتھ ہمارے قابو آ چکا ہے اور ہم نے مجسٹریٹ کی موجودگی میں اس کا بیان بھی ریکارڈ کر لیا ہے۔“ ڈی ایس پی خالد نے خشک لہجے میں انصاری کو مخاطب کیا۔ ”کیا آپ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ وہ مال آپ نے اسے فروخت کے لئے دیا تھا؟“

اس سے قبل کہ انصاری کوئی جواب دیتا، آبکاری مجسٹریٹ نے وہ فائل بھی اپنے قابو میں کر لی، جس کے اوپر ہاشم خان کا نام درج تھا۔ پھر جیسے جیسے وہ فائل کے اندر لگے ہوئے

کاغذات کو پڑھتا گیا، جمشید انصاری کے چہرے کا رنگ بھی فق ہوتا گیا۔  
 ”اس فائل کی موجودگی میں آپ اب اور کیا بیان دینا چاہتے ہیں؟“ مسٹر سروہی نے نفرت سے کہا۔

”میری عزت اب آپ کے ہاتھ میں ہے، جناب!“ انصاری نے یعقوب سپاہی کو باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے مجسٹریٹ کے سامنے ہاتھ باندھ کر بڑی رقت بھری آواز میں کہا۔ ”میری ریٹائرمنٹ میں صرف دو ماہ باقی رہ گئے ہیں، اگر آپ نے کیس رجسٹرڈ کر لیا تو مجھے نہ صرف مالی خسارے سے دوچار ہونا پڑے گا، بلکہ میں کسی کو منہ دکھانے کے بھی قابل نہیں رہوں گا۔ م..... میں آپ دونوں کی ہر خدمت کرنے کو تیار ہوں۔“

”آئی ایم سوری، مسٹر انصاری!“ مجسٹریٹ سروہی نے اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”اب یہ کیس اور پر تک پہنچ گیا ہے۔“

”ہم نے اوپر سے ملنے والے احکام پر ہی بروقت عمل کیا اور مجھے خوشی ہے کہ ہماری محنت رائیگاں نہیں گئی۔“ ڈی ایس پی خالد نے کہا۔ پھر اٹھتے ہوئے تھکمانہ لہجے میں بولا۔ ”آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“

”کیا کوئی اور صورت ممکن نہیں ہو سکتی؟“ انصاری نے ایک آخری کوشش کی۔ ”اگر ہاشم خان کی کیس فائل تلف کر دی جائے تو روشن علی کے بیان کو میرے خلاف سازش بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔“

”آپ آبکاری مجسٹریٹ کی موجودگی میں قانون کو خریدنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ ڈی ایس پی خالد نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”ہم آپ کے ان جملوں کو بھی آپ کے بیان میں شامل کریں گے۔“

انصاری نے ہر ممکن کوشش کی، لیکن آخر کار اسے ان دونوں کے ہمراہ جانا ہی پڑا۔



دوسری شام کو شائع ہونے والے دو تین اخباروں نے اس خبر کو بہت بڑھا کر شائع کیا تھا۔ انسپکٹر فریدی نے ان تفصیلات کو پڑھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے بڑی خوب صورتی سے ایک ایک کر کے ان تمام افراد کے حساب بے باق کر دیئے تھے، جنہوں نے اسے دلاور خان والے کیس میں جال بچھا کر پھانسنے کی کوشش کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ فریدی کو بھی اس حساب کتاب کو چمکتا کرنے میں جوڑ توڑ سے کام نکالنا پڑا تھا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

فریدی کو اس بات کا علم بھی تھا کہ ہاشم خان کے پکڑے جانے والے مال کی بڑی مقدار

نقلی تھی۔ اصلی مال کے صرف دس بارہ پیکٹ بور یوں کے اوپر محض جمشید انصاری کو دھوکا دینے کی خاطر رکھ دیئے گئے تھے، باقی پیکٹوں میں نقلی مال تھا، جس میں مہندی کی مقدار تین چوتھائی سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ حسب معمول اس کھپ کو بھی اصل مال کے ساتھ ملا کر مختلف اداروں کے بڑے بڑے سینئر افسروں کی موجودگی میں عوام کے سامنے نذر آتش کر دیا جائے گا اور ان اعلیٰ افسروں میں سے کوئی بھی کھرے اور کھوٹے کو پرکھنے کی زحمت نہیں کرے گا۔ اتنا وقت ہی کس کے پاس ہوتا ہے؟



## بہتی گنگا

وہ ایک ساؤنڈ پروف ہال تھا، جو صرف اہم کانفرنس اور میٹنگز کے لئے مخصوص تھا۔ میٹنگ یا کانفرنس کے دوران دو مسلح پولیس والے دروازے پر تعینات رہتے تھے۔ کسی اور کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ بہت ہی مخصوص حالت میں انٹرکام کے ذریعے رابطہ قائم کیا جاسکتا تھا، لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔

اس وقت ہال میں صرف انٹیلی جنس بیورو سے متعلق عہدیدار اور فیلڈ آفیسر موجود تھے۔ کرسی صدارت پر محکمہ کے سربراہ کلکٹر رحمان صاحب پورے کدو فر کے ساتھ بیٹھے اپنے سامنے رکھے ہوئے اس چارٹ کا بغور مطالعہ کر رہے تھے، جس میں تمام فیلڈ آفیسر اور ان کے عہدے داروں کی کارکردگی اور رپورٹ درج تھی۔

حسب و نسب کے اعتبار سے رحمان کے والد کا شمار عالمگیر شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ وہ اپنے وقت کے نہ صرف بہترین ریاضی داں شمار کئے جاتے تھے، بلکہ تعلیم کے شعبے میں بھی ان کی خدمات بیش بہا تھیں۔ پاک و ہند کے چار بڑے ججوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ وہ یو۔ پی کے ایک مشہور شہر میں جس نے ہندوستان کی بے شمار عظیم ترین شخصیتوں کو جنم دیا ہے، چیف جسٹس کے عہدے پر بھی فائز رہ چکے تھے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جاتا تو رحمان صاحب کا کلکٹر کے عہدے پر فائز ہونا کوئی زیادہ قابل فخر بات نہیں تھی۔ موصوف بڑی پہلو دار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت اپنے عملے کے آفیسر بھی تھے اردو ست بھی۔ اعلیٰ کردار اور پروقار شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے پاس وہ دور بین نظریں بھی تھیں، جو جھوٹ اور سچ کی تمیز کرنے میں بے پناہ صلاحیت سمجھتی ہیں۔ جن سے وہ اپنے محکمے کے افراد کو ایک بزرگ کی شفقت بھری نظروں سے دیکھتے اور ان کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہتے تھے، وہاں وہ ان کی ذاتی صلاحیتوں اور کارکردگی سے بھی فرداً فرداً پوری واقفیت رکھتے تھے۔ کئی تاریخ ساز کمیز میں ان کی ذاتی شخصیت کو بھی نمایاں دخل رہا تھا۔ وہ بالخصوص اپنے انٹیلی جنس افسران کو بڑے پیار و محبت کی نظروں سے دیکھتے تھے، لیکن کسی غلط بات کو برداشت کرنا ان کی سرشت کے

خلاف تھا۔ جو لوگ اس محکمے سے وابستہ ہیں، وہ آج بھی ان کا نام بڑی عزت و احترام سے لیتے ہیں اور ان کی کمی کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔

انٹیلی جنس کا عملہ کل دس افراد پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ ایک سپرنٹنڈنٹ صاحب تھے، جو اپنے پستہ قد ہونے کی وجہ سے خاصی دلچسپ شخصیت نظر آتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کریم جعفری تھے، وہ رحمان صاحب کے بہت پرانے واقف کاروں میں سے تھے۔ کسی زمانے میں وہ دونوں ایک ساتھ کالج میں کلاس فیورہ چکے تھے، بلکہ کھیل کے میدان میں بھی ان کے شوق مشترک تھے۔ چنانچہ رحمان صاحب، جعفری صاحب کو خاصی عزت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

انٹیلی جنس سے متعلق افراد کے لئے ایک علیحدہ بنگلہ کرائے پر لیا گیا تھا، جس میں مذکورہ بالا کے علاوہ افسران کے کمرے اور ایک مینی ہال بھی تھا، جس میں ان ڈور گیمز کا انتظام تھا۔ دوسری منزل ان افسران کے لئے مخصوص تھی، جو رات کو بھی کسی انفارمیشن کے سبب دفتر ہی میں قیام کرتے تھے۔ انٹیلی جنس افسران کا عہدہ انسپکٹر کے مساوی تھا، جن کے اوپر اور بھی کئی عہدیدار ہوتے تھے۔ لیکن انٹیلی جنس بیورو سے متعلق افسران کے سلسلے میں رحمان صاحب نے بطور خاص تمام عہدیداروں کو سخت ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ براہ راست کسی کی کارکردگی میں دخل ہونے کی کوشش نہ کریں، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انٹیلی جنس برانچ براہ راست ان کی نگرانی میں تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک رات تقریباً بارہ بجے جب ہم چار افراد جعفری صاحب کی موجودگی کے باوجود برج کے کھیل میں مشغول تھے کہ فون کی گھنٹی بجی اور جعفری صاحب نے حسب معمول فون اٹھایا۔ کھیل وقتی طور پر رک گیا۔ ہر شخص یہی سوچ رہا تھا کہ شاید وہ کال اس کے کسی مخصوص کوڈ رکھنے والے خبر کی جانب سے ہوگی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جعفری صاحب بڑی دیر تک ”جی ہاں“ اور ”جی نہیں“ کے الفاظ استعمال کرتے رہے۔ بیس منٹ کی گفتگو کے دوران وہ اپنے سامنے رکھے ہوئے پیڈ پر مختلف اندراج کرتے رہے، پھر ریسیور رکھ کر بولے۔

”آپ چاروں فوراً تیار ہو جائیں اور ڈرائیور سے کہیں کہ گاڑی نکالے۔“  
”کس کی کال تھی؟“ اکبر خان نے جو عالمی شہرت رکھنے والا ہاکی کا کھلاڑی تھا، سنجیدگی سے پوچھا۔

”رحمان صاحب کی مسز کی۔“  
”خیریت؟“ دو تین افسران نے بیک وقت ہم زبان ہو کر دریافت کیا۔ مسز رحمان کی کال کاسن کر سب ہی اپنی اپنی جگہ الرٹ نظر آنے لگے تھے۔

کر اس طرف روانہ ہو گیا، جہاں آسٹن دُور ہی سے نظر آرہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا رحمان صاحب کے قریب پہنچ گیا، جو بدستور انجن کی مصنوعی خرابی کو دور کرنے میں حد درجہ منہمک نظر آ رہے تھے۔

”سر.....!“ میں نے قریب جا کر کہا۔ ”کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟“

”آپ تنہا ہیں یا.....؟“

”دو گاڑیاں ہیں سر!“ میں نے رحمان صاحب کو تفصیل بتاتے ہوئے کہا، پھر خود بھی انجن پر جھک کر ادھر ادھر ہاتھ چلانے لگا تا کہ اگر کوئی دیکھے تو یہی اندازہ قائم کرے کہ کوئی راہ گیر ایک ضرورت مند کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

”آپ کو میرے بارے میں کس نے اطلاع دی ہے؟“ رحمان صاحب نے دوسرا سوال کیا۔

”مسٹر جعفری کے پاس آپ کی مسز کا فون آیا تھا۔“

”آئی سی.....“ رحمان صاحب نے بڑی گرم جوشی سے کہا۔ ”یہ اتفاق ہے کہ آپ لوگ ٹھیک وقت پر پہنچے، ورنہ مجھے فون کرنا پڑتا۔“

پھر وہ ایک بنگلے کا نمبر بتاتے ہوئے بولے۔ ”تین روز پہلے وہاں کچھ سامان اُن لوڈ ہوا ہے۔ تقریباً چار پانچ بوریاں تھیں۔ وہاں زیادہ تر ایک چینی مرد آتا ہے اور کبھی کبھار کوئی چینی عورت بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے..... اپنی ہاؤ، وہ دونوں اس وقت بھی بنگلے میں موجود ہیں۔ جب کہ گزشتہ دو روز سے صرف ایک پٹھان چوکیدار باہر گھومتا پھرتا، بنگلے کی نگرانی کرتا نظر آ رہا ہے۔ آپ مسٹر جعفری سے کہیں کہ وہ فوری طور پر ریڈ کریں۔ اگر میرے خدشات غلط بھی ثابت ہوئے تو میں بعد میں ہونے والے حالات کو سنبھال لوں گا۔ وِش آل آف یودی بیسٹ آف لک۔“

اس کے بعد انہوں نے بونٹ بند کر کے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔

میں نے واپس جا کر جعفری صاحب کو حالات سے آگاہ کیا، اس بار جعفری صاحب نے جمال الدین کو (جو اب سپرنٹنڈنٹ ہونے کے بعد دو تین سال پہلے ریٹائر ہو چکے ہیں) بنگلے کی لوکیشن دیکھنے کے لئے روانہ کیا۔ آدھے گھنٹے بعد جمال الدین نے واپس آ کر بتایا کہ بنگلے کے باہر ویگن نما ایک گاڑی کھڑی ہے، اس خیال سے کہ کہیں ہماری غفلت سے مال بنگلے سے کہیں اور نہ منتقل کر دیا جائے، ہم نے فوری طور پر ریڈ کا فیصلہ کیا۔ سپاہیوں کو خاص خاص جگہوں پر تعینات کیا گیا۔ ہم میں سے تین افسران بھی بنگلے کی دیوار سے لگے بڑے مختاط انداز میں پوزیشن لئے ہوئے تھے۔ میں نے اور جعفری صاحب نے بنگلے کے اندر داخل ہو کر کال

”مسز رحمان ہمیں غیرت دلا رہی تھیں۔“ جعفری صاحب نے اٹھ کر اپنا لباس اور سر کے بال درست کرتے ہوئے کہا۔

”کیا ہم میں سے کسی سے کوئی بے غیرتی کا یا شرم ناک فعل سرزد ہو گیا ہے، جس کی اطلاع مسز رحمان تک پہنچ گئی ہے؟“ اکبر خان نے بے پروائی سے سوال کیا۔

”ایسی بات ہوتی تو میں آپ کو تیاری کرنے اور گاڑی نکالنے کو کہتا؟“ جعفری صاحب نے چپھتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”ایک اٹھلی جنس افسر کو ہر وقت اپنا دماغ حاضر رکھنا چاہئے۔“

بہر حال، دس منٹ کے اندر اندر ہم سب کیل کانٹے سے تیار ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ دوسری لینڈ روور میں پانچ مسلح سپاہی موجود تھے، جو ہم سے تقریباً پچیس تیس گز کے فاصلے پر تھے۔ عام طور سے یہی طریق کار اختیار کیا جاتا تھا کہ اگر کسی نادیدہ دشمن کی طرف سے اچانک ایک گاڑی پر یلغار ہو تو دوسری اس کی بروقت مدد کر سکے۔

ہماری گاڑی میں کچھ دیر خاموشی طاری رہی، پھر خود جعفری صاحب نے کہا۔

”رحمان صاحب گزشتہ ایک ہفتے سے سوسائٹی کے ایک بنگلے کی نگرانی کا کام بنفس نفیس انجام دے رہے ہیں۔ اس وقت بھی وہ اسی بنگلے کے کہیں قریب موجود ہیں اور وہاں آنے جانے والوں پر نظر رکھ رہے ہیں۔“

”لیکن گلشئر صاحب نے ہمیں تو اس سلسلے میں کوئی اطلاع نہیں دی؟“ اس بار جمال الدین نے کہا۔

”مسز رحمان کو اسی بات کا تو افسوس ہے کہ ہم اٹھلی جنس میں ہونے کے باوجود اپنے سربراہ سے اتنے بے خبر کیوں ہیں۔“

سوسائٹی کے علاقے میں داخل ہونے کے بعد ہم نے تھوڑی سی تگ و دو کے بعد رحمان صاحب کو تلاش کر لیا، جو ایک پرانی آسٹن کا بونٹ اٹھائے بظاہر اس طرح انجن کا معائنہ کر رہے تھے، جیسے اس میں پیدا ہونے والی کسی خرابی کا جائزہ لے رہے ہیں۔ وہ آسٹن انہوں نے یقیناً کسی گیراج سے لی ہوگی، ورنہ ان کے استعمال میں ہمیشہ گرین کمر کی شیورلٹ یا پھر لینڈ روور ہوا کرتی تھی۔

ہم نے وہاں فوری طور پر رُکنے کی حفاقت نہیں کی، کافی آگے جانے کے بعد ہم نے اپنی گاڑی بائیں جانب ایک کشادہ سڑک پر پہنچ کر روک دی، پیچھے آنے والی لینڈ روور جس میں مسلح سپاہی موجود تھے، ہم سے تقریباً پچاس گز آگے جا کر رُکی تھی۔

”مسٹر فیصل!.....“ آپ رحمان صاحب کے پاس جائیں اور معلوم کریں کہ کیا پوزیشن ہے۔“ جعفری صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ دوسرے ہی لمحے میں گاڑی سے نیچے اُتر

نیل بجائی۔ (چوکیدار کو ہمارے ہمراہ جانے والے طور خان نامی سپاہی نے پہلے سے دبوچ لیا تھا)۔ دوسری بار کال نیل بجانے پر دروازہ کھلا اور دوہرے بدن کا ایک پستہ قد چینی باشندہ نکل کر ہمارے سامنے آگیا، جس کے بدن پر سوائے ایک نیکر کے، لباس نام کی دوسری کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کے منہ سے نکلنے والے شراب کے بھکے بتا رہے تھے کہ وہ اس وقت بری طرح نشے میں تھا۔ ہم دو اجنبیوں کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کو چونکا، پھر بڑے ناگوار انداز میں ٹوٹی پھوٹی مگر صاف اُردو میں بولا۔

”کیا بات ہے؟ آپ لوگ گھنٹی کیوں بجاتا؟“

”ہمارا تعلق کسٹم سے ہے اور ہم آپ کے بنگلے کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔“ جعفری صاحب نے اپنا کارڈ نکال کر چینی مرد کو دکھاتے ہوئے کہا۔

”دہاٹ نان سنس؟“ وہ تیزی سے بولا۔ ”آپ ہم کو کیا چور یا اسمگلر سمجھا؟“

”اس کا جواب تو ہم تمہارے بنگلے کی تلاشی لینے کے بعد دیں گے۔“ میں نے قدرے اونچی آواز میں کہا تو باہر چھپے دو افسران اور دو سپاہی بھی طے شدہ پروگرام کے تحت رائفلیں تان کر آگئے۔ باقی بدستور مورچے سنبھالے ہوئے تھے، تاکہ آڑے وقت پر ایکشن کر سکیں۔ چینی مرد یہ سب کچھ دیکھ کر بھی نہیں گھبراہٹا۔

”کون ہوتا چیانگ؟“ اندر سے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ لیکن اس سے پہلے کہ چیانگ کوئی جواب دیتا، ہم لوگ دندناتے ہوئے بنگلے کے اندر داخل ہو گئے، جو تین بیڈروم اور ایک ڈرائنگ روم اور ڈائننگ پر مشتمل تھا۔

چیانگ کو ایک سپاہی کے حوالے کر کے ہم تیزی سے بنگلے میں پھیل گئے۔ ہم نے جس عورت کی آواز سنی تھی، وہ ایک بیڈروم میں نیم عریاں حالت اور نشے کی کیفیت سے دوچار بکھری پڑی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ بوکھلا کر اٹھی اور اس نے بیڈ شیٹ سے اپنا جسم ڈھانپ لیا۔ جعفری صاحب کے اشارے پر چیانگ کو بھی اسی کمرے میں لے آیا گیا۔ وہ ہم لوگوں کو بڑی خشکیوں نظر دے دیکھ رہا تھا۔ ہمارے اندر داخل ہونے کے دو منٹ بعد باقی تمام سپاہی بھی اندر آ گئے۔ جعفری صاحب کے اشارے پر سب لوگوں نے تلاشی لینے کا کام شروع کر دیا۔ میں ان کے ساتھ ہی رُک گیا۔

”تم ہمارا انجوائمنٹ ڈسٹرب کیا۔“ چیانگ نے تھوڑی دیر کے بعد دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”ہم تم سب کو کورٹ میں چیلنج کرے گا اور ایک ایک کو دیکھ لے گا۔“

”مسٹر چیانگ!“ میں نے سروس ریوالور کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے اُسے خوف زدہ کرنے کی کوشش کی۔ ”فی الحال اپنی زبان بند ہی رکھو، ورنہ پھر ہمیں تمہارے ساتھ کوئی اور سلوک کرنا پڑے گا۔“

”دہاٹ؟“ وہ بدستور جھلکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”کیا سلوک کرے گا آپ لوگ؟ ہم ایڈمٹ کرتا کہ ہم یہ بنگلہ کرائے پر اپنے انجوائمنٹ کے واسطے لیا۔ عیاشی گھر میں کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔“

”یہ عورت کون ہے؟“ جعفری صاحب نے دریافت کیا۔

”ہمارا سیکنڈ وائف۔ تم کو کوئی آپجیکشن ہے؟“

ہمیں پورا یقین تھا کہ رحمان صاحب نے ہمیں جو اطلاع دی تھی، وہ غلط ثابت نہیں ہو گی۔ ہمیں امید تھی کہ کسی لمحے بھی ہمارا کوئی ساتھی اندر داخل ہو کر یہ اطلاع دے گا کہ وہ چار یا پانچ بوریاں قبضے میں کر لی گئی ہیں۔ لیکن ان بوریوں میں کیا تھا؟ ہمیں اس کے بارے میں مطلق کوئی علم نہیں تھا۔

چیانگ بری طرح سچ و تاب کھا رہا تھا۔ ہمیں بظاہر اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اکثر مجرم قانون کے جال میں پوری طرح پھنسنے سے پہلے اسی انداز میں ری ایکٹ کرتے ہیں، جیسے ان سے زیادہ شریف کوئی دوسرا نہیں ہوگا۔ لیکن پڑے جانے کے بعد اُن کے سارے کس بل نکل جاتے ہیں۔ ہم ابھی کسی ایسی ہی پوزیشن کی آس لگائے ہوئے تھے، جب جمال الدین اور عملے کے دیگر افسران نے اندر داخل ہو کر یہ خبر سنائی کہ بنگلے میں چار پانچ بوریاں تو کیا، کوئی بھی ایسی غیر قانونی شے نہیں ملی، جس کی بنیاد پر چیانگ یا بقول اس کے اُس کی سیکنڈ وائف کو حراست میں لے کر ہراساں کرتے۔ اس خبر نے ہماری پوزیشن کو جیسے ایک دم ہی خراب کر دیا تھا۔

”ناؤ تم آن.....“ ہم سے پہلے چیانگ کی آواز کمرے میں گونجی۔ ”اب بولو..... تم لوگ کس وجہ سے جھک مارنے کو ادھر داخل ہو؟ ہم ابھی پولیس کو فون کر کے ٹرس پاسنگ (Tres Passing) کا کیس بنائے گا۔“

”مسٹر چیانگ!“ جمال الدین نے اسے تیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”یہ مت بھولو کہ ہمارا کس محکمے سے تعلق ہے۔ ہم چاہیں تو تمہارے اوپر کوئی جھوٹا کیس بھی بنا کر تمہارے ہاتھ میں بھسکڑی ڈال سکتے ہیں۔“

”ٹیو ایٹ، چیانگ!“ عورت نے جلدی سے کہا۔ ”کیوں اپنا موڈ کھراب کر؟ ان لوگوں کو جانے دو۔“

نہ جانے کیا بات تھی کہ عورت کا وہ جملہ سن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ رحمان صاحب نے جو اطلاع دی تھی، وہ غلط نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ چیانگ نے دن کے وقت ان بوریوں کو کہیں اور ہٹا دیا ہو۔ لیکن ان تمام امکاناتی پہلوؤں کے باوجود مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ چنانچہ میں نے چیانگ کو گھورتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں

سوال کیا۔

”ہمارے ایک انفارمر نے اطلاع دی تھی کہ تین چار روز پہلے تمہارے بنگلے میں چار پانچ خاصی وزنی بوریاں رات کے وقت لائی گئی تھیں۔ کیا یہ غلط ہے؟“

چیانگ ایک لمحے کو چونکا، پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”آئی سی..... آپ لوگ اس بوری کی تلاش میں ادھر آیا..... اس میں تو دولن کلاتھا تھا۔ ہمارا ایک دوست نے باہر سے یوزڈ ڈریس (Used Dress) منگایا تھا، پھر وہ دوسرا دن ہی اسے اٹھا لے گیا۔“

”تمہارے اس دوست کا نام کیا تھا؟“

”وہ..... یہی دھندا کرتا ہے..... اس کا نام لی یانگ ہوتا۔“

چیانگ نے ایک بار پھر تھوڑا وقت لینے کے بعد جواب دیا تھا، جو ہمارے شے کو مزید تقویت دینے کے لئے کافی تھا۔ لیکن سوال اب بھی وہی تھا کہ وہ بوریاں اس وقت وہاں دستیاب نہیں تھیں اور ان کی غیر موجودگی میں ہم چیانگ کی زبان کھلوانے کی خاطر تھوڑا ڈگری کا کارآمد نسخہ بھی استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ رحمان صاحب کی جانب سے بڑی سخت ہدایت تھی کہ مال نہ پکڑے جانے پر محض شبہات کی بنیاد پر کسی کو تار جڑ نہ کیا جائے، ہم اس ہدایت کی خلاف ورزی بھی نہیں کر سکتے تھے۔

”بابا لوگ! اب آپ ادھر سے چلے جاؤ۔ کیوں ہمارا پیس کھراب کرتا ہے؟“ عورت نے ہم لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ وہ ابھی تک اپنے جسم کو چادر میں چھپائے بستر پر بیٹھی تھی۔

”مسٹر چیانگ.....!“ میرا لہجہ یک لخت کرخت ہو گیا۔ ”کیا تم شرافت سے اپنی زبان نہیں کھولو گے؟“

”وہاٹ.....؟“ چیانگ نے پھر پھیلنے کی کوشش کی۔ ”ایک تو تم لوگ ہمارا انجوائمنٹ ڈسٹرب کیا اور اوپر سے تھریٹ (Threat) کرنا مانگتا؟..... گیٹ لاسٹ۔ نہیں تو ہم پولیس کو فون کرتا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ خبر نے ہمیں غلط اطلاع دی ہے۔“ جعفری صاحب جو بنیادی طور پر ایک شریف اور نیک آفیسر تھے۔ (خدا ان کو غریب رحمت کرے اس لئے کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے، ان کی موت اسسٹنٹ کلکٹر ہونے کے بعد واقع ہو چکی ہے) معاملے کو رفع دفع کرنے کی خاطر بولے۔ ”لیٹ اُس گوبیک۔“ (Let us go back)

”مسٹر چیانگ.....!“ میں نے جعفری صاحب کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے چیانگ پر ایک آخری حربہ آزمایا۔ ”خیریت چاہتے ہو تو سب کچھ اگل دو، ورنہ مجھے خبرنے یہ بھی بتایا ہے کہ تم نے وہ بوریاں کہاں چھپائی ہیں۔ وہ جگہ میرے علم میں ہے۔ اور ان کو برآمد

کرنے سے پہلے میں تمہارا گھر بھی کھود سکتا ہوں..... اچھی طرح خوب سوچ لو..... ابھی بات ختم بھی ہو سکتی ہے..... مگر معاملہ چھوٹی رقم پر طے نہیں ہوگا۔ تمہیں ان بوریوں میں بھرے مال میں سے ففٹی پرسنٹ ہمیں دینا ہوگا۔ مال کی صورت میں۔ یا پھر کیش۔“

چیانگ کسی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ میں نے لوہا گرم دیکھ کر ایک اور ضرب لگائی، عورت کا چہرہ بھی یک دم پیلا پڑ گیا تھا۔

”ہمارے پاس وقت کم ہے، مسٹر چیانگ!..... اور یہ بھی سوچ لو کہ اس مال کی قیمت ملکی نہیں بلکہ غیر ملکی منڈی کے حساب سے لگائی جائے گی۔“

”میں آپ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“ چیانگ نے کسی ہارے ہوئے جواہری کی طرح مضطرب انداز میں کہا۔

میرے اشارے پر باقی لوگ کمرے سے باہر نکل گئے۔ البتہ جعفری صاحب بدستور میرے ساتھ رہے۔

”میں آپ کو پچاس ہزار ڈالون بے منٹ کرنے کو تیار ہوں، لیکن ایک شرط پر۔“

”وہ کیا.....؟“ میرے بجائے جعفری صاحب نے پوچھا۔

”آپ لوگ پیسے لینے کے بعد اس وقت تک یہیں نہیں رہیں گے، جب تک میں مال چوکیدار کے ساتھ کسی اور جگہ ٹرانسفر نہ کر دوں۔“

”اب تم سچ بول رہے ہو، مائی ڈیئر چیانگ!“ میں نے کسی راشی آفیسر کا رول ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”مخبر کی ایک اطلاع یہ بھی تھی کہ تمہارا چوکیدار تمہارے لئے کیریئر (Carrier) کی خدمات بھی انجام دیتا ہے۔“

”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے.....“ چیانگ نے کہا۔ ”تمہیں صرف اپنی رقم سے کنسرن (Concern) ہونا چاہئے۔“

”مال کتنا ہے؟“ میں نے رازداری سے سوال کیا۔

”دس من۔“

”پانچ بوریوں میں مال پندرہ من بھی ہو سکتا ہے۔ میں اپنے ساتھیوں کو دس من ہی بتاؤں گا، لیکن تمہیں سچی بات اُگھنی ہوگی۔“ میں نے کاروباری انداز میں کہا۔ ”دوسری شکل میں ہمیں وہ مال نکوانا پڑے گا۔“

”آپ چاہو تو تسلی کر سکتے ہو..... مال پورا دس من ہے۔“

ابھی میں چیانگ کو پوری طرح کرید بھی نہیں سکا تھا کہ جمال الدین جو ہمارے گروپ کا سب سے ذہین اور ایمان دار آفیسر تھا، تیزی سے اندر داخل ہوا، اس کے ہمراہ طور خان سپاہی بھی تھا۔

”گرفتار کر لو اس باسٹروڈ کو۔“ جمال الدین کے حکم کی دیر تھی کہ طور خان نے جو کسی زمانے میں ملٹری میں بھی کام کر چکا تھا، تیزی سے لپک کر چینگ کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ عورت کا چہرہ اب بالکل ہی زرد ہو چکا تھا۔ جمال الدین نے جعفری صاحب سے کہا۔

”ہماری انفارمیشن غلط نہیں تھی۔ مسٹر فیصل نے جو ٹریپ تیار کیا تھا، اس کے بعد ہی میں نے دوبارہ باہر جا کر مختلف جگہوں کو آزمایا، پھر پانچوں بوریاں ایک ہاتھ روم سے برآمد ہو گئیں، جس کے نیچے ایک چھوٹا سا انڈر گراؤنڈ اسٹور روم بھی موجود ہے، جو ہاتھ روم میں لگے ہوئے سوئچ بورڈ کے ایک سوئچ سے کنٹرول ہوتا ہے، اتفاق ہی تھا کہ مجھے اس بورڈ پر شبہ ہو گیا۔ وہاں دو پوائنٹ ہیں، لیکن چار سوئچ موجود تھے۔ میں نے ان چاروں کو باری باری آزمایا تو فرش کے نیچے ایک چھوٹا سا خانہ بھی موجود تھا، بوریاں وہیں سے برآمد کی گئی ہیں۔ لیکن ہمیں وہ مال متعلقہ محکمے کے سپرد کرنا ہو گا۔“

”پانچوں بوریوں سے اعلیٰ قسم کی افیون برآمد ہوئی ہے۔“ جمال الدین نے مزید بتایا۔ بہر حال ضروری کارروائی کے بعد تمام کاغذات اور افیون متعلقہ محکمے کے حوالے کر دی گئی۔ اس کے بعد اس کا انجام کیا ہوا؟ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ایک عرصے تک ہمیں اس شاندار کیس کے سلسلے میں انعام کا انتظار رہا، لیکن ”اے بسا آرزو کہ خاک شدہ“..... لیکن اس چینی مرد کی دکان (دندان ساز) آج بھی صدر کے ایک خاص علاقے میں ہے۔ ویسے اس کا نام چینگ نک نہیں ہے، کچھ اور ہے جسے میں نے جان بوجھ کر تبدیل کر دیا ہے۔

غرضیکہ رحمان صاحب چیئر مین کی کرسی پر بیٹھے اس وقت اپنے سامنے رکھی ہوئی فہرست کو دیکھ رہے تھے۔ باقی تمام افراد اپنی اپنی کرسیوں پر بڑی مستعدی سے بیٹھے تھے۔ رحمان صاحب نے فہرست کا بہ نظر غور مطالعہ کرنے کے بعد اسے فائل میں بند کیا، پھر پرنٹنڈنٹ ایٹلی جنس مسٹر سراج الدین کی طرف دیکھ کر بولے۔

”حیدر آباد ڈویژن کس کے پاس ہے؟“

”مسٹر مشرف حسین کے پاس۔“ سراج الدین نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے جواب دیا۔ ان کے چہرے پر اچانک ایک رنگ ابھر کر ڈھنڈلا گیا تھا۔ میں تاڑ گیا کہ رحمان صاحب نے خاص طور پر حیدر آباد ڈویژن کے نام سے میٹنگ کا آغاز کس وجہ سے کیا ہے۔ میں نے کن آنکھوں سے مشرف حسین کی جانب دیکھا، وہ بھی کچھ مضطرب سا نظر آ رہا تھا، لیکن اس نے دخل در معقولات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

رحمان صاحب جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، بڑی پہلو دار شخصیت کے مالک تھے، ان کی دور بین نگاہیں، مشاہدہ اور ذہن غضب کا تھا۔ ان کے نیچے ہزاروں افراد پر مشتمل عملہ کام کرتا تھا، لیکن وہ ہر فرد پر گہری نگاہ رکھنے کے عادی تھے۔ ان کی چھٹی جس کا یہ عالم تھا کہ

وہ کسی بھی شخص کو ایک بار دیکھ لینے کے بعد جو رائے قائم کرتے تھے، وہ شاذ و نادر ہی غلط ثابت ہوتی تھی۔ جہاں وہ کارکردگی کے سلسلے میں سخت گیر طبیعت کے مالک تھے، وہاں اپنے عملے سے اتنا پیار بھی کرتے تھے کہ ان کی نجی زندگی کے بارے میں وہ خاصی معلومات بھی رکھتے تھے۔ دفتری کارکردگی کے بارے میں کوئی آخری رائے قائم کرنے سے پہلے اپنے دل کے اس نرم گوشے کو بھی ضرور ٹٹولتے تھے، جس میں اس شخص کے کوئی نجی حالات اس کی کارکردگی پر اثر انداز ہونے کا سبب بن سکتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ جب تک کسی آفیسر کو ذہنی آسودگی حاصل نہ ہو، آپ اس سے اچھے نتائج حاصل کرنے کی توقع بھی نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی حیثیت میں جہاں تک بھی ممکن ہوتا، ایسے افراد کی داسے، درسمے، سختی مدد بھی کرنا اپنا محکمہ جاتی فرض سمجھتے تھے۔ کسی افسر کا تبادلہ کرتے وقت بھی وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ کہیں ان کا یہ عمل مذکورہ افسر کی کارکردگی پر اثر انداز نہ ہو۔

رحمان صاحب کو جھوٹ سے اس درجہ چوتھی کہ ان کا پارا ایک دم ہی سے چڑھ جاتا تھا۔ ان کے سامنے سچ بول کر کوئی بھی افسران کی شخصیت سے فائدہ اٹھا سکتا تھا اس لئے کہ وہ اس بات کو قطعی ناپسند کرتے تھے کہ ان کے کسی افسر کو کسی دوسری ایجنسی کے ہاتھوں ذلت کا سامنا کرنا پڑے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک بار ہمارے ہی گروپ کے ایک افسر نے جنگ شاہی کے مقام پر سونے کا ایک ٹیکس پکڑا تھا۔ اس کی نیت خراب تھی، اس لئے وہ موقع واردات پر کاغذی کارروائی کرنے کے بجائے سونا لے کر واپس کراچی آ گیا۔ لیکن اس عرصے میں جنگ شاہی کے کسی ریلوے افسر نے جو اس معاملے کو دیکھ چکا تھا، کراچی ریلوے اسٹیشن کو آگاہ کر دیا۔ چنانچہ جیسے ہی مذکورہ افسر کراچی پہنچا، ریلوے پولیس نے اسے اور اس کے ایک عدد سپاہی کو اپنی تحویل میں لے کر لاک اپ میں بند کر دیا۔ رحمان صاحب کو اطلاع ملی تو بنفس نفیس سٹی اسٹیشن پہنچ کر ریلوے پولیس کے ایس پی سے ملے اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ پولیس کے عملے نے اس افسر کا دفتری شناختی کارڈ جس پر اٹلی جنس افسر کا عہدہ درج تھا، دیکھنے کے بعد بھی اس کی کوئی پروا نہیں کی، وہ اس قدر آپے سے باہر ہو گئے کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر کراچی پولیس کے ذمے دار افراد کے ساتھ ساتھ ڈی آئی جی صاحب بھی وہاں پہنچ گئے اور رحمان صاحب سے نہ صرف معذرت کی بلکہ مذکورہ افسر کو مع سپاہی اور سونے کے، رحمان صاحب کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اسی وقت آزاد کر دیا۔ اس روز رحمان صاحب کا غصہ چشم دید تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ مارے غصے کے ان کے منہ سے جھاگ اڑ رہا تھا تو شاید بے جا نہ ہو گا۔

اپنے دفتر پہنچ کر رحمان صاحب نے اس افسر سے صحیح صورت حال دریافت کی۔ وہ افسر چونکہ رحمان صاحب کی طبیعت سے پوری طرح واقف تھا، اس لئے اس نے نظریں جھکا کر

اقرار کر لیا کہ چونکہ اس کا مکان بن رہا تھا اور اسے پیسوں کی فوری ضرورت تھی، اس لئے اس کے دل میں بے ایمانی آگئی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی اپنی جگہ کسی حد تک درست تھی کہ گاڑی جنگ شاہی کے پلیٹ فام پر بہ مشکل ایک یا ڈیڑھ منٹ رکتی تھی۔ تمام رواد سن کر رحمان صاحب خاصے جزیب ہوئے۔ افسر مذکور نے چونکہ سچ بول دیا تھا، اس لئے سونے کو کاغذات بنوانے کے بعد ضبط کر لیا گیا۔ لیکن اس افسر کا تبادلہ دور دراز کی ایک ایسی چیک پوسٹ پر کر دیا گیا، جو بقول دوسرے افسران کے جنگل بیابان میں واقع تھی اور وہاں جان جانے کا دھڑکا بھی ہر وقت لگا رہتا تھا۔ بہر حال، اس کی ملازمت سچ گئی۔ جب تک رحمان صاحب کلکٹر کے عہدے پر فائز رہے، اس وقت تک اس کا تبادلہ کراچی ممکن نہیں ہو سکا۔

بہر حال، میں نے سپرنٹنڈنٹ سراج الدین اور مشرف حسین دونوں کے چہرے پر نمودار تاثر کو نظر غور دیکھا۔ جعفری صاحب اس زمانے میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے، لیکن چونکہ ان کے اور رحمان صاحب کے پرانے مراسم تھے، اس لئے وہ بھی اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ رحمان صاحب کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ وہ اس طرح اپنے غصے کا اظہار کرتے تھے کہ صاحب معاملہ ان کی ناراضگی کا سبب بھی سمجھ جائے اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی موجودگی میں اسے کسی قسم کی سبکی بھی نہ اٹھانی پڑے۔ اس وقت بھی وہ سراج الدین کا جواب سن کر اپنے مخصوص انداز میں ایک بل کے لئے مسکرائے، پھر سنجیدگی سے تمام افراد کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

”مجموعی طور پر میں آپ کی برانچ سے مطمئن ہوں، لیکن کچھ اسپاٹس پر اب بھی خاصی محنت کی ضرورت ہے۔ حکومت آپ کو ہر قسم کی مراعات دیتی ہے، آپ میں سے کسی کو اگر کوئی پریشانی لاحق ہو تو مجھے بتائیں، میں اسے دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کروں گا۔ لیکن یہ بات کتنی افسوس ناک اور قابل شرم ہے کہ ہم اپنا ٹور پروگرام بنا کر حکومت سے ہر ماہ ڈیلی الاؤنس اور ٹریولنگ الاؤنس تو غیر قانونی طور پر وصول کرتے رہیں، لیکن ہماری کارکردگی صفر کے برابر ہو..... اس سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہم کراچی میں رہ کر بھی دفتر سے آٹھ دس روز غائب رہیں اور اس غیر قانونی حاضری کو بھی ٹی، اے اور ڈی، اے کی صورت میں وصول کر کے یہ ظاہر کریں کہ کسی کیس پر بڑی محنت کر رہے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ اب یہ سلسلہ بند ہو جائے تو اچھا ہے، ورنہ میں ایکشن لینے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“

اس بار پھر بیشتر افراد اپنی نشستوں پر بت بنے بیٹھے رہے۔ کسی نے کوئی جواب دینے کی جرأت نہیں کی۔ رحمان صاحب نے محسوس کر لیا تھا کہ ان کے جیلے کچھ افسران پر بجلی بن کر گرے ہیں، چنانچہ انہوں نے فوراً ہی ماحول کا رخ بدلنے کی خاطر جعفری صاحب کو مخاطب کیا۔

”جعفری! آپ کا کیا مشورہ ہے؟ کیا اسٹاف کو الاٹ شدہ علاقے کی ری شفٹنگ نہ کر دی جائے؟“

”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“ جعفری صاحب نے بڑی فرمانبرداری سے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ افسران کو ایک آخری موقع اور دینا چاہئے۔“ سراج الدین صاحب نے مشورہ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مشرف حسین کو بچانا چاہتے تھے۔ لیکن یہ بات سب ہی کو معلوم تھی کہ رحمان صاحب کے دماغ میں جو بات بیٹھ جائے اسے نکالنا آسان بات نہیں تھی۔ مجھے اس بات کا علم بھی تھا کہ مشرف حسین جو کچھ کر رہا تھا، اس میں سراج الدین کو پورے پچاس فیصد کا کھر بیٹھے فائدہ پہنچ رہا تھا۔

”آپ سنائیے، آفتاب احمد.....!“ رحمان صاحب نے سراج الدین کی بات پر کوئی دھیان نہ دیتے ہوئے آفتاب احمد کو مخاطب کیا، ان کی کارکردگی فیلڈ ڈیوٹیز کے مقابلے میں کم اور دیگر سوشل معاملات میں زیادہ تھی۔ اس لئے انہیں خاص رعایت دے کر اسپورٹس آفیسر کے عہدے پر فائز کر رکھا تھا۔ ”آج کل آپ کیا کر رہے ہیں، اسپورٹس کیسا چل رہا ہے؟“ ”فرسٹ کلاس سراً!“

”میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کی ذمہ داریوں میں کچھ اور اضافہ کر دوں۔“ رحمان صاحب نے کہا، پھر اپنے پی اے سے مخاطب ہوئے۔ ”آج سے آفتاب احمد کو ٹرانسپورٹ آفیسر کا چارج بھی سنبھالنے کے آرڈر کر دو۔“

”اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ آفتاب احمد کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ رحمان صاحب چونکہ ان کی رگ رگ سے واقف تھے، اس لئے انہیں اس بات کا بھی بخوبی علم تھا کہ آفتاب اسپورٹ اور سوشل ورک میں کم اور لڑکیوں کے سرکل میں زیادہ دلچسپی لینے کے عادی تھے اور وہ لڑکیاں جوان کے دامِ اُلفت میں گرفتار ہو جاتی تھیں، انہیں وہ ”مکی شگنی“ کے نام سے یاد کرنے کے بے حد شوقین تھے۔ آفتاب احمد کے سلسلے میں رحمان صاحب اس لئے بھی رعایت برتتے تھے کہ وہ ان کے خاندانی پس منظر سے بھی واقف تھے اور ان کے بزرگوں سے ان کے ذاتی مراسم بھی رہ چکے تھے۔

”آپ بہت سنجیدہ نظر آ رہے ہیں، جمال الدین صاحب! کیا بات ہے؟“ رحمان صاحب کا روئے سخن اس مرتبہ جمال الدین کی طرف ہو گیا، جن کا تعلق کانپور سے تھا۔ جمال الدین نہ صرف یہ کہ ڈبل ایم اے تھے، بلکہ انتہائی زندہ دل ہونے کے ساتھ بے حد ایمان دار بھی تھے، جب تک ملازم رہے، انہوں نے کبھی ایک پیسہ پائی بھی رشوت کی نہیں لی، بلکہ اپنی جیب خاص سے غریبوں کی مدد کرنا ان کا خاص مشغلہ تھا۔ ان کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک شرارتی اور آسودہ سی مسکراہٹ چلتی رہتی تھی۔



”بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں، جناب!“ جمال الدین نے سنبھل کر جواب دیا۔  
 ”میں آپ کی کارکردگی پر بہت زیادہ خوش ہوں۔ اس لئے کہ کیس پکڑنے کی خاطر آپ کسی مجرم کی شہ رگ تک پہنچنے کے لئے اکثر چھاؤڑی والے کارول بھی بخوبی انجام دیتے ہیں۔“ (ایک بار ایسا ہو چکا تھا)  
 ”آپ کی محبت ہے، سر! ورنہ من آئم کہ من دانم۔“ اس بار جمال الدین نے اپنی روایتی بذلہ نجی سے کام لیا۔

”آج کل آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟“

”ایک کیس پر کام کر رہا ہوں، امید ہے کہ بہت جلد کامیاب ہو جاؤں گا۔“  
 رحمان صاحب فرداً فرداً دسیوں انگلی جنس افسران سے باتیں کرتے رہے، پھر میری جانب دیکھ کر بولے  
 ”مسٹر فیصل! میں بڑی سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں کہ آپ کو گولڈ ماسٹر کے خطاب سے نواز دوں۔ اس لئے کہ میری معلومات کے مطابق آپ نے دو سال کے عرصے کے اندر اندر سونے کے اتنے کیس کئے ہیں، جو ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتے ہیں۔“  
 ”یہ سب آپ کی پراپرٹیز کا نتیجہ ہیں سر!“ میں نے سنجیدگی سے کہا، پھر بڑی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بولا۔ ”ویسے میرا تجربہ چونکہ بذات خود بھی چھوٹے پیمانے پر سونے کی اسمگلنگ کے کاروبار میں ملوث ہے، اس لئے اس کی دی ہوئی تینانوے فیصد انفارمیشن درست ثابت ہوتی ہیں۔“

”یو آر رائٹ۔“ رحمان صاحب نے تہہ نہ کیا۔ ”جب تک مجر بذات خود اسمگلنگ کے کاروبار میں ملوث نہ ہو، وہ ایک اچھا مجر کبھی نہیں ثابت ہو سکتا۔ ویسے بانی دی دے، آپ کے گولڈ کیسز کے مجر کا کیا نام ہے؟“

”اے۔ون۔“ میں نے کوڈ ورڈ میں کہا۔ اس لئے کہ ہر شخص کو ایک وقت میں دو مجر رکھنے کی اجازت تھی، جن کو حکومت کے سیکرٹ فنڈ سے پانچ سو روپے ہر ماہ بطور جیب خرچ دیئے جاتے تھے۔ یہ رقم انٹیلی جنس آفیسر خود بغیر کسی دستخط کے وصول کرتا تھا اور اس کو بغیر کسی رسید کے اپنے تجربہ تک پہنچانا بھی اسی کی ذمہ داری تھی۔ ان کے نام ظاہر نہیں کئے جاتے تھے بلکہ ہر انٹیلی جنس آفیسر اپنے نام کے ساتھ ون اور ٹو کا اضافہ کر دیا کرتا تھا۔ یہاں بھی ایک بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ مشرف حسین نے بھی اپنے نام پر دو مجر الاٹ کر رکھے تھے، جن کی رقم وصول کر کے وہ سراج الدین کے ساتھ ہر ماہ فغنی فغنی کر لیا کرتا تھا۔ وہ چونکہ پرانا اور تجربہ کار افسر تھا، اس لئے تمام چور دروازوں سے بخوبی واقف تھا۔ اپنی کارکردگی دکھانے کی خاطر مہینے میں ایک آدھ کیس بھی کر لیا کرتا تھا۔ جس میں بیشتر خود اسی کی رعایت کی وجہ سے

کورٹ سے چھوٹ جاتے تھے، اس کا معاوضہ ان کی بالائی آمدنی سے ہٹ کر ہوتا تھا۔ لیکن سراج الدین اس ”خاص میدان“ میں بھی برابر کے حصے دار تھے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ رحمان صاحب اور میری گفتگو کو مشرف حسین اور سراج الدین ناپسندیدہ انداز میں زبردستی سننے پر مجبور نظر آتے تھے۔ خاص طور پر ”گولڈ ماسٹر“ کے خطاب والی بات سن کر تو مشرف حسین کا چہرہ یوں لٹک گیا، جیسے سڑا ہوا میٹن ہو۔ سراج الدین بھی اپنی کرسی پر کسمسا کر رہ گئے تھے۔

”آپ کے نام پر غالباً صرف ایک ہی مجر الاٹ ہے؟“ رحمان صاحب نے سوال کیا۔

”جی ہاں۔“

”آئی سی۔“ رحمان صاحب نے پُر خیال انداز میں کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولے۔ ”کسی اچھے مجر کے لئے محض پانچ سو روپے کی رقم بالکل نا کافی ہوتی ہے، کوئی مجر بھی اتنا طویل انتظار کرنے سے گریز کرتا ہے کہ کب عدالت سے مجرم کو سزا ہو اور کب اسے انعام کی رقم وصول ہو۔ اکثر مجروں کو تو سال سال بھر انعام کی رقم کی خاطر چکر لگانے پڑتے ہوں گے۔“  
 ”لیس سر!“ میں نے اس بار بھی مختصر جواب دیا۔

”اچھا..... آپ فی الحال یوں کریں کہ اپنے نام پر اے۔ون بھی الاٹ کر لیں اور پوری ایک ہزار کی رقم اے۔ون کو دے دیا کریں۔“  
 ”رائٹ سر۔“

”ایک بات اور.....“ رحمان صاحب نے مجھے ٹٹولنے کی خاطر پوچھا۔ ”کیا آپ نے اے ون کو اس کے ذاتی کاروبار..... میرا مطلب ہے کہ اسمگلنگ کرنے میں بھی کسی قسم کی کوئی مدد کی ہے؟“

”جی ہاں.....“ میں نے بغیر جھجکے تیزی سے کہا۔ ”یہی وجہ ہے کہ اے ون میرے لئے روزِ اوّل ہی سے بہت زیادہ کارآمد ثابت ہو رہا ہے۔ ایک دو بار تو میں اس کا سو پچاس تولہ سونا کھوکھرا کرک اپنی تحویل میں لے کر پہنچا چکا ہوں۔“

”دیری گڈ۔“ رحمان صاحب نے خفگی کا اظہار کرنے کے بجائے مجھے تعریفی نگاہوں سے دیکھا، پھر سب کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ ”ایک بات یاد رکھئے کہ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ کسی کو ایک روپے کا ناجائز فائدہ پہنچا کر اس کے ذریعے آپ حکومت کو ایک ہزار کا فائدہ پہنچا سکتے ہیں تو یہ سودا برا نہیں ہے۔“

”یہاں ایک بات میں بھی عرض کرنا چاہوں گا۔“ ہیڈ کوارٹر اسٹنٹ کلکٹر مسٹر نواب علی نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

”جی..... فرمائیے؟“

”کیا یہ ممکن نہیں کہ منجر کے لئے مختص رقم کو پانچ سو روپے سے بڑھا کر ایک ہزار کر دیا جائے۔ اس طرح کسی حد تک منجر بھی خوش ہو جائیں گے اور ہمارے فیلڈ آفیسرز کو ناجائز تجارت کے سلسلے میں کسی انفارمر کی مدد کرنے سے بھی تجارت مل جائے گی۔“

”پہلی بات یہ ہے، مسٹر نواب علی! کہ میں اس ضمن میں پہلے بھی اپنی تمام تر کوششیں کر چکا ہوں، لیکن سی بی آر والے سیکرٹ فنڈ میں کسی اضافے کو تیار نہیں ہیں..... دوسری بات یہ کہ ہمارے فیلڈ آفیسرز اگر کرپٹ ہیں تو وہ رقم کے اضافے کے باوجود اسمگلروں سے تعاون کر کے ناجائز رقم حاصل کرتے رہیں گے۔ میرے پاس سرکل آفیسر کے کچھ افسران کے نام موجود ہیں، جو بغیر ڈیوٹی وصول کئے مال فیکٹری سے باہر نکلا دیتے ہیں۔ میں عنقریب ان کے خلاف ڈرائسٹک (Drastic) ایکشن لینے والا ہوں۔“ رحمان صاحب کا چہرہ غصے سے تھما اٹھا حالانکہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ ”مجھے کی ان کالی بیٹروں کی وجہ سے ہم سب بدنام ہو سکتے ہیں اور میں اس کے لئے بالکل تیار نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دو کی سرورسز بھی ٹرمینیٹ کر دوں، تاکہ دوسروں کو نصیحت ہو سکے۔“

نواب علی نے رحمان صاحب کو دیکھا اور کسی بھیگی ملی کی طرح ڈم دبا کر بیٹھ گئے۔ رحمان صاحب غصے کی حالت میں سامنے رکھی ہوئی فائل کو اُلٹنے پلٹنے لگے، پھر دوبارہ ان کی نظریں میری سمت اٹھیں تو اچھی کارکردگی کے باوجود میری روح فنا ہو گئی۔

”مسٹر فیصل! آپ نے اب تک جتنے گولڈ کیس پکڑے ہیں، وہ سب کراچی سے تعلق رکھتے ہیں..... کیا آپ کا انفارمر کراچی سے باہر کے کیس آپ کو نہیں دے سکتا؟ اور خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ آپ کھوکھرا پار کے ریلوے اسٹیشن تک اس کے کام آچکے ہیں۔“

”میں نے اس سلسلے میں اس سے کبھی کوئی بات نہیں کی سر!“ میں نے مدہم آواز میں جواب دیا۔

”کیوں؟..... کوئی خاص وجہ؟“ رحمان صاحب نے دوسرا سوال داغ دیا اور اس بار مجھے اپنی پوزیشن کی وضاحت کی خاطر مجبوراً جواب دینا پڑا۔ ”مجھے صرف کراچی تک محدود رہ کر کیس کرنے کو کہا گیا ہے۔“

میرے جواب پر سراج الدین نے مجھے خشکیوں نظروں سے دیکھا لیکن رحمان صاحب کی موجودگی میں کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکے۔

”مسٹر مشرف حسین! آپ نے گزشتہ تین ماہ کے اندر حیدر آباد ڈویژن سے گولڈ کے کتنے کیس کئے ہیں؟“

”میں دو ایک پارٹیز کے پیچھے لگا ہوا ہوں، سر! اور.....“

”میں نے نمبر اور کیسز کے بارے میں پوچھا تھا۔“ رحمان صاحب کی پیشانی ٹھکن آلود ہو گئی۔

”گزشتہ سہ ماہی میں گولڈ کا کوئی کیس نہیں ہو سکا، جناب! لیکن.....“

”گویا دوسرے لفظوں میں آپ مجھے یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ حیدر آباد میں سونے کی ناجائز تجارت کا کام نہیں ہو رہا ہے؟“ رحمان صاحب نے اس بار بھی مشرف حسین کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”سر! وہ بات دراصل یہ ہے کہ.....“

”یہ سب بہانے ہیں مسٹر مشرف! آپ اس محکمے کے سینئر افسروں میں شمار کئے جاتے ہیں، لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ نے ابھی تک صرف ان ٹرکوں کو پکڑنے پر اکتفا کیا ہے، جو فیکٹریوں سے ڈیوٹی ادا کئے بغیر پاس کئے جاتے ہیں۔“ رحمان صاحب نے مشرف حسین کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”کیا ایسے کیسز پکڑنے میں آپ کو کوئی خاص چارم ہے؟“ رحمان صاحب کے آخری جملے کی چیبن کو سب ہی نے محسوس کیا تھا۔

”جج..... جی نہیں..... سر.....!“ مشرف حسین نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

”مسٹر سراج الدین!“ رحمان صاحب نے سپرنٹنڈنٹ کی طرف دیکھا۔ ”کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ایک دو مہینے کے لئے صرف گولڈ کیسز کے لئے میں حیدر آباد میں کسی دوسرے افسر کو بھی قسمت آزمائی کا موقع دوں؟“

”ایز نو دس سر!“

”مسٹر فیصل.....!“ رحمان صاحب کا روئے خن پھر میری جانب ہو گیا۔ بڑے تھکسانہ لہجے میں بولے۔ ”میں آپ کو کراچی کے ساتھ ساتھ ایک ماہ کے لئے صرف گولڈ کیس کی خاطر حیدر آباد ڈویژن میں بھی کام کرنے کا موقع دے رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے کو مایوس نہیں کریں گے۔“

”میں کوشش کروں گا جناب!“ میں نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔

اس فیصلے کو صادر کرنے کے بعد رحمان صاحب پھر بڑے خوش گوار موڈ میں افسران سے بات کرتے رہے، پھر ایک گھنٹے بعد وہ جعفری صاحب کو اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔ سب ہی نے مینٹگ کے ختم ہونے کے بعد حسب معمول سکون کا سانس لیا۔ لیکن میں ذہنی طور پر الجھا رہا، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں جعفری صاحب کے قریبی عزیز داروں میں سے تھا، دوسرے مجھے سراج الدین کا غدشہ بھی لاحق تھا۔ رحمان صاحب کی موجودگی میں انہیں ”پنڈ مارنے“ کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ انہیں حیدر آباد کے سلسلے میں رحمان صاحب کا فیصلہ پسند نہیں آیا تھا، دوسری جانب مینٹگ ختم ہونے کے بعد سے مشرف حسین بھی

ہیں؟“

”آپ نہیں جانتے اکبر بھائی! کہ اس وقت میری طلبی کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟“  
 ”میں کچھ سمجھ رہا ہوں۔“ اکبر خان نے کہا۔ ”ابھی وہ بجز ہوشرف حسین ایک گھنٹے تک سراج الدین کے کمرے میں بیٹھا کھسر پھسر کر کے گیا ہے۔“  
 ”بلاوجہ اُلجھنے کی کوشش نہ کرنا۔“ جعفری صاحب نے مجھے سمجھایا۔  
 ”یہ کیا بات ہوئی؟“ جمال الدین نے کہا۔ ”حیدر آباد کے احکامات تو رحمان صاحب نے سب کے سامنے میٹنگ میں صادر کئے ہیں۔“  
 ”اس کے باوجود سراج الدین سے دشمنی مول لینے سے کیا فائدہ؟“ جعفری صاحب بولے۔

”آپ کا بھی جواب نہیں، جعفری صاحب!“ اکبر خان نے تاش کے پتے گڈی میں ملاتے ہوئے جھل کر کہا۔ ”بجائے اس کے کہ آپ ہمارا ساتھ دے کر سراج الدین کا تختہ اُلیں، بلاوجہ ہمیں ہی چپ کراتے رہتے ہیں۔ اس طرح تو چل چکی گاڑی۔“  
 ”تم سمجھتے نہیں..... اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو بلاوجہ سراج الدین کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ میں فیصل کو عزیز داری کی وجہ سے سپورٹ کرتا ہوں۔“ جعفری صاحب نے اکبر خان کو سمجھانے کی کوشش کی تو جمال الدین نے حسب عادت دیدے پھیلاتے ہوئے بڑے دنگ لہجے میں براہ راست مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”ایسی کی نیسی کدو خان کی۔ (یہ نام اکبر خان نے سراج الدین کے پوتے قد ہونے کی مناسبت سے رکھا تھا) تم اگر ایک بار دب گئے تو وہ گھارے بیٹنگ کھانے والا نہیں ہمیشہ دبا رہے گا..... مردوں کی طرح سینہ تان کر بات کرنا، میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔“

میں عجیب محضے کا شکار تھا، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ ایک طرف جعفری صاحب کی عزیز داری میرے آڑے آ رہی تھی اور دوسری طرف سے میں اس بات سے بھی واقف تھا کہ اگر میں نے ایک بار سراج الدین سے ڈر کر بات کی تو پھر وہ ہمیشہ چڑھی گانگھتا رہے گا۔ بہر حال میں اس کی طلبی کے حکم کو ماننے پر مجبور بھی تھا، اس لئے ”جل ٹو جلال ٹو، آئی بلا کوٹال ٹو“ کا ورد کرتا ہوا سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں داخل ہوا تو خلاف توقع سراج الدین نے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا، پھر دوبارہ اپنی ریو لوٹنگ چیئر پر بیٹھتے ہوئے بڑے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

”آپ کیا پینا پسند کریں گے؟ چائے یا کچھ کولڈ ڈرنک وغیرہ؟“  
 ”شکریہ سیر!“ میں نے حد ادب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی ابھی چائے پی چکا ہوں۔“

کچھ اُکھڑا اُکھڑا نظر آ رہا تھا۔ پھر میٹنگ ختم ہونے کے بعد اکبر خان نے جو اپنے دور میں پاکستان کی جانب سے ہاکی کے میدان میں اپنے ملک کی کامیاب نمائندگی کر چکا تھا (اس بنیاد پر اسے ملازمت بھی آسانی سے مل گئی تھی۔ ورنہ بندہ سخت عیاش اور آرام طلب واقع ہوا تھا۔ اس کی مثال اس بوڑھے شیر کے مانند تھی جو اپنے کچھار میں بیٹھا بیٹھا شکار کرنے کا عادی ہو جاتا ہے) میٹنگ کے بعد مشرف حسین کو مخاطب کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”مشرف صاحب! آج تو آپ میٹنگ کے دولہا بن گئے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک مہینے کے لئے لکشمی دیوی آپ کے ہاتھ سے چھو منتر ہو گئیں۔“  
 ”مسٹر اکبر!..... میں اس قسم کا مذاق پسند کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“ مشرف حسین نے منہ بنا کر جواب دیا۔

”چچی بات ہمیشہ کڑی ہوتی ہے، میری جان!“ اکبر خان جو ایک منہ پھٹ افسر تھا اور سپرنٹنڈنٹ تک کو بھی نہیں گردانتا تھا، ایک دم ہتھے سے اُکھڑ گیا۔ ”میری بات اگر آپ کو ناگوار گزری ہے تو گھر جا کر دروڑی زیادہ کھا لینا..... اور ایک بات اور سن لیں، میں سینئر جونیئر کے فرق کو ٹھیکے پر مارتا ہوں۔“

مشرف حسین خون کا گھونٹ پی کر خاموش ہو گیا، اسی میں اس کی بہتری بھی تھی، اس لئے وہ بہ خوبی واقف تھا کہ اگر اس نے اکبر خان سے اُلجھنے کی کوشش کی تو اسے سخت جملوں کے ساتھ دو چار موٹی موٹی گالیاں بھی سننی پڑ جائیں گی۔ اکبر خان کچھ ایسی ہی شخصیت کا مالک تھا، میٹنگ کے دن کے علاوہ عام طور پر وہ نشے میں ہوتا تھا، اس لئے کسی کی عزت کی دجیاں بکھیرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتا تھا۔ جس سے خفا ہو جاتا تھا، اسے برملا انگش اور پنجابی کی ایسی ملی جلی گالیوں سے نواز دیتا تھا، جو خاص طور پر اس کی خود ساختہ تھیں۔

مجھے حالات کے بدلنے رُخ کا اندازہ ہو رہا تھا اور یقین تھا کہ سراج الدین کسی نہ کسی طرح مجھے کم از کم گولڈ کیمر کے بارے میں حیدر آباد سے دور ہی رکھنے کی کوشش کرے گا۔ اس لئے کہ اس طرح اس کی اپنی آمدنی بھی متاثر ہوتی اور مشرف حسین بھی محاورے ننگا ہو جاتا۔ مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ سپرنٹنڈنٹ اور جعفری صاحب کے درمیان ہمیشہ میری وجہ سے رسد کشی ہوتی رہتی تھی۔

دو روز سکون کے رہ گئے، لیکن تیسرے روز شام کو تقریباً پانچ بجے ہم ری کرٹیشن روم میں بیٹھے برج کے کھیل سے لطف اندوز ہو رہے تھے، ایک سپاہی نے مجھ سے کہا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھے یاد کیا ہے۔ میں جو اس وقت بڑے خوش گوار موڈ میں تھا، سراج الدین کی طرف سے اپنی طلبی پر یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔

”کیا بات ہے؟“ اکبر خان نے پوچھا۔ ”تمہاری شکل پر اچانک یہ بارہ کیوں نچ رہے

غرض سے الاٹ کئے جاتے ہیں، تاکہ ان کی شخصیت اور ان کے نام کا علم کسی اور افسر کو نہ ہو سکے۔“

”گویا آپ اے دن کو مجھ سے نہیں ملوانا چاہتے؟“  
”آئی ایم سوری، سر!“ میں نے معذرت کی۔

”آپ کا کیا خیال ہے کہ حیدر آباد میں بھی گولڈ کے اچھے کلیئر پکڑے جاسکتے ہیں؟“  
سراج الدین نے دوسرا رخ اختیار کیا۔

”انسان کو کوشش کرے تو کوئی بات بھی ناممکن نہیں ہوتی۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”کیا رحمان صاحب کی میٹنگ کے بعد آپ کی ملاقات اپنے تجربے سے ہوئی ہے؟“  
”جی نہیں..... آج کل وہ کسی کام سے کراچی سے باہر گیا ہوا ہے۔“ میں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا۔

”ا۔ گولڈ.....؟“ اس بار چیتے ہوئے لہجے میں پوچھا گیا۔  
”ہو سکتا ہے۔“ میں نے شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔  
”مسٹر فیصل! فرض کر لیجئے کہ کوئی دوسری ایجنسی یا اپنے ہی محکمے کا کوئی سینئر افسر آپ کے انفارمر کو ریڈ ہینڈڈ پکڑ لے تو آپ کا رد عمل کیا ہوگا؟“

”میں رحمان صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اسے بچانے کی کوشش کریں۔“  
”کیا آپ کو یقین ہے کہ رحمان صاحب جیسا با اصول آفیسر کسی مجرم کے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے اور قانونی دستاویز مکمل ہو جانے کے باوجود بغیر کسی سزا کے چھوڑ دے گا؟“  
”مجھے پہلے کبھی اس کا تجربہ نہیں ہوا، سر! مگر مجھے یقین ہے، کلکٹر صاحب میری درخواست کو کم از کم کنسیڈر ضرور کریں گے۔“

”اس طرح تو آپ کسی بھی بڑے مجرم کو اپنا انفارمر ظاہر کر کے رحمان صاحب سے رعایت حاصل کر سکتے ہیں؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش بیٹھا رہا۔  
”اُردو سے کچھ دلچسپی ہے آپ کو؟ سنا ہے، کچھ لکھنے لکھانے کا شوق بھی رکھتے ہیں؟“  
”جی ہاں۔“

”پھر تو آپ اس محاورے کا مطلب بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ دریا میں رہ کر مگر چھ سے پیر مول لینا مناسب نہیں ہوتا۔“

”میں سمجھا نہیں، سر!“ میں نے انجان بننے ہوئے کہا حالانکہ میں اس کے جملے کا مفہوم بڑی اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ وہ گویا ڈھکے چھپے لفظوں میں مجھے اس بات کی دھمکی دینے کی

”اور سنائیے..... کیا کر رہے ہیں آپ لوگ؟“  
”فی الحال تو ہم برج کھیل رہے تھے۔“ میں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔  
”کیا جعفری صاحب بھی شامل ہیں؟“ سراج الدین کے لہجے میں ہلکا سا طنز بھی شامل تھا۔

”جی ہاں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”دراصل ہمیں کسی انفارمر کی فون کال کا انتظار ہے۔“

”میں نے آپ کو اس وقت ایک مقصد کے لئے بلایا ہے۔“ سراج الدین نے تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا۔  
”میرے لائق کوئی خدمت؟“

”میں آپ کے تجربے یعنی اے دن سے ملنا چاہتا ہوں۔“ وہ اپنی بات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ”دراصل مجھے گولڈ کی بیرون ملک بڑے پیمانے پر اسگنگ کی اطلاع ملی ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس سلسلے میں آپ کے تجربے سے ڈسکس کروں۔ آپ کے کہنے کے بموجب چونکہ وہ خود بھی اس ناجائز تجارت میں ملوث ہے، اس لئے مجھے یقین ہے کہ وہ بہتر طور پر رہنمائی کر سکے گا۔“

”میں سمجھ گیا کہ میرے تجربے سے ملاقات کرنے کی خاطر سپرنٹنڈنٹ نے ایک شاطرانہ چال چلی تھی۔ ویسے بھی ہر آفیسر تجربے کے سلسلے میں ایک دوسرے کے کھوج میں لگے رہتے ہیں، کامیاب تجربوں کو زیادہ لالچ دے کر اور سبز باغ دکھا کر اسے متعلقہ افسر سے توڑنے کی خاطر جوڑ توڑ کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے، میں بلا کسی جھجک کے اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میری ساکھ صرف اے دن کی تجربی کی وجہ سے برقرار تھی اور اس کے ہاتھ سے نکل جانے کی صورت میں عضوِ معطل بن کر رہ جاتا۔“

”آپ نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا؟“ سپرنٹنڈنٹ نے میری خاموشی بطور خاص نوٹ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟“

”بات اعتماد کی نہیں ہے سر! بلکہ رحمان صاحب کے حکم کی ہے۔“ میں نے گربہ کشتن روزِ اوّل کے پیش نظر کہا۔

”میں سمجھا نہیں؟“

”ان کا کہنا ہے کہ کامیاب انٹیلی جنس افسر وہی ہوتا ہے، جو رتے مرجائے لیکن تجربے کا نام کسی قیمت پر ظاہر نہ کرے۔“ میں نے محتاط انداز اختیار کیا۔ ”رحمان صاحب نے متعدد موقعوں پر میرے تجربوں کی خدمات کو بے حد سراہا ہے۔ لیکن آج تک انہوں نے بھی کبھی میرے انفارمر سے ملنے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے علاوہ تجربوں کو کوڈ نمبر بھی اسی

کوشش کر رہا تھا کہ اگر میں نے اس کے اور مشرف حسین کے نجی معاملے میں ٹانگ پھنسانے کی کوشش کی تو مجھے نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔

”کیا آپ پورے اعتماد کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں، مسٹر فیصل! کہ آپ صرف حکومت کی جانب سے ملنے والی تنخواہ پر گزارا کرتے ہیں؟“

”فی الحال تو یہی صورت حال ہے۔ مگر کل کے بارے میں، میں آج کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ کل وہ حالات نہ ہوں جو آج ہیں۔ اور مجھے بھی دوسروں کی طرح مالی غنیمت کے سہارے زندگی گزارنی پڑ جائے۔“

”میں آپ کو یہی ایک نکتے کی بات سمجھانا چاہتا ہوں۔ ابھی آپ نو جوان ہیں، نئے نئے ملازمت میں آئے ہیں، اس لئے آپ لوگوں کا خون بھی جلدی جوش مارنے لگتا ہے..... لیکن دور اندیشی یہی ہے کہ انسان کل کے لئے آج ہی سے کچھ پس انداز کرنا شروع کر دے۔ برا وقت اور برے حالات کبھی کہہ کر نہیں آتے، وقت کسی لمحے بھی کروٹ بدل سکتا ہے۔“ سراج الدین نے اپنے مقصد کی جانب آہستہ آہستہ آتے ہوئے کہا۔ ”ابھی آپ کی شادی نہیں ہوئی، اس لئے آپ کو نمک، تیل اور لکڑی کا بھاؤ نہیں معلوم۔“

پھر وہ بڑی رازداری سے بولے۔

”یہ بہتی لگتا ہے، یہاں سب ہی اپنا چلو بھر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ جو آج وقت سے فائدہ نہیں اٹھاتے، وہ کل محرومیوں کا شکار ہو کر پھٹتے ہیں۔“

”آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں سر؟“ میں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”صرف اتنا کہ آپ وقت اور حالات کے گراف کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ حیدر آباد میں سونے کا کوئی کیس پکڑنے سے گریز کریں، میں مشرف حسین کو کہہ دوں گا کہ وہ آپ کا بھی ہر ماہ خیال رکھے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کو ہمارے ساتھ مل کر چلنے میں بہت سارے فائدے ہو سکتے ہیں۔“

”مخلّا؟“

”مخلّا یہ کہ کراچی میں سونے کے کیسز کرنے کے ساتھ فیکٹریوں پر نظر رکھیں، جہاں سے انسپکٹر کی ملی بھگت سے مل اور ہزاروں اور لاکھوں روپے ڈیوٹی کی مد میں کھا جاتے ہیں۔“ اُس نے مجھے گرسکھاتے ہوئے کہا۔ ”کوئی ایک ٹرک ہاتھ آجائے تو میل اور متعلقہ انسپکٹر دونوں ہی اپنی گلو خلاصی کی خاطر منہ ماگی رقم دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مہینے میں اگر آپ نے دو ٹرک بھی پکڑ لئے تو بیس پچیس ہزار کہیں نہیں گئے۔ انٹیلی جنس افسر ہونے کی وجہ سے آپ کو آج جو اختیارات حاصل ہیں، ممکن ہے تادلے کے بعد کل باقی نہ رہیں۔“

میرے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا، میں نے سپرنٹنڈنٹ کو گھورتے ہوئے کہا۔

”آپ کی باتیں میری سمجھ میں آرہی ہیں سر! لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ میں رحمان صاحب کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتا۔“

”آپ کی مرضی۔“ اس نے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔ ”آپ اگر رحمان صاحب کو خوش کرنے کی خاطر اپنی جان جو کھم میں ڈالنے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو میں آپ کو روکوں گا بھی نہیں۔“

سپرنٹنڈنٹ سراج الدین کی دوسری دھمکی پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک تھی، میں اٹھ کر جانے لگا تو اس نے مجھے روک کر کہا۔

”میرے کمرے سے باہر جانے سے پہلے اچھی طرح اس بات کو ذہن نشین کر لیں کہ اس وقت ہمارے مابین جو باتیں ہوئی ہیں، اس کی بھٹک بھی کسی اور کو نہیں ملنی چاہئے، ورنہ حالات کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔“

میں نے خاموشی سے سرکواثبات میں حرکت دی، پھر باہر نکل آیا۔ اس روز مجھے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ وہ پستہ قد اور خنی جسم کا مالک بظاہر اوپر سے جتنا بھولا بھالا اور معصوم نظر آتا تھا، اندر سے اتنا ہی کریہہ، بھیانک اور زہریلا واقع ہوا ہے۔ میں اس کے دفتر سے نکل کر واپس ری کرٹیشن روم میں گیا تو ہر شخص کرید کرید کر مجھ سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے اوپر سپرنٹنڈنٹ کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ لیکن میں نے اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھی اور ایک خوب صورت سا بہانہ تراش کر بات بتا گیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اگر میں نے اپنے ساتھیوں سے ان باتوں کا ذکر کیا تو اڑتے اڑتے یہ خبر سراج الدین تک بھی پہنچ سکتی تھی، جس کے بعد اس کی دوہری شخصیت میرے لئے اور زیادہ خطرناک ہو سکتی تھی۔

بہر حال، میں نے سپرنٹنڈنٹ کی باتوں میں جو چیلنج محسوس کیا تھا، اسے بڑی بے جگری سے قبول کر لیا۔ دوسرے ہی دن میں نے فون کر کے اپنے مخبر کو گھر بلا لیا۔ اس سے حیدر آباد میں سونے کا کیس کرانے کی بات کی تو ایک لمحے تک وہ کچھ سوچتا رہا، پھر بڑی سنجیدگی سے بولا۔

”میں صرافہ بازار کی جس پارٹی کے لئے کام کرتا ہوں، اس کا سونا ہفتے میں کم از کم ایک بار کھوکھرا پار کے ذریعے ہندوستان ضرور جاتا ہے۔ حیدر آباد تک اس مال کی ذمہ داری مشرف حسین کے سر ہے۔ اس کے آگے سیٹھ نے دوسرے افسروں سے سائنٹ گانٹھ رکھی ہے، جنہیں ہر ماہ طے شدہ رقم بڑی پابندی سے ادا کی جاتی ہے، اس کے علاوہ سراج الدین صاحب سے بھی سیٹھ کا بڑا گہرا بارانہ تھا لیکن ان کے درمیان دو بدو ملاقات بہت کم ہوتی ہے۔ ویسے ٹیلی فون پر ہفتے میں دو بار راز و نیاز کی باتیں ضرور ہوتی ہیں۔ کیس تو میں آپ کو دس بارہ روز کے اندر اندر پکڑوا سکتا ہوں، لیکن.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”لیکن کیا؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔  
 ”آپ کو حیدر آباد میں کیس پکڑانے کے عوض میری دو شرطیں قبول کرنی پڑیں گی۔“  
 ”وہ کیا؟“

”ایک تو یہ کہ اس کیس میں آپ صرف ایک قابل اعتماد سپاہی کے ساتھ حصہ لیں گے، تاکہ سیٹھ کو میرے اوپر کوئی شک نہ ہو۔ اور دوسری شرط یہ ہے کہ آپ جتنا سونا پکڑیں گے، اس کا بیس فیصد مجھے بطور انعام فوری طور پر مل جانا چاہئے۔“

میں نے بادل نا خواستہ اس کی دونوں شرطیں قبول کر لیں۔ (ویسے عام حالات میں خاص طور پر سونے کے کمیز میں دس فیصد مال مجبور کو دیا جاتا تھا) تمام معاملات طے ہو جانے کے بعد میں نے ایک ہفتے کی رخصت حاصل کر لی، تاکہ سپرنٹنڈنٹ کو اپنے ”خاص الخاص چچوں“ کے ذریعے میری نقل و حرکت کی نگرانی کرانے کا موقع نہ مل سکے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے متعلقہ ٹیلی فون ایجنٹ کے ایک آپریٹر کی مٹھی گرم کر کے اسے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ ایک ہفتے تک سربراہ الدین کے گھر اور دفتر کے نمبروں پر آنے والی تمام کالوں کی ریکارڈنگ کرتا رہے۔ میں نے یہ حرکت محض اس لئے کی تھی کہ اگر بیس فیصد والی بات کلکٹر صاحب تک پہنچے تو میں اس کا معقول جواز پیش کر سکوں اور انہیں بتا سکوں کہ اب تک جو کچھ ہو رہا تھا، وہ سراج الدین اور اسمگلر کے درمیان ساز باز سے ہو رہا تھا۔

دفتر سے چھٹی لینے کے تین دن بعد ہی ایک رات تقریباً ساڑھے بارہ بجے اے، دن میرے گھر آ گیا۔ اس وقت وہ خاصا ہڈ جوش نظر آ رہا تھا۔ میں اسے اندر بیٹھک میں لے آیا، جہاں پہنچے ہی اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

”فیصل صاحب! آپ جلدی سے تیار ہو جائیں، آپ کو صبح ہی صبح حیدر آباد جانے والی پہلی بس پکڑنی ہوگی۔“

”خبریت.....؟“ میں نے ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے بڑی رازداری سے دریافت کیا۔

”صبح گیارہ بجے والی بس سے ستار نامی ایک ڈبلا پتلا اور دراز قد یمین لڑکا سیٹھ کا مال لے کر حیدر آباد جا رہا ہے۔“ مجھ نے کہا۔ ”ستار مٹھلی ہوئی رنگت اور تھکھکھریالے بالوں والا نوجوان ہوگا، اس کی ایک نشانی اور بھی ہے۔ ٹھوڑی پردہانی جانب ایک گہرے زخم کا نشان موجود ہے، جو آپ کی رہنمائی کے لئے بہت کافی ہوگا۔“

”مال کتنا ہوگا؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”پورے ہزار تو لے۔“ (یعنی دس دس تو لے کی سواد چاکلیٹ نما نکلیاں، جن پر 999 تا 555 کے علاوہ اس بیرونی کمپنی کی باقاعدہ سیل بھی کندہ ہوتی تھیں، جسے سونے کے اصلی ہونے

کی ضمانت سمجھا جاتا ہے)۔ مجھ نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مگر آپ کو ستار کے قبضے سے صرف آٹھ سو تولہ ملے گا۔“

”کیا مطلب.....؟“

”میں نے دو سو تولہ طے شدہ کمیشن کے طور پر پہلے ہی نکال لیا ہے، تاکہ آپ کو میٹروں کی موجودگی میں اصلی اور نقلی کاغذات کے دو سیٹ نہ تیار کرنے پڑیں۔“

”آئی سی۔ گویا ستار بھی اس معاملے میں تمہارا شریک کار ہوگا؟“

”قطعاً نہیں۔“ مجھ نے جواب دیا۔ ”سیٹھ نے وہ مال چونکہ مجھ سے پیک کر لیا ہے، اس لئے ستار کے فرشتوں کو بھی اس کے اصل وزن کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہوگی۔ عام طور سے سیٹھ کا اصول یہی ہے کہ مال کوئی دوسرا پیک کرے اور کیریئر کوئی دوسرا ہو، تاکہ سازش کے امکان کم سے کم ہوں۔“

”میں تمہاری بات کا مقصد سمجھ رہا ہوں۔ لیکن کیا سیٹھ کو تمہارے اوپر شبہ نہیں ہوگا؟“

”جی نہیں۔“ اے دن نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”سیٹھ کو مجھ پر سب سے زیادہ بھروسہ ہے۔ میں کئی برسوں سے اس کے لئے یہی خدمت انجام دیتا رہا ہوں۔ خود بھی کئی بار کیریئر کا کام کر چکا ہوں۔ لیکن کبھی ایک تولے کی بھی ہیر پھیر نہیں ہوئی۔ مال پکڑے جانے کی صورت میں سیٹھ صرف دو ہی باتوں پر غور کرے گا۔ یا تو مال پکڑنے والی ایجنسی نے خوردبرد سے کام لیا ہے، یا پھر خود کیریئر نے درمیان میں کوئی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت بے ایمانی کا ثبوت دیا ہوگا۔ سیٹھ کو ستار پر پہلے بھی کئی موقعوں پر شبہ ہو چکا ہے۔ کیس پکڑے جانے کے بعد سیٹھ کے ذہن میں ایک خیال یہ بھی سر اٹھا سکتا ہے کہ ستار نے خود مجھ کی کر کے مال پکڑوا دیا ہے اور دو سو تولہ بطور کمیشن ہڑپ کر گیا۔“

”لیکن ستار کو بہر حال سزا یا جرمانہ بھگتنا پڑے گا۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اس طرح تمہاری اور ستار کی دشمنی بھی جنم لے سکتی ہے۔“

”آپ اس بات کی فکر نہ کریں..... اوّل تو ستار کی اتنی جرأت نہیں ہے کہ وہ مجھ سے ٹکرانے کا خواب بھی دیکھ سکے، دوسرے یہ کہ وہ ابھی آٹھ دس مہینے سے ہمارے ساتھ شامل ہوا ہے۔ نیا نیا چھو کر ہے، پہلے ذاتی طور پر پچاس یا سو تولے سونے کو ادھر سے ادھر کرنے کا کام کرتا تھا، ایک موقع پر پکڑا گیا لیکن قانون کی نگاہوں سے اس لئے بچ گیا کہ جس شخص نے کیس پکڑا تھا، وہ سارا مال خود پی گیا۔ اس لئے کاغذات بننے کی نوبت ہی پیش نہیں آئی۔ اس واقعہ کے بعد سے ہی وہ سیٹھ کی فیم میں شامل ہو گیا ہے۔“

”مجھے ستار سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آٹھ سو تولے سونے کا کیس ہی میرے لئے بہت کافی ہوگا۔ البتہ ایک بات میرے دل کے نرم گوشے میں ضرور کلک رہی ہے۔“

”کیا.....؟“

”ستار کو اگر لمبی سزا بھگتنی پڑی تو اس کے گھر والوں کا کیا ہوگا؟“

”آپ کو شاید اس بات کا علم نہیں ہے کہ کیربیر کے پڑے جانے کی صورت میں جب تک اسے رہائی نہیں مل جاتی، ایک معقول رقم سیٹھ کی طرف سے اس کے لواحقین کو ہر ماہ بڑی پابندی سے ملتی رہتی ہے۔“ منجر نے کہا۔ ”یونہی کوئی بلا کسی لالچ کے تو خطرناک کاموں میں حصہ نہیں لیتا۔ اس کو سیٹھ کی طرف سے بہت ساری سہولتیں بھی ہوتی ہیں۔ کیس کے دوران عدالتی پیشیوں کو بھگتانے سے لے کر وکیل وغیرہ کی فیس تک بھی سیٹھ کی ذمہ داری میں شامل ہوتی ہے۔“

صبح تقریباً دو بجے تک میں منجر کے ساتھ سر جوڑے بیٹھا تمام پروگرام طے کرتا رہا، پھر اس کے جانے کے بعد میں نے تیاری کی اور ایک سفری بیگ، جس میں خاص طور پر قانونی دستاویزات اور سادہ کاغذات و کاربن وغیرہ کے علاوہ اکثر سروس ریوالور بھی موجود ہوتا تھا، لے کر بس اسٹینڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھر سے روانگی سے قبل میں نے دفتر فون کر کے ٹائٹ ڈیوٹی کلرک سے طور خان کو طلب کیا اور اسے انتہائی رازداری سے سادہ لباس میں چار بجے سے پہلے بس اسٹینڈ پر پہنچنے کی تاکید کر دی۔ جواب میں وہ صرف ”لیس سر، لیس سر“ کرتا رہا۔ طور خان نہ صرف یہ کہ ایک دلیر اور نڈر سپاہی تھا، بلکہ نہایت قابل اعتماد بھی تھا۔ وہ قریب قریب سارے ہی انٹیلی جنس افسروں کے ساتھ کارہائے نمایاں انجام دے چکا تھا۔ لیکن اس نے کبھی ایک افسر کے کیس کی تفصیل دوسرے سے بیان نہیں کی تھی، بڑی خوب صورتی سے یہ کہہ کر ٹال جالاتا تھا۔ ”میں تو ایک سپاہی ہوں جناب! آپ لوگوں کا تالعدادار۔ جو حکم ملتا ہے، بس اسی پر عمل کرتا ہوں، اس کے سوا کسی اور بات سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔“

میں شلوار اور میض پہنے بس کے اڈے پہنچا تو طور خان وہاں پہلے سے موجود تھا۔ بس جانے کو تیار تھی، اس لئے ہم دونوں خاموشی سے اس پر سوار ہو گئے۔ راستے میں بھی ہمارے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ ہم دونوں اجنبی مسافروں کی طرح الگ الگ نشستوں پر بیٹھے تھے، اس زمانے میں چونکہ سپر ہائی وے وجود میں نہیں آیا تھا، اس لئے اندرون سندھ جانے کے لئے نیشنل ہائی وے سے گزرتا پڑتا تھا اور بس تقریباً چار گھنٹوں میں حیدر آباد پہنچی تھی۔

اس وقت صبح کا ہی کوئی نو ساڑھے نو کا عمل رہا ہوگا، جب ہم ایک تھکا دینے والے سفر کے بعد تلک چاوڑی کے اس بس اسٹاپ پر اترے، جہاں داسنے ہاتھ پر ایک ہوٹل واقع تھا۔ پھر ہوٹل کے برابر ایک پریس بھی تھا۔ پہلے ہم نے ہوٹل میں بیٹھ کر الگ الگ چائے پی، پھر بس اسٹاپ سے ایک فرلانگ دور اس ہوٹل میں جا کر ڈبل بیڈ کمرہ حاصل کیا، جس کا مشورہ منجر

نے دیا تھا۔ اس ہوٹل سے ملی ہوئی ایک مسجد بھی تھی۔ ہم نے ہوٹل میں اپنے فرضی اندراجات مکمل کئے، پھر اس کمرے میں آگئے، جو پہلی منزل پر تھا۔

کمرے میں پہنچنے کے بعد میں نے طور خان کو تفصیل سے آنے والے حالات کے بارے میں بتایا، پھر ہوٹل ہی سے ناشتہ منگوا کر پیٹ میں ایندھن کو بھرا اور کچھ آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گیا۔ طور خان کمرے میں موجود کرسی پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا، جسے اس نے راستے میں خریدا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ دوپہر گیارہ بجے چلنے والی بس تلک چاوڑی کے اڈے پر ڈھائی تین بجے کے لگ بھگ پہنچے گی۔ لیکن میں نے طور خان کو ساتھ لیا اور ٹھیک ڈیڑھ بجے مطلوبہ بس اسٹاپ پر پہنچ کر ہوٹل کی ایک ایسی میز پر قبضہ جمالیا، جہاں سے کراچی سے آنے والی بسوں اور ان سے اترنے والے مسافروں پر بہ آسانی نظر رکھی جاسکتی تھی۔ میں چونکہ پورے آپریشن کے بارے میں پہلے ہی طور خان کو ضروری ہدایتیں دے چکا تھا، اس لئے ہم راستے ہی سے الگ تھلگ ہو گئے تھے۔ میں ہوٹل میں بیٹھا زبردستی چائے پی رہا تھا اور طور خان سڑک کی دوسری سمت والے فٹ پاتھ پر کھڑا بار بار اس طرح اپنی دکتی گھڑی دیکھ رہا تھا، جیسے کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ ان دنوں چونکہ سردی کا موسم تھا، اس لئے طور خان نے سر پر عجیب و غریب قطع کا کنٹوپ پہن رکھا تھا اور جسم پر چار خانوں والی پرنٹ کی ایک دبیز چادری لپیٹ رکھی تھی، میں نے صرف آدھی آستین کے سویٹر پر اکتفا کی تھی، میں چونکہ شلوار میض میں تھا، اس لئے میں نے ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے کے محاورے کے تحت اپنا اعشاریہ تین آٹھ کا سروس ریوالور سفری بیگ میں رکھنے کے بجائے شلوار کے اندر اس طرح اڑس رکھا تھا کہ ضرورت پڑنے پر اسے فوری طور پر نکالا جاسکے۔

تقریباً سوادو بجے کراچی سے آنے والی ایک بس ہوٹل کے سامنے پہنچ کر اڈے پر رُکی تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں ایک ایک مسافر کو بخور دیکھ رہا تھا۔ آدھی بس کے مسافر اتر چکے تو میرا شکار میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ منجر نے ستار کا جو حلیہ بتایا تھا، وہ اس پر سو فیصد پورا اترتا تھا۔ اس کے بال بھی گھنگھریالے تھے اور ٹھوڑی پر داہنی جانب ایک گہرے زخم کا نشان بھی موجود تھا، سوائے ایک بڑے ریڈیو شیپ ریکارڈر کے، اس کے پاس سامان نام کی کوئی اور چیز نہیں تھی۔ منجر نے اگے مجھے پہلے سے حالات سے باخبر نہ کیا ہوتا تو شاید جب بھی میری نگاہیں اندازہ لگالیتییں کہ وہ ریڈیو شیپ ریکارڈر خاصا وزنی دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے فوری طور پر اٹھ کر چائے کا بل ادا کیا اور باہر فٹ پاتھ پر آ گیا۔ طور خان نے سڑک کی دوسری جانب فٹ پاتھ پر چلنا شروع کر دیا۔ میری نظریں ستار پر جمی ہوئی تھیں۔ میں پوری طرح حالات سے نشنہ کے لئے تیار تھا۔ اے دن نے مجھے بڑے یقین سے بتایا تھا کہ ستار بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرے گا، جس میں اس نے مجھے قیام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس

کے باوجود میں اسے نگاہوں سے ادھل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ عین ممکن تھا کہ کراچی سے ستار کی روانگی کے وقت کوئی تبدیلی عمل میں آگئی ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پروگرام کے عین مطابق ستار نے بھی اسی ہوٹل کی تیسری منزل پر کمرہ کرایا، جس میں، میں پہلے سے ٹھہرا تھا۔ منجر کے بیان کے مطابق ستار کو اس ہوٹل میں صرف چوبیس گھنٹے قیام کرنا تھا۔ دوسری صبح اسے وہ مال (جو کہ ٹیپ ریکارڈر کے تمام اندرونی کھل پُر زوں کو نکال کر جست کے ایک ڈبے میں پیک کر کے سیل کیا گیا تھا) ایک ایسے آدمی کے حوالے کرنا تھا، جس کے پاس دس روپے کے اس پٹے ہوئے نوٹ کا آدھا حصہ موجود ہوگا، جس کا آدھا حصہ ستار کے پاس موجود تھا۔

میں نے طور خان کو اشارہ کیا تو وہ ستار کے پیچھے پیچھے تیسری منزل تک چلا گیا اور میں اپنے کمرے میں جا کر بڑی بے چینی کے ساتھ اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن شاید قسمت کی دیوی ہمیشہ کی طرح اس روز بھی مجھ پر مہربان تھی، اس لئے کہ مجھے طور خان کی واپسی کا دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تقریباً پینتالیس منٹ بعد ہی وہ ستار کو لئے کمرے میں داخل ہوا۔ میرا مطلوبہ ریڈیو ٹیپ ریکارڈ اس وقت بھی ستار کے ہاتھ میں موجود تھا۔

ستار کی کھلتی رنگت اس وقت زرد ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے جھانکنے والے خوف ہی سے میں سمجھ گیا کہ طور خان نے اسے میرے کمرے تک لانے میں کوئی بہت اچھا سلوک نہیں کیا ہوگا۔ میرے منجر کے بیان کے مطابق ستار ابھی تک ”کیریر“ کے فرائض انجام دینے کے معاملے میں کچا ہی تھا، ورنہ اس قسم کے لوگ اس وقت تک آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دنگ لہجے میں گفتگو کرتے ہیں، جب تک مال برآمد نہ ہو جائے، پھر مال برآمد ہوجانے کی صورت میں وہ متعلقہ افسر کو خریدنے کی کوشش کرتے ہیں، جس کی اجازت انہیں اصل مالک کی جانب سے ہوتی ہے۔ افسر ہک گیا تو ٹھیک، ورنہ وہ بڑی بے جگری سے گرفتاری پیش کر دیتے ہیں۔ لیکن عدالت میں جانے کے بعد وہ اس افسر کے خلاف طرح طرح کے جھوٹے الزام لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ایسے افراد کو ہماری زبان میں ”پروفیشنل کیریر“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

بہر حال، ستار کے بدلتے چہرے کی رنگت بتا رہی تھی کہ وہ اس وقت بری طرح نروس تھا، اس کے برعکس طور خان جو ستار کو ریوالور کی زد پر (جس کا علم مجھے بعد میں ہوا) میرے کمرے تک لایا تھا، کچھ زیادہ ہی تفریح کے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ شاید وہ اپنی کارکردگی اور فرض کی کامیاب ادائیگی پر خوش تھا۔

”صاحب جی! یہ بندہ میرا یار ہے اور یہ جو ٹیپ ریکارڈر اس کے ہاتھ میں ہے، یہ غریب اسے فروخت کرنا چاہتا ہے۔“ طور خان نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہم لوگ تو

کسی ہوٹل میں بیٹھ کر ریکارڈنگ سے دل پشادری کر لیتے ہیں۔ اس لئے میں اسے آپ کے پاس لے آیا ہوں۔“

”کیا قیمت لگائی ہے اس نے؟“ میں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”آدمی بڑا کھرا ہے، صاحب!“ طور خان، ستار کو دکھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ”کہتا ہے، آپ مشینری چیک کر لیں، قیمت بعد میں طے ہوتی رہے گی۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے براہ راست ستار سے پوچھا۔

”ستار میمن۔“

”کرتے کیا ہو؟“

جواب میں ستار تو خاموش رہا، لیکن طور خان پھر بڑے موڈ میں آ کر بولا۔

”صاحب جی! اپنے پار ستار میمن کا شجرہ تو ڈوڈے ڈوڈے نوابوں سے ملتا ہے۔ لیکن تقدیر

بے چارے کو فٹ پاتھ تک تھسٹ لائی ہے۔“

”ٹھیک ہے، طور خان!“ میں نے کوڈ درڈز میں کہا۔ ”تم نیچے جا کر کسی معتبر ملکینک کو لے آؤ، میں مشینری اس کی موجودگی میں چیک کروں گا۔“

طور خان میرا مطلب سمجھ کر کمرے سے چلا گیا۔ پھر قریبی مسجد کے مؤذن اور ہوٹل کے منیجر کو لے آیا۔ میں نے قانون کے مطابق ان دونوں مشیروں کی موجودگی میں ریڈیو ٹیپ ریکارڈ توڑ کر اس کے اندر سے جست کا ڈبا نکالا، پھر اسے جب طور خان نے توڑا تو اس میں منجر کی اطلاع کے مطابق دس دس تولے کے اسٹی ”چاکلیٹ“ برآمد ہو گئے۔ (دس تولے کی ان ٹکیوں کو جن پر غیر ملکی ٹھپا ہوتا ہے، اسے ہماری زبان میں چاکلیٹ کہا جاتا تھا)

ستار خاموش کھڑا تمام کارروائی دیکھتا رہا۔ میں نے مشیر نامہ تیار کر کے اس پر مشیروں اور گواہوں کے دستخط لئے، پھر رپورٹ تیار کی اور ستار کو سونے سمیت لے کر اسی وقت ایک ٹیکسی کے ذریعے کراچی کے لئے واپس چل پڑا۔ میں چاہتا تو حیدر آباد کے سپرنٹنڈنٹ سے گاڑی کا بندوبست کرنے کی درخواست بھی کر سکتا تھا، لیکن میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ اس لئے کہ میں پکڑے جانے والے کیس کو سراج الدین سے اس وقت تک چھپانا چاہتا تھا، جب تک اس کی اطلاع براہ راست رحمان صاحب کو نہ دے دیتا۔ دوسری صورت میں مجھے سراج الدین اور مشرف حسین کی طرف سے کوئی نا دیدہ خطرہ بھی لاحق ہو سکتا تھا۔

میری چھٹی میں ابھی پورے تین دن باقی تھے، کراچی پہنچ کر میں سب سے پہلے رحمان صاحب سے ان کے فلیٹ پر جا کر ملا (جو آج بھی میٹرڈ پول کے قریب ایک پٹرول پمپ کے برابر واقع ہے۔ اس زمانے میں نگارویکلی کا دفتر بھی اسی بلڈنگ میں ہوا کرتا تھا) میں نے انہیں کیس کے بارے میں پوری تفصیل سے آگاہ کیا تو وہ کسی ایسے معصوم بچے کی طرح کھل



اُٹھے، جسے اس کا سن پسند کھلونا مل گیا ہو۔

”ویل ڈن، فیصل!“ انہوں نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ”مجھے پہلے ہی اس بات کا شبہ تھا کہ حیدر آباد ڈویژن کو گولڈ کے معاملے میں دیدہ و دانستہ نظر انداز کیا جا رہا ہے۔“

”میں ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں، سر!“ میں نے دبی زبان میں کہا۔

”لیس.....!“

”آپ براہ مہربانی فوری طور پر انٹیلی جنس سے ہٹا کر میرا تبادلہ کسی بھی سرکل آفس میں کر دیں۔“

”وہاٹ؟“ رحمان صاحب اس طرح چونکے، جیسے انہیں میری بات سے ذہنی جھٹکا لگا ہو۔ پھر مجھے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولے۔ ”آپ اپنا تبادلہ کیوں چاہتے ہیں؟“

”آئی ایم سوری سر! لیکن مجھے مجبوراً کہنا پڑ رہا ہے کہ میں دریا میں رہ کر مگر مچھوں سے بیر مول لینا نہیں چاہتا۔“ میں نے دبی زبان میں کہا۔

”آپ کا اشارہ کس کی طرف ہے؟“

”سپرنٹنڈنٹ صاحب اور مشرف حسین کی طرف۔“ میں نے جواب دیا۔ پھر سراج الدین سے اپنی ہونے والی تمام گفتگو بھی بیان کر دی۔

رحمان صاحب کچھ دیر سوچتے رہے، پھر صوفے پر پہلو بدل کر بولے۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی تبادلے والی درخواست منظور نہیں کر سکتا۔“

”لیکن سر.....!“

”آپ نے غالباً دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی لے رکھی ہے۔“ انہوں نے میری بات کا کوئی نوٹس لئے بغیر سوال کیا۔

”لیس سر! میں نے چھٹی اسی وجہ سے لی تھی کہ میری موومنٹ (نقل و حرکت) کو چیک نہ کیا جاسکے۔“

”دیری گڈ۔“ رحمان صاحب نے ایک بار پھر مجھے تعریفی نظروں سے دیکھا، پھر تھوڑے توقف سے بولے۔ ”آپ ایسا کریں کہ مجرم اور گولڈ کو تمام قانونی دستاویزات کے ساتھ اسی وقت جا کر مسٹر جعفری کے حوالے کر دیں۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ ابھی تک دفتر میں ہی ہوں گے۔“

رحمان صاحب نے اسی وقت دفتر فون کیا۔ اس وقت رات کے سوا دس بجے تھے۔ لیکن جعفری صاحب توقع کے عین مطابق دفتر میں مل گئے۔ رحمان صاحب نے انہیں ضروری ہدایات دیں اور خاص طور پر یہ بھی تاکید کی کہ جہاں تک ممکن ہو، اس کیس کے بارے میں سراج الدین یا مشرف حسین کو کسی قسم کی اطلاع نہ ہو سکے تو بہتر ہے۔ گفتگو ختم ہونے کے بعد

وہ دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

”آپ جائیں اور کسی سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، آپ کو تحفظ فراہم کرنا میرا کام ہے۔“

میں نے اسی وقت جا کر رحمان صاحب کی ہدایت پر کاغذات، سونا اور مجرم کو جعفری صاحب کے حوالے کیا، پھر گھر چلا گیا۔ دوسری شام مجھے جعفری صاحب ہی کے ذریعے یہ اطلاع ملی کہ مشرف حسین کا فوری تبادلہ ایک دُور دراز علاقے میں کر دیا گیا ہے اور خاص طور پر یہ ہدایت بھی ملی ہے کہ وہ بغیر کسی عذر کے، چوبیس گھنٹے کے اندر اندر نئی جگہ ڈیوٹی رپورٹ کرے، بصورت دیگر اس کے خلاف محکماتی کارروائی بھی کی جاسکتی ہے۔

چھٹی ختم ہونے سے ایک دن پہلے مجھے وہ ٹیپ بھی مل گئی، جسے میں نے اچھی خاصی رقم دے کر آرینج کیا تھا۔ میں نے گھر آ کر پوری ٹیپ سنی، اس میں دو جگہ سراج الدین اور اس مشہور سیٹھ کی گفتگو بھی ریکارڈ ہو چکی تھی۔ دونوں موقعوں پر سراج الدین کی گفت و شنید اس نمبر پر ہوئی تھی، جو سرکاری طور پر ان کے گھر پر فراہم کیا گیا تھا۔ مجھے علم تھا کہ سراج الدین کی پہنچ سی بی آر کے ایک نمبر تک تھی، جس کے بل بوتے پر وہ سینہ تان کر چلنے کا عادی تھا۔ شاید اسی لئے رحمان صاحب نے مشرف حسین کے ساتھ ہی ان کا تبادلہ کرنے سے گریز کیا تھا۔ بہر حال جب میں نے وہ ٹیپ لے جا کر رحمان صاحب کے حوالے کی تو ان کا چہرہ دہکتی آگ کے مانند تپ اٹھا۔ کچھ دیر وہ اپنے کسی خیال میں مستغرق رہے، پھر بولے۔

”یہ سراج الدین تو بالکل ہی پنچر (انتہائی غصے کے عالم میں دشنام طرازی کے بجائے ہمیشہ پنچر ہی کا لفظ استعمال کرتے تھے) ٹائپ کا افسر ثابت ہوا ہے۔ آپ نے یہ ٹیپ میرے حوالے کر کے اچھا کیا۔ لیکن دوبارہ اس قسم کی ٹیپ حاصل کرنے سے پرہیز ضروری ہے۔ اس طرح ہمارا محکمہ بھی بدنام ہو سکتا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں سر؟“

”بالکل ڈفر ہیں آپ۔“ رحمان صاحب نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ جس آپریٹر نے یہ ٹیپ آپ کے لئے تیار کی ہے، اس نے ایک کاپی اپنے پاس بھی محفوظ رکھی ہو۔ ایسی صورت میں وہ ڈیپارٹمنٹ کے خلاف اخبارات کے ذریعے کچھ بھی اچھا ل سکتا ہے۔“

”سوری سر.....!“ میں نے معذرت کی۔ ”آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔ لیکن اس ٹیپ کے بارے میں کسی تیسرے آدمی کو کچھ نہیں معلوم ہونا چاہئے۔ مسٹر جعفری کو بھی نہیں۔“

”رائٹ سر!“ میں رحمان صاحب کو سلام کر کے واپس آ گیا۔

چھٹیاں ختم ہونے کے بعد میں نے ڈیوٹی جوائن کر لی۔ لیکن پہلے ہی روز مجھے حالات کا اندازہ ہو گیا۔ سپرنٹنڈنٹ کا منہ محاورہ ہی نہیں بلکہ حقیقتاً بھی پھولا دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ اسے میرے کیس کے بارے میں علم ہو گیا ہے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر سراج الدین نے اس بار بھی مجھے بلا کر کیس کے بارے میں دریافت کیا تو میں صاف طور پر یہ بہانہ بنا دوں گا کہ مجھے نہ صرف رحمان صاحب نے بلا کر کیس کرنے کی ہدایت کی تھی، بلکہ پکڑے جانے والے کیس کی انفارمیشن بھی مجھے انہی کے ذریعے ملی تھی۔ لیکن ان سب باتوں کی نوبت نہیں آئی۔

میرے دفتر جوائن کرنے کے کوئی ایک ہفتے بعد سراج الدین کے ٹرانسفر بھی اوپر سے آ گئے۔ اس روز میں نے بے حد سکون کا سانس لیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر کا تبادلہ پسنی (PASNI) کیا گیا تھا، جہاں جانے کے لئے عام طور پر سمندری یا پھر ہوائی سفر اختیار کرنا پڑتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اتنی دور بیٹھ کر جہاں سے پوسٹ کئے گئے خطوط بھی ہفتہ دس دن بعد موصول ہوتے تھے، وہ پستہ قد اور زہریلا شخص میرے خلاف آسانی سے کوئی جوابی کارروائی نہیں کر سکے گا۔ سراج الدین کے جانے کے بعد رحمان صاحب کی کوششوں سے، کارکردگی کی بنیاد پر جعفری صاحب کو نہ صرف پروموشن مل گیا، بلکہ ان کی تعیناتی بھی اٹلی جنس ہی میں کر دی گئی۔

یہ واقعہ غالباً 1957ء کے وسط کا یا پھر 1958ء کے شروع کا ہے، اس لحاظ سے اس بات کو تقریباً 52 سال گزر چکے ہیں۔ اس عرصے میں رحمان صاحب کا تبادلہ بھی ہو گیا تھا، ان کے جانے کے بعد جب سراج الدین دوبارہ پسنی سے تبدیل ہو کر کراچی واپس آیا تو اس نے اپنا پرانا انتقام کچھ اس طرح لیا کہ مجھے 1961ء میں بحالت مجبوری ملازمت سے استعفیٰ دینا پڑا۔ لیکن ملازمت جانے کا دکھ نہ مجھے اس وقت تھا، نہ اب ہے۔ اس لئے کہ میں حق پر تھا اور شاید اسی لئے مجھے دو سال بے کار رہنے کے بعد سابقہ تجربے کی بنیاد پر عمر میں رعایت دے کر پہلے سے زیادہ اچھی ملازمت مل گئی۔ (اب میں دوسری ملازمت سے بھی ریٹائر ہو چکا ہوں) میری زندگی ریٹائر ہونے کے بعد بڑی پرسکون گزر رہی ہے۔ لیکن..... کوئی خلش اگر ہے تو صرف اس بات کی کہ میں نے زندگی میں پہلی بار رحمان صاحب کو اس دوسو تو لے سونے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، جسے میرے منہ پر پکینگ سے پہلے ہی خورد برد کر دیا تھا!!



## پوسٹ مارٹم

ایئر پورٹ میں اپنے دفتر میں بیٹھے وہ چاروں افسران اس وقت خاصے خوش نظر آ رہے تھے۔ شاید اس لئے کہ وہ کچھ دیر پہلے ہی دہلی کی فلائٹ چیک کر کے لوٹے تھے۔ ان کی جیبیں خاصی گرم تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے مخصوص مقرر کردہ ایجنٹ وہ سامان لے کر پہلے ہی کسٹم لاؤنچ سے نکل چکے تھے، جو جیب میں نہیں کھپ سکتے تھے۔

عام طور پر دیکھا جاتا تھا کہ کسٹم کا عملہ ڈیوٹی انجام دیتے وقت بے حد سنجیدہ اور رعب داب کے ساتھ کسٹمز کاؤنٹر پر چیکنگ کی غرض سے اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے لئے وارد ہوتا تھا۔ وہ عام مسافروں کو بھی اتنی تیز خونخوار اور گہری نگاہوں سے دیکھتے تھے کہ جیسے وہ ملک کا سب سے بڑا شاطر اسمگلر واقع ہوا ہو۔ پھر اس کے تمام سامان کے نیچے اڈھیڑنے کے بعد اس طرح اس پر ”چاک“ مارتے تھے، جیسے اس کے ساتھ بطور خاص کوئی احسان کر رہے ہوں۔ لیکن وہی عملہ ڈیوٹی فری پورٹس سے آنے والی پروازوں کے ساتھ نہایت میانہ روی اور بڑی خوش اخلاقی سے پیش آتا تھا۔ ان فلائٹس سے آنے والوں کے سامان کو کھولنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی۔ ساری کارروائی زبانی کرنے کے بعد چاک مار دیا جاتا تھا۔ مسافروں کی اچھی خاصی تعداد چونکہ اس ”زریں اصول“ سے واقف تھی، اس لئے وہ بھی پیشہ ورانہ انداز میں اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے، کے عادی بن چکے تھے اور بلا کسی جیل و جت کے کسٹم کے تعینات عملے سے دوستانہ انداز میں ”مصافحہ“ کرنے کے بعد ان کی حدود سے باہر نکل کر اطمینان کا سانس لیتے تھے۔

یہ کوئی ایسی تعجب خیز بات بھی نہیں تھی۔ انسان جو کچھ ہاتھ پاؤں چلاتا ہے، پیٹ کی خاطر چلاتا ہے۔ پیٹ بھرا ہو تو چہرے پر خون کی رنگت بھی کچھ گہری ہو جاتی ہے، ورنہ خالی پیٹ تو ایک عام انسان بھی بڑا مضطرب اور زہد خشک نظر آتا ہے۔ رہا ناجائز اور جائز کا سوال تو یہ نطقی ایک مذہبی معاملہ ہے جس کا تعلق مذہبی امور کے محکمے سے ہے، نہ کہ ایسے کسٹم افسروں سے جو زیادہ تر کھڑے کھڑے فارغ ہونے کے عادی ہوتے ہیں۔ استیجا کرنے کا سوال یوں

پیدا نہیں ہوتا کہ اس طرح پتلون کا گھٹنا نکل آنے اور کرین خراب ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے، جس کی پاداش میں بڑے آفسروں کی ناخوشی کا خطرہ بھی مول لینا پڑتا ہے۔ چنانچہ بیشتر عملہ صرف ”ان ذریں اصولوں“ پر عمل کرنے کا عادی بن چکا تھا، جس سے افسران بالا کو خوش کیا جاسکے۔

کسٹم کی ملازمت کے دوران جو بات میری سمجھ میں کبھی نہ آسکی، وہ یہ تھی کہ بڑے بڑے افسروں کے گھروں میں بڑے بڑے فرنیچر، ٹیلی ویژن سیٹ، ریڈیو گرام اور ایئر کنڈیشنر کس طرح ایئر پورٹ سے درآمد ہوتے ہیں اور کس طرح ان کے عالی شان بنگلوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ میں نے کئی بار اپنے ساتھیوں سے بھی معلوم کرنے کی کوشش کی، لیکن یا تو مجھے بدھو کہہ کر ٹال گئے یا پھر معنی خیز انداز میں مسکرا کر خاموشی سے آگے بڑھ گئے۔ درعالباقی اسی بات کو جاننے کی گھات لگانے کے جرم میں میری تعیناتی ہمیشہ ایسی جگہ ہوتی، جہاں ڈیوٹی کے دوران زیادہ تر وہی کام کئے جاسکتے ہیں، یا تو انسان بیٹھا کھیاں مارتا رہے یا پھر نماز پڑھ کر وقت گزارے۔

لیکن تجربہ، ایمان داری اور بے ایمانی کے اصول لے کر کوئی ماں کے پیٹ سے نہیں پیدا ہوتا، نہ ہی اس میں کسی کی استادی اور شاگردی کام آتی ہے۔ ”کرسی“ خود بخود کسی قطب نما کی طرح انسان کی رہنمائی کر دیتی ہے۔ البتہ خاص خاص گریسیکنے کے لئے ایک یا دو گرگوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ گرگوں کی تلاش میں بھی زیادہ تنگ و دو نہیں کرنی پڑتی۔ اس لئے کہ جہاں سات افراد ذات پات، فرقہ اور نسل کی قید سے آزاد ہو کر باہمی ربط و ضبط سے کام کرنے کے عادی ہوتے ہیں، وہاں وہ اس آٹھویں کو بھی از خود اپنے رنگ میں ڈھالنے کی خاطر بھرپور کوشش میں اس وقت تک سرگرداں رہتے ہیں، جب تک وہ آٹھویں آدمی بھی ”میجارجنرل مسٹ بن گرائیڈ“ کے اصول کو نہیں اپنا لیتا اور دوسروں کی طرح خود کو بھی ”خوش حال“ بنانے کا عادی نہیں ہو جاتا۔

میری مثال بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ حسن اتفاق سے یا پھر میری قسمت سے ایک ایسا بڑا آفسر کسٹم کے محکمے کا سربراہ بن کر بلائے ناگہانی (بقول میرے بیشتر ساتھیوں کے) بن کر آ گیا، جس نے آتے ہی اٹھاڑ پچھاڑ شروع کر دی۔ فردا فردا سب کے ریکارڈ دیکھے گئے، خاص طور پر ان کے ناموں کے نیچے سرخ لکیر لگائی گئی، جو طویل مدت سے یا تو ایئر پورٹ پر مسافروں کی خضر منزلت کی خاطر تعینات تھے یا ایسی ایسی جگہوں پر کام کر رہے تھے، جہاں ”ہذا من فضل ربی“ کے طفرے نمایاں طور پر خوب صورت فریم میں لٹکے نظر آتے تھے۔ چنانچہ اسی اٹھاڑ پچھاڑ میں میری تعیناتی بھی ایئر پورٹ پر ہو گئی اور میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا کہ دنیا کس قدر رنگین اور صحت مند واقع ہوئی ہے۔ ہوائی اڈے پر دنیا

کے تمام ممالک کے افراد نظر آتے تھے، مٹی اسکرٹ سے لے کر عربی چونڈ آئے دن دیکھنے کو ملتے تھے۔ غرضیکہ یہاں وہ سب کچھ موجود تھا، جو انسان کی ”کایا پلٹنے“ اور زندگی سنوارنے کے کام آتا ہے۔ بقول شاعر ”اب تو آرام سے گزرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے۔“ غرضیکہ ایئر پورٹ پر پوسٹنگ ملنے کے بعد میری زندگی میں بھی ایک خاص تغیر آیا۔ میں حالات کے سانچے میں ڈھلتا چلا گیا اور وقت کے دھارے کے ساتھ ساتھ ”ہوا کے رخ“ پر پہننے کا عادی بن گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے کسٹم کا محکمہ جوائن کیا تھا اور میری پہلی پوسٹنگ ”گھاس بندر“ پر ہوئی تھی تو مجھے یوں محسوس ہوا تھا، جیسے مجھے دنیا کی بادشاہت میسر آ گئی ہو۔ ڈیوٹی کے اوقات میں اکثر میں باہر ایک آرام کرسی ڈالے سمندر کا دلفریب نظارہ کیا کرتا تھا اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوا کرتا۔ گھاس بندر پر جب میں پہلی دفعہ سفید براق جیسی یونیفارم اور قسم اڈل کی پی کیپ جس پر کسٹم کا سنہری مونو گرام دکھ رہا تھا، پہن کر پہنچا تو میرے سپاہیوں نے مجھے سیلوٹ کیا اور میرا سینہ، جو پہلے ہی کسرت کی وجہ سے خاصا چوڑا چمکا تھا، کچھ اور پھول گیا۔ میری ڈیوٹی رات کو بارہ بجے ختم ہوتی تھی، جس کے بعد دوسری شفٹ شروع ہوتی تھی۔ وہ میری ملازمت کی چونکہ پہلی پہلی ڈیوٹی تھی، اس لئے میں بہت خوش تھا۔ میں نے سپاہیوں کو بلا کر کہا۔

”اپنی ڈیوٹی پر چوک رہنا، کوئی کام ایسا نہ کرنا جس سے بدنامی کا اندیشہ لاحق ہو۔“  
”یس سر!“ ایک سپاہی نے بڑی فرمانبرداری سے سلام جھاڑتے ہوئے کہا۔ لیکن دوسرا معنی خیز انداز میں بولا۔

”ہم تو بلا وجہ بدنام ہیں، سر! اگر بدنام نہ ہوتے تو آج یہاں سمندر کے کنارے پر سوکھی ہوئی مچھلیوں کی طرح بے یار و مددگار نہ پڑے ہوتے۔“  
”کیا مطلب.....؟“ میں نے اسے حیرت سے گھورا۔ مجھے اس کالب و لہجہ کچھ عجیب سا لگا تھا۔

”ابھی آپ نے ملازمت پر چڑھے ہیں سر! رفتہ رفتہ آپ بھی سب مطلب سمجھنے کے عادی ہو جائیں گے۔“

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“ میں نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ ”سوکھی مچھلیوں سے تمہاری کیا مراد ہے، کیا یہاں تمہیں تنخواہ نہیں ملتی؟“  
”تنخواہ تو ملتی ہے سر! لیکن.....“ وہ ہنس کر خاموش ہو گیا۔  
”لیکن کیا؟“ میں نے رعب دار لہجہ اختیار کیا۔  
”تنخواہ میں گزارا کہاں ہوتا ہے جناب؟“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ ”جب انسان کو

مرغ مسلم کھانے کی عادت پڑ جائے تو پھر دال روٹی آسانی سے ہضم نہیں ہوتی۔ مجبوراً زہر مار کرنی پڑتی ہے۔“

”بہتر ہے کہ تم کھل کر بات کرو۔ میں سیدھا سادا آدمی ہوں، جسے پیچیدہ اور لمبے دار باتوں سے نفرت ہے۔“ میں نے مزید سخت لہجے میں اسے اپنے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

”کپڑے جب نئے نئے کلف ہو کر آتے ہیں تو بڑے کڑک دار ہوتے ہیں سر! مگر یہ کلف بہت جلد اتر جاتا ہے۔“ اس نے زیر لب مسکرا کر جواب دیا۔ ”وقت انسان کو سب کچھ سکھا دیتا ہے۔ آپ بھی رفتہ رفتہ ہم جیسے غریب اور مسکین آدمیوں کی زبان سمجھنے لگیں گے۔“

”اچھا جاؤ، جا کر اپنی اپنی ڈیوٹیاں کرو۔ اور ہاں، میرے پاس کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں آتی چاہئے۔“ میں نے بات ختم کرنے کی خاطر افسرانہ انداز میں کہا تو سپاہی خاموشی سے چلے گئے۔

رات کی ڈیوٹی پر جو افسر تعینات تھا، وہ بارہ بجے کے بجائے ڈیڑھ بجے آیا۔ پھر جب اس نے ہیلو مانی ڈیڑھ کہہ کر مجھ سے ہاتھ ملایا تو میں سمجھ گیا کہ وہ پوری طرح ”نٹن“ ہے۔ اس نے جو شراب پی رکھی تھی، وہ یقیناً مہنگی اور کسی خاص برانڈ کی تھی، اس لئے کہ مجھے اس کی مہک ناگوار نہیں گزری تھی۔ کچھ دیر تک رسی گفتگو کے بعد میں اسے چارج دے کر جانے لگا تو اس نے مسکرا کر کہا۔

”تمہاری رہائش کہاں ہے؟“

”تین ہٹی کے قریب جہانگیر کوارٹر میں۔“ میں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

”اتنی رات گئے تمہیں یہاں سے کوئی بس ملتی ناممکن ہے، کوئی دوسری سواری بھی ذرا مشکل سے ملے گی۔ اور ملی بھی تو منہ مانگے دام پر جانے کو تیار ہوگی۔“

”پھر.....؟“

”گاڑی نہیں ہے تمہارے پاس؟“ اس نے حیرت سے سوال کیا۔

”جی نہیں۔“ میں نے کہا۔

”آئی سی۔“ اس نے مجھے سر سے پیر تک ایسے انداز میں دیکھا، جیسے وہ میرے ظاہر اور باطن کا ایکسرے کر رہا ہو۔ پھر سنجیدگی سے بولا۔

”میرا مشورہ مانو تو رات یہیں کوچ پر سو رہو۔ صبح سویرے نکل جانا۔ رات کو ہمارا سفر کرنا یوں بھی مخدوش ہوتا ہے۔“

میں اس وقت اس کے مخدوش کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ بہر حال میں نے اس کا مشورہ مان

لیا۔ کوٹ اتار کر ٹیگر پر لٹکایا اور سونے کے ارادے سے آرام دہ کوچ پر لیٹ گیا۔ سمندر کی لہروں کے مسور کن شور اور ہوا کے جھونکوں میں مجھے بہت جلدی نیند آ گئی۔ صبح میں حسب معمول فجر کے وقت اٹھا اور گھر آ گیا۔

شام تک ایسی کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی، جس کا تذکرہ ضروری ہو۔ لیکن جب لباس کو استری کرنے کی خاطر میں نے پتلون اور کوٹ کی جیبوں کو ٹٹولا تو یکھت میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میرے کوٹ کی جیب میں سوسو کے نوٹ کی شکل میں پورے ایک ہزار موجود تھے۔ ان روپوں کو دیکھ کر خوف کی ایک لہر میرے جسم میں سرایت کر گئی۔ پہلا خیال جو میرے ذہن میں ابھرا، وہ یہی تھا کہ کسی نے مجھے پھنسانے کی کوشش کی ہوگی۔ چنانچہ میں نے جلدی سے اس رقم کو جیب میں منتقل کیا، گھر کے پچھلے دروازے سے چوروں کی طرح نکلا اور رکشہ پکڑ کر سیدھا اپنے ماموں کے گھر پہنچا، جو اس وقت (اکتیس سال پہلے) لینڈ ٹنٹسم میں ملازم تھے۔ جس وقت میں وہاں پہنچا، وہ کہیں جانے کے لئے پڑے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے۔

”اور سناؤ بیٹے! پہلے روز کی ملازمت کا تجربہ کیا تھا؟“

”انتہائی خوف ناک۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ انہوں نے مجھے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”ماموں.....!“ میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے آپ سے تنہائی میں ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”خبریت تو ہے؟“ ماموں نے میرے چہرے کے تاثرات کو بغور دیکھتے ہوئے کہا، پھر اٹھ کر لان میں آ گئے۔

ماموں سے میں خاصا بے تکلف تھا۔ ہماری عمروں میں کچھ اتنا فرق بھی نہیں تھا کہ ایک دوسرے کا احترام فرض ہوتا۔ چنانچہ ہم ایک محدود دائرے میں ایک دوسرے کے دوست بھی تھے۔ میں نے دل کڑا کر کے ڈرتے ڈرتے انہیں پورے واقعات سے باخبر کیا تو وہ بے اختیار ایک فلک شکاف تہمتہ لگاتے ہوئے بولے۔

”بس اتنی سی بات تھی، جو تم پریشان ہو گئے؟“

”کیا مطلب؟“ میں نے حیرت سے ماموں کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”کسی غیر نے میری لاعلمی میں میری جیب میں ہزاروں روپے ڈال دیئے اور آپ اسے اتنی سی بات سمجھ رہے ہیں۔ اگر رشوت کے کیس میں دھریا جاتا تو میرے پاس اپنی صفائی کے لئے معقول جواب بھی نہ ہوتا۔ ملازمت تو خیر جاتی، لیکن خاندان میں جو رسوائی ہوتی اور جگ ہنسائی ہوتی، وہ الگ۔“

”نہیں۔“ ماموں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس میں پھنسنے پھنسانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل تم جس محکمے میں ملازم ہو، وہاں زیادہ تر مل بانٹ کر کھانے کا رواج ہے۔ تم اسے پول منی میں سے اپنا حصہ بھی سمجھ سکتے ہو۔ آج کسی دوسرے ساتھی نے تمہارا حصہ تمہاری جیب میں ڈالا ہے، کل یہی کام تمہیں بھی کرنا ہوگا۔“

”لیکن میرے سوتے میں۔“

”بچوں جیسی باتیں مت کرو۔“ ماموں نے بڑی بے پروائی سے جواب دیا۔ ”دراصل ہوتا یہ ہے کہ شفٹ میں جو شخص طے شدہ رقم دوسری پارٹی سے لیتا ہے، وہ اسے برابر کے حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ تم چونکہ نئے ہو، اس لئے اس نے تمہیں بتانا ضروری نہیں سمجھا ہو گا اور شفٹ ڈیوٹیز کے افسران سے وصول شدہ رقم کو تقسیم کر کے تمہارا حصہ دے دیا ہے۔ جاؤ موج اڑاؤ۔ اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی نئے ہو، آہستہ آہستہ ساری باتیں سیکھ جاؤ گے۔“

”لیکن یہ تو صریحاً رشوت ہوئی۔“ میں نے کہا۔ ”وصول شدہ رقم کے عوض ہمیں مجرموں کو بھی کوئی نہ کوئی قانونی مراعات ضرور دینی پڑتی ہوگی۔“

”ایسی کوئی خاص مراعات نہیں دینی پڑتی۔“ ماموں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”بس ذرا سی چشم پوشی کرنی پڑتی ہے اور اس کے بدلے میں جو رقم ملتی ہے، اسے مال غنیمت کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے اور رشوت وہ ہوتی ہے جو باقاعدہ نفع اور نقصان کو ملحوظ خاطر رکھ کر پہلے سے طے کی جاتی ہے۔“ ماموں نے مجھے مال غنیمت اور رشوت کا فرق سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”گھاس بندر کی ڈیوٹی لوگوں کو سزا کے طور پر دی جاتی ہے اور وہاں سے جو تھوڑا بہت مال غنیمت وصول ہوتا ہے، تم اسے روزمرہ کا وظیفہ بھی سمجھ سکتے ہو۔“

”لیکن.....“

”لیکن ویکن چھوڑو اور جا کر عیش کرو۔ ہاں، ایک بات کا خاص خیال رکھنا۔ جب تمہاری نائٹ ڈیوٹی آئے تو تمہیں بھی یہی ڈیوٹی..... میرا مطلب ہے، برابر ہزارے کا کام سرانجام دینا ہوگا۔“ ماموں نے مجھے حصے بخرے کے معنی سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”تم خوش قسمت ہو، جو تمہیں کسٹم کی ملازمت مل گئی۔ ویسے کیا تم یقین کرو گے کہ یہ واحد محکمہ ہے، جہاں آمدنی بے حساب ہوتی ہے، لیکن کوئی اس کے کارندوں کی سمت آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”اس لئے کہ یہ محکمہ سب سے زیادہ ایمان دار سمجھا جاتا ہے۔“

”ایمان دار!“ مجھے ماموں کے منہ سے ایمان داری والی بات سن کر حیرت ہوئی۔

”ہاں۔“ ماموں نے مسکرا کر کہا۔ ”اس محکمے میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اس کے

افران میں سب سے زیادہ اتحاد ہوتا ہے۔ اوّل تو اوپر کی آمدنی میں اوپر والوں کا حصہ شامل ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود اگر کوئی بد نصیب قسمت کا مارا دھر لیا جائے تو اس کے تمام ساتھی نسل اور فرنی کی تمیز بھول کر متحد ہو جاتے ہیں، اس کے دفاع کے لئے باقاعدہ پول سسٹم قائم ہوتا ہے، اس پول کی جمع شدہ رقم سے بڑے سے بڑے وکیل کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جو مجرم ہونے والے باوجود اس آفیسر کو بے گناہ ثابت کر دیتا ہے۔“

”مگر یہ تو انصاف نہ ہوا۔“ میں نے قدرے ناخوشگوار انداز میں کہا۔ ”کوئی جرم کرے اور اسے سزا نہ ملے؟“

”اسی لئے تو دانشوروں نے قانون کو اندھا قرار دے رکھا ہے۔ یہ جو قانون کی موٹی موٹی کتابیں ہیں، ایسے ہی موقعوں پر زیادہ کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور تول کے اعتبار سے بھی پلڑا ہمیشہ اسی طرف جھکتا ہے، جہد وزن زیادہ ہو۔ تم ابھی نئے ہو، اس لئے گھبرا رہے ہو۔ آہستہ آہستہ رواں ہو جاؤ گے تو پھر میرے مشورے کی ضرورت نہیں پڑے گی تمہیں۔“

ماموں نے غلط نہیں کہا تھا۔ میری مثال شروع شروع میں اس انجن کی سی رہی جو نیا نیا باندھا گیا ہو۔ پھر وقت کی رفتار آہستہ آہستہ بڑھی تو میں بھی ”رواں“ ہو گیا۔ خاص طور پر ایئر پورٹ کی ڈیوٹی ملنے کے بعد سے تو میں نے وہ تمام گر بہت جلد سیکھ لئے، جو گھاس بندر پر تعینات رہنے والے افسران برسوں میں نہیں سیکھ سکتے۔

قسمت کی دیوی مہربان ہوئی تو میں نے ایک پوش علاقے میں دو سو چالیس گز پر بنا ہوا ایک ون یونٹ بنگلہ نما مکان خرید لیا، جسے نئے ساز و سامان سے آراستہ کیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد جب میں نے واکس وکین خریدی اور اس پر پہلی بار دفتر گیا تو مجھے تمام راستے ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے میں کسی ”طلسماتی اژن کھولنے“ میں بیٹھا بادلوں کے درمیان پرواز کر رہا ہوں۔ اپنی گاڑی میں نے کسٹم کے شیڈ کے قریب پارکنگ لائٹ میں کھڑی کی، پھر سینہ تان کر چلتا ہوا اندر داخل ہوا تو میرے دوستوں نے دل کھول کر مجھے مبارک باد دی۔ نئی گاڑی اور بنگلے کی خوشی میں، میں نے اپنی شفٹ کے تمام اسٹاف کو شاندار پارٹی دی۔ اس روز جب میں نے بیرے کو پچاس روپے بطور ”ٹپ“ دیئے تو مجھے احساس ہوا کہ سب سے پہلے میری جبب سے جو ہزار روپے میرے حصے کے برآمد ہوئے تھے، وہ اچھی پوسٹنگ والوں کے لئے ہاتھ کے میل سے بھی زیادہ بدتر اور حقیر تھے۔

ایک عام کہات ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ زندگی اور موت کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ کون جانے کون سی سانس آخری ثابت ہو۔ چنانچہ میں نے دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنی شروع کر دی۔ وہ ساتھی جو ہم سے سینئر تھے، وہ بھی میری برق رفتاری دیکھ کر عیش کرنے

لگے تھے۔ لیکن ذہانت کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ ضروری نہیں ہے کہ جو افسر سینئر ہو، اس کا ذہن بھی زیادہ رواں ہو۔ آبکاری کے محکمے کے بے شمار سپاہی بھی ایسے تھے جو اپنے افسران کے مقابلے میں زیادہ مستحکم حیثیت کے مالک تھے۔ دن بھر وہ دفتر میں افسروں کے شاندار کمرے کے سامنے دروازے میں پڑی ہوئی ٹوٹی پھوٹی بیچوں پر بیٹھے تھے لیکن رات کو نہایت آرام دہ بستر پر استراحت فرماتے تھے۔ بالائی آمدنی کے علاوہ ان کی کئی کئی بیس بھی چلتی تھیں، جن کی خاصی معقول آمدنی وہ روزمرہ ڈرائیوروں سے گام گلوج کرنے کے بعد اس طرح وصول کرتے تھے، جیسے ان پر کوئی احسان عظیم کر رہے ہوں۔

بہر حال، قسمت کی دیوی میرے اور میری ماں کی اور میری خوش حالی میں آئے دن خاطر خواہ اضافہ ہوتا رہا۔ پھر ایک دن میرے ساتھی نے کہا۔  
”یار! تو بھی ایک نمبر کا کنجوس واقع ہوا ہے۔ کیا پچھڑی واکس دیکھ لے گھومتا ہے، کوئی اچھی سی کار لے جو تیرے شایان شان ہو۔“

اپنے ساتھی کی وہ بات میرے دل و دماغ میں جیسے نشتر بن کر اتر گئی۔ میں نے ایک ہفتے کے اندر اندر واکس دیکھنے کو ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہہ کر دوسروں کی طرح ایک نئے ماڈل کی کار خرید لی۔ یہاں ایک بات اور بتا دوں کہ ذہانت کسی کی میراث نہیں ہوتی، لیکن تجربہ اس سے بھی زیادہ اہم چیز کا نام ہے جو انسان کی زندگی میں ایک ایسی سرنگ کا کام انجام دیتا ہے، جو بوقت ضرورت کام آتی ہے۔“

جس روز میں نئی گاڑی لے کر ڈیوٹی پر پہنچا، میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ لیکن میرے ایک دوسرے ساتھی نے پھر بھی ایک ایسا جملہ کس دیا کہ میں اندر ہی اندر خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

”یار! آخر! یہ تو وہی بات ہوئی کہ جتنے کا کپڑا نہ ہو، اس سے زیادہ رقم انسان اس کی سلائی پر خرچ کر دے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“ میں نے اپنے ساتھی کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”مطلب بہت صاف ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”اگر انسان شیر پالے تو اس کے لئے لوہے کا خوب صورت جنگلا بھی ہونا چاہئے۔ دوسو چالیس گز کے مکان میں تمہاری یہ نئی کار بھلا کیا چھتی ہوگی۔ میری ماں تو ہزار گز پر بنا ہوا کوئی بنگلہ خرید لو۔ مکانات کی قیمت آج کل گری ہوئی بھی ہے۔ پچاس پچتر ہزار میں اسے دن بنگلہ مل سکتا ہے۔ صبح اٹھ کر لان پر چہل قدمی سے صحت پر بھی خوش گوار اثر پڑے گا اور ذہن کو تازگی اور فرحت بھی ملے گی۔“

اس کی کہی ہوئی بات میرے ذہن میں اس طرح بیٹھی، جیسے دشمن کے حملے کے وقت

سب میرین (Sub-Marine) سمندر کی تہ میں بیٹھ کر اپنا کامیاب دفاع کرتی ہے۔ مگر اس سے قبل کہ میں اپنے اس نئے خواب کو شرمندہ تعبیر کرتا، دوسرے ہی دن دفتر پہنچنے کے بعد اسٹنٹ کلکٹر کی طرف سے طلبی کا حکم آ گیا۔

”خیریت تو ہے؟“ میں نے سپاہی سے پوچھا۔  
”اُدھار کے نام پر کسی لمبی رقم کا مطالبہ کرے گا تم سے۔ اور پھر اس طرح بھول جائے گا جیسے کوئی دل پھینک عاشق کسی نئی محبوبہ کے دل جانے پر پرانی کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے۔“  
میرے دوسرے ساتھی نے کہا۔ ”سالے کا پیٹ کسی مال گاڑی کے ڈبے سے کم نہیں۔ کبھی بھرتا ہی نہیں۔ تمام ماتحتوں کو باری باری چھیلتا رہتا ہے۔ ایک دو ایسے خوش نصیب ہوں گے، جن کی رقم قسط وار ہی سہی، لیکن واپس مل گئی۔ ورنہ بندہ تو ایسے ڈانگر کی طرح ہے، جو ناند کا سارا چارہ ہضم کرنے کے بعد ڈکار بھی نہیں لیتا۔“  
”پھر.....؟“

”بلا یا ہے تو جانا تو پڑے گا۔ لیکن ذرا سنبھل کر بات کرنا، ورنہ اگر ایک بار اس نے چڈھی کا ٹھٹھ لی تو آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑے گا۔“

اس سے قبل میں نے بس دور ہی دور سے اسٹنٹ کلکٹر کو دیکھا تھا۔ کبھی دو بدو بات کرنے کا حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ بظاہر وہ صورت سے بڑا مسکین نظر آتا تھا۔ دھیمے دھیمے اور نہایت نرم لہجے میں بات کرنے کا عادی تھا، لیکن پیٹ کا حال دائی ہی جان سکتی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے ساتھی کی صیحت کو گرہ سے باندھا اور جل ٹو جلال ٹو کا ورد کرتا ہوا اسٹنٹ کلکٹر کے کمرے میں داخل ہو کر اُسے سلیوٹ مارا اور کسی بُھٹ کی طرح ایستادہ ہو گیا۔

”بیٹھو۔“ اس نے مجھے دیکھ کر سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا اور میں خاموشی سے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں اس وقت ہمارے علاوہ کوئی تیسری شخصیت موجود نہیں تھی۔ میرے بیٹھنے کے بعد اس نے تھوڑے وقفے کے بعد پوچھا۔

”آپ رحمان جعفری ہیکے سالے ہیں؟“

”جی ہاں۔“ میں نے قدرے سکون کا سانس لے کر جواب دیا۔

”کسی زمانے میں ہم دونوں کلاس فیلو رہ چکے ہیں۔“ اس نے بڑے پیار سے کہا، پھر بولا۔ ”میں نے تمہیں ایک خاص مقصد سے بلایا ہے۔“

”کوئی خدمت؟“

”آپ نے شاید نئے ماڈل کی ٹویوٹا خریدی ہے۔“

”جی ہاں۔“

”اور آپ کا بینک بیلنس میری معلومات کے مطابق اس وقت گیارہ لاکھ کچھ ہزار ہے۔“

”جی۔“ میں چونکا، پھر سفید جھوٹ بولا۔ ”سرا! کسی نے آپ کے کان بھرنے کی کوشش کی ہوگی، ورنہ.....“

”آپ کا اکاؤنٹ جس بینک میں ہے، اس کا منیجر میرا واقف کار ہے، میرا اکاؤنٹ بھی اسی بینک میں ہے اور اس وقت میرے اکاؤنٹ میں دس بارہ ہزار سے زیادہ رقم نہیں ہے۔“ میری حقیقت چونکہ اسٹنٹ کلکٹر کی گرفت میں آچکی تھی، اس لئے میں نے بحث کرنے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ کچھ دیر تک میرے چہرے کے تاثرات اور میری خاموشی کا بہ غور جائزہ لیتا رہا، پھر بڑی اپنائیت اور شفقت سے بولا۔

”ہماری حالت ایک حمام میں سب ننگے جیسی ہے۔ بیشتر لوگ کرپشن میں ملوث ہیں۔ میں خود اپنے آپ کو بھی ایمان دار نہیں کہوں گا۔ لیکن تم چونکہ میرے عزیز دوست کے سالے ہو، اس لئے تمہیں نصیحت کر رہا ہوں کہ ہمارے واسطے زیادہ نمائش اچھی نہیں ہوتی۔ تم نے وہ مثال سنی ہوگی کہ بد اچھا بدنام برا۔ ہم دیسے ہی بدنام ہیں، اس پر اگر ہم نے نمائش بھی شروع کر دی تو پھر رہی سہی سا کھ بھی جاتی رہے گی، آٹے میں نمک دالی بات نبھ جاتی ہے، لیکن نمک میں آٹا ملایا جائے تو پھر معاملات خراب ہو جاتے ہیں۔ انسان کو کچھ پانے کے لئے کچھ قربانی بھی دینی پڑتی ہے، دانہ یوں ہی گل گلزار نہیں ہوتا۔ پہلے اسے خاک میں ملنا پڑتا ہے۔ میں تمہیں کسی بات سے منع نہیں کرتا، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ کچھ ایسے کیمرے بھی ساتھ ساتھ کرتے رہو کہ کارکردگی اور مالی غنیمت کے حصول کا توازن برقرار رہے۔ میری مثال لے لو۔ میرے پاس جو کچھ ہے، تم شاید اس کا تصور بھی نہ کر سکو۔ لیکن میرا عملہ مجھے کنجوس مہی چوس جیسے نام سے یاد کرتا ہے۔ نئے ہو اس کی وجہ کیا ہے؟ میں اکثر ان سے اُدھار نہیں لیتا رہتا ہوں اور وہ۔ سمجھتے ہیں کہ میں بالکل ہی زائد خشک ہوں۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ میں نمائش کا عادی بھی نہیں ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ دوسروں پر یہ بھی ظاہر کرتا رہتا ہوں کہ ہمیشہ ہینڈ ٹو ماؤتھ رہتا ہوں۔ تجربہ اور دور اندیشی ایسے زریں اصول ہیں کہ تم اس کی آڑ میں سب کچھ کر سکتے ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کارکردگی بھی شرط ہے۔ تم نے نئی گاڑی خرید کر اچھا نہیں کیا اور اب شاید تم ہزار گز کا بنگلہ خرید رہے ہو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو پھر تمہاری مثال کاغذ کی اس ناؤ جیسی ہوگی، جو زیادہ دیر تک نہیں چلتی۔ مجھے دیکھو، میں صرف چار سو گز کے مکان میں رہتا ہوں اور سرکاری گاڑی استعمال کرتا ہوں۔ میرے پاس اپنی کوئی ذاتی گاڑی نہیں، مکان بھی میں نے قرض حاصل کر کے تعمیر کیا ہے۔ حالانکہ میں چاہوں تو متعدد بنگلے اور گاڑیاں کیش دے کر خرید سکتا ہوں۔ ایک آخری نصیحت اور کر رہا ہوں، جو کچھ بھی حاصل کرنا، اسے کبھی اپنے نام پر نہ رکھنا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ اس کے علاوہ میں ایک بار پھر تم سے کارکردگی دکھانے کی تلقین کروں گا۔ اس طرح تمہاری شہرت اور نام افسران بالا کی نگاہوں

میں آجائے گا، جو تمہارے لئے سب سے زیادہ مؤثر پردہ ثابت ہوگا۔ میں نے جو کچھ کہا ہے، تمہیں اپنا سمجھ کر کہا ہے۔ اس کا تذکرہ کسی اور کے سامنے نہ کرنا۔ اب تم جاسکتے ہو۔“ میں نے اسٹنٹ کلکٹر کی باتیں غور سے سنیں اور ذہن نشین کر لیں۔ اس گرگ باراں دیدہ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ چنانچہ میں نے عہد کر لیا کہ آئندہ نمائش کرنے سے پرہیز کروں گا اور مالی غنیمت کے ساتھ ساتھ اپنی کارکردگی پر بھی زیادہ توجہ دوں گا۔ کسٹم کا وہ عملہ جو ایئر پورٹ یا سی پورٹ پر تعینات رہتا ہے، اس کے لئے کیس پکڑنا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا، یہ اور بات ہے کہ ”حق چشم پوشی“ وصول کرنے کے بعد اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔



وہ چاروں آفسر جو اس وقت دہلی کی فلائٹ منٹا کر دفتر میں بیٹھے تھے، بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔ ان کی جیبیں اس وقت خاصی شکم سیر نظر آرہی تھیں۔ چونکہ ان کی پشت پر کسی نہ کسی سیاسی لیڈر، صوبائی یا مرکزی یا پھر کسی بڑے آدمی کا ہاتھ تھا، اس لئے وہ جو بھی کرتے تھے، بانگ دہل کرتے تھے۔ پہلے میں بھی ان ہی کی طرح ”طرم باز خاں“ تھا۔ لیکن جب سے اسٹنٹ کلکٹر نے مجھے اپنے تجربے سے نوازا تھا، میں نے خود پر ایمانداری کا ایک خول چڑھا رکھا تھا۔ اب کانٹڈ کے علاوہ میرے حصے کا کیش بھی میرے مخصوص آدمی وصول کرتے تھے۔ میری جیب میں سو دو سو سے زیادہ روپے نہیں ہوتے تھے۔

”یار! آج تو بس مزہ آگیا۔“ محمود نامی افسر نے کہا۔ ”تم نے اس لڑکی کو دیکھا تھا جو بڑی معصوم صورت بنا کر میرے کاؤنٹر پر کھڑی تھی؟“

”لڑکیاں اور عورتیں تو بے شمار ہیں، تم کس کی بات کر رہے ہو؟“ ندیم نے محمود سے پوچھا۔

”دہلی، جس کی وجہ سے تمہاری توجہ بار بار میری طرف ہو جاتی تھی۔“ محمود نے لڑکی کے بارے میں بڑی شاعرانہ تفصیل بیان کی۔ ”بالکل ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے میدے کو شربت روح افزا سے گوندھ کر عمر خیام کے دور کی کوئی حسین دوشیزہ تخلیق کی اور قدرت نے اس کی صنائی کی داد دینے کی خاطر اس حسن کی پتلی میں جان ڈال دی ہو۔“

”اوہ!“ ندیم نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ”یار! وہ تو بڑی ہی معصوم نظر آ رہی تھی۔“

”ایسی ویسی؟“ محمود بولا۔ ”میں نے اس کا سوٹ کیس کھول کر اوپر رکھی ہوئی ہلکی شال اور دو چار کپڑے ہی ہٹائے تھے کہ میرے چودہ کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ پورا سوٹ کیس آرٹیفیشل جیولری اور دس دس تو لے کے سونے کی نگلیوں سے بھرا تھا۔ لیکن اس سے پیشتر کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا، اس نے جلدی سے اوپر کے کپڑے برابر کئے اور بڑی ادا سے ایک

لیڈر پرس میری طرف کھسکاتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ یہ میں آپ کے لئے خاص طور پر بطور نذرانہ لائی ہوں۔ اس کے اندر میرا وزینگ کارڈ بھی موجود ہے۔ کبھی موقع ملے تو میرے غریب خانے کو رونق بخشنے گا۔ میں خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گی۔ اور اس کے بعد کب میں نے چاک ماری اور کب وہ اٹھلائی اور بل کھائی یا نسیم کی طرح میری نگاہوں سے اوچھل ہوئی، مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ البتہ ایک بات ہے، معاملے کی بڑی کھری تھی۔ خاصی کھیلی کودی معلوم ہوتی ہے۔ دھوپ میں چاندی کے تاروں کی طرح مکڑی کے اس جالے کے مانند جس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔

”اب یہ جوش کی شاعری چھوڑو۔“ کرامت حسین نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی اور ایک کش لگاتے ہوئے بولا۔ ”یہ بتاؤ کہ پرس میں کیا کچھ تھا؟“

”اس سے زیادہ رقم تھی، جو میں دوسری حالت میں اس سے وصول کرتا۔“

”نام کیا تھا اُس ماہ لقا کا؟“ واجد علی نے پوچھا۔

”نام اور پتہ صیغہ راز کی باتیں ہیں، جو بتائی نہیں جاسکتیں۔“ محمود نے مسکرا کر جواب دیا۔ غرضیکہ وہ چاروں بہت خوش تھے۔ پھر یکفخت محمود نے جو خاصا دل پھینک واقع ہوا تھا، میری طرف گھور کر کہا۔ ”یار اختر! تم نے اس عربی نوجوان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا، جو تمہیں منہ مانگی رقم دینے پر آمادہ تھا۔“

”مجھے اس کا گفتگو کرنے کا انداز پسند نہیں آیا تھا۔“ میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔

”سالا اس طرح رقم کی بات بار بار کر رہا تھا، جیسے کتے کے آگے رات ب ڈال رہا ہو۔ کل کے اخبارات میں برآمد ہونے والے مال کی تفصیل کے ساتھ جب اس کی تصویر شائع ہوگی تو نانی یاد آجائے گی۔“

بہر حال اب میں نے وہ تمام گراہنا لئے تھے، جو میری نیک نامی اور شہرت کا سبب بن سکتے تھے۔ چنانچہ وہی ہوا۔ ایک مخصوص مدت کے بعد میرے علاوہ میری شفٹ کے تمام افسروں کا تبادلہ کر دیا گیا۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن دل پر جبر کر کے کوئی نہ کوئی ایسا کیس ضرور کر لیتا تھا، جو میری شہرت کو باقاعدہ عروج تک پہنچانے میں بڑا معاون ثابت ہو رہا تھا۔ پھر اس کیس نے تو میری شہرت کو چار چاند لگا دیئے، جس کو چھوڑنے کے عوض مجھے پورے پچاس ہزار کی آفر کی گئی تھی۔ عام حالات میں شاید میں اتنی بڑی رقم سے ہاتھ دھوئے پر بھی آمادہ نہ ہوتا، مگر وہاں معاملہ ایک فرد واحد کا نہیں بلکہ پوری پانچ عدد حسین، ماڈرن اور بڑے گھرانوں سے تعلق رکھنے والی خواتین کا تھا، جو سفری دستاویز کے مطابق سیاحی کی غرض سے بیرون ملک جا رہی تھیں۔ مجھے اس بات کا خدشہ لاحق تھا کہ اگر ان میں سے کسی ایک نے بھی پیٹ کا ہلکا ہونے کا ثبوت دیا تو میری بنی بنائی ساکھ جس کی بنیاد میں نے لاکھوں روپے کی رقم سے

بحالت مجبوری ہاتھ دھو کر رکھی تھی، وہ کسی ریت کے محل کی طرح مسمار ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے اس بات پر بھی تشویش لاحق تھی کہ جب ان کے ساز و سامان سے کوئی قابل گرفت شے برآمد نہیں ہوئی تھی تو پھر پچاس ہزار کی رقم بطور نذرانہ میری خدمت میں کس کھاتے سے پیش کی جا رہی تھی۔ میرے لئے وہ ایک سنہری موقع تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں، میری جھٹھی جس بار بار یہ کہہ رہی تھی کہ کہیں نہ کہیں کوئی گھپلا ضرور ہے۔ چنانچہ میں نے لیڈی سرچہ کو بلا کر ان سب کو اس کے حوالے کیا اور تفصیلی معائنہ کرنے کی ہدایت کی تو وہ ”تمام کھاتے“ کھل کر سامنے آ گئے، جہاں سونے کو بڑی بے جگری اور دیدہ دلیری سے مخفی کیا گیا تھا۔ (اس کیس کی تفصیل پاکستان کے تمام بڑے بڑے اخبارات میں شائع ہوئی تھی) اس کیس نے جہاں اسمگلروں کو ”ایک نئی راہ“ دکھائی، وہاں لوگ انگشت بدنداں بھی رہ گئے۔ ان پانچ مہ جبینوں کے ساتھ میری اور لیڈی سرچہ کی تصویریں بھی شائع ہوئیں تو نہ صرف یہ کہ بڑے بڑے اعلیٰ افسران نے میری حیرت انگیز کارکردگی کو سراہا، بلکہ انعام و اکرام سے بھی نوازا گیا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی، اس لئے کہ اس کیس کی وجہ سے میں نے جو شہرت حاصل کی تھی، اس نے میرے اوپر ایمانداری کی ایسی چھاپ لگا دی تھی، جس کی بدولت مالی غنیمت کی راہیں بھی ہموار ہو گئی تھیں۔ اگر کبھی میری کوئی شکایت اوپر والوں کو موصول ہوتی تو اسے کسی انکوائری کے بغیر ہی ”انتقامی جذبہ“ کے تحت داخل دفتر کر دیا جاتا۔ جس روز میں نے وہ تاریخی کیس پکڑا تھا، اس کے تیسرے دن ایک بار پھر مجھے اسٹنٹ کلکٹر نے اپنے کمرے میں طلب کیا۔ میں فخر سے سینہ تان کر اس کے دفتر میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر خوشی کے بجائے پشیمانی کے تاثرات دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے مجھے اشارے سے بیٹھنے کو کہا، پھر خود اٹھ کر کمرے میں کسی زخمی شیر کے مانند ٹپٹنے لگا۔ میں ابھی اس تغیر پر حیران ہو رہا تھا کہ اس نے تیزی سے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور بڑے سرد اور خشک لہجے میں مخاطب ہوا۔

”مسٹر اختر! آپ جانتے ہیں کہ میں نے اس وقت آپ کو کس مقصد سے بلایا ہے؟“

”جی نہیں۔“ میں نے بڑی حیرت بھری سنجیدگی سے جواب دیا۔

”آپ اگر میرے عزیز دوست کے سالے نہ ہوتے تو اس وقت کہیں اور ہوتے۔“ اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اسے اپنے غصے پر قابو پانے میں خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔

”میں سمجھا نہیں سر؟“ میں نے سادگی سے دریافت کیا۔

”میں اگر چاہتا تو وہ سونا جو آپ نے پانچ خواتین کے جسم سے برآمد کیا ہے، وہ پتیل بھی ثابت ہو سکتا تھا۔“ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔ ”لیڈی سرچہ میرے اشارے کے بعد وہی بیان دیتی، جو میں چاہتا اور اس کے بعد..... آپ کی کیا پوزیشن ہوتی؟ آپ پر عیاشی اور



شریف عورتوں کے ساتھ لیڈی سرچر کو زبردستی ساتھ ملا کر دست درازی کا الزام بھی عائد کیا جا سکتا تھا۔ وقتی طور پر آپ کو سسپنڈ (Suspend) کر دیا جاتا، پھر انکوائری ہوتی اور آپ..... آپ ملازمت سے برطرف بھی کئے جاسکتے تھے۔“

”لیکن سر.....!“

”شٹ اپ.....!“ وہ تلملا کر بولا، پھر کسی حد تک خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”آئندہ اس قسم کے کیسز میں مجھ سے مشورہ لئے بغیر قانونی دستاویز بنانے میں جلد بازی کے مظاہرے سے پرہیز کیجئے گا، ورنہ آپ کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ اب آپ جاسکتے ہیں۔“

میں خاموشی سے اٹھا اور اسٹنٹ کلکٹر کے کمرے سے باہر آ گیا۔ میں اب اتنا نا تجربہ کار بھی نہیں تھا کہ اس کی باتوں کا مقصد نہ سمجھ پاتا۔ یا تو وہ اس کیس کو کسی بڑی رقم کے عوض چھوڑنے کا خواہش مند تھا، یا پھر کسی نہ کسی زاویے سے اس ناجائز تجارت میں برابر کا شریک کار بھی تھا۔ بہر حال کچھ دنوں بعد مجھے اس کی برہمی کا سبب بھی معلوم ہو گیا۔ میں نے جن پانچ خواتین کو قانون کے حوالے کیا تھا، ان میں سے ایک اُس کی منظور نظر بھی تھی۔

مجھے علم تھا کہ اگر زہریلے ناگوں کے جوڑے میں سے کسی ایک کو ختم کر دیا جائے تو دشمن کا کس دوسرے کی نگاہوں میں محفوظ ہو جاتا ہے اور وہ اپنا انتقام لئے بغیر نہیں رہتا۔ حالات کے پیش نظر مجھے اسٹنٹ کلکٹر سے بھی کچھ ایسا ہی خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے فوری طور پر جوڑ توڑ لگا کر عدالت سے ان عورتوں کو سزا دلوائی، پھر ضبط شدہ سونا مال خانے میں جمع کرانے کے بعد میڈیکل گراؤنڈ پر چھٹی پر پڑا گیا اور دو ماہ کی چھٹی گزارنے کے بعد میں نے اپنی پوسٹنگ بھی کورنگی کریک کی چیک پوسٹ پر کرائی، جہاں عام حالات میں کوئی جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن میں خوش تھا کہ وقتی طور پر ہی سہی، لیکن مجھے اس اسٹنٹ کلکٹر (خدا اس کی مغفرت کرے) سے نجات مل گئی تھی، جس کی صورت کسی ناگ ہی کی طرح میرا تعاقب کرتی محسوس ہوتی تھی۔

وہ لوگ جو کورنگی کریک پر تعینات رہ چکے ہیں، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ وہاں کا ماحول کس قدر اذیت ناک ہے اور کس طرح گھر سے دُوری اور تنہائی کا احساس بن کر ان کے دجود کو دن میں متعدد بار دستار رہتا ہے۔ کورنگی کی چیک پوسٹ مجھیروں کی بستی سے تھوڑے فاصلے پر دو کچے کچے کمروں پر مشتمل تھی، وہاں میرے علاوہ کچھ سپاہی بھی تعینات تھے اور مجھیروں کی بستی کی مریم نامی ایک بوڑھی عورت جو حقیقت میں مریم ہی جیسی نیک اور پاک دامن تھی، روز آ کر میرا ناشتہ اور کھانا تیار کر دیتی تھی۔ مجھ سے پہلے جو افسران وہاں تعینات رہ چکے تھے، ان کی بھی خدمت وہی کرتی تھی۔ میں اس مچھلی کا مزہ آج تک نہیں بھولا، جسے مریم مسالا لگا کر اُلٹے

توے میں بغیر کسی گھی یا تیل کے گلا کر بناتی تھی۔ اس کا ذائقہ ہی کچھ اور ہوتا تھا۔

لیکن مریم کی شرافت اور پاک دامنی کے باوجود مجھے ایک اندیشہ لگ رہا تھا کہ وہ کسی دن اپنے قبیلے والوں کے اُکسانے پر مجھے کوئی ایسی خوراک نہ کھلا دے، جو میری موت یا عارضی بے ہوشی کا سبب بن جائے۔ اس لئے کہ مریم کا تعلق بہر حال، ان مجھیروں سے تھا، جو مچھلی پکڑنے کی آڑ لے کر ہر قسم کی ناجائز تجارت کا دھندا کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔ چیک پوسٹ پر جو افسر بھی تعینات ہوتا تھا، وہ اس کے ساتھ بظاہر بڑی محبت سے پیش آتے تھے، لیکن انہیں یہ بات گوارا نہیں تھی کہ قانون کے کچھ محافظ دن رات ان کی بستی میں رہیں اور ان کی چھاتیوں پر مونگ دلتے رہیں۔ اس لئے ان کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ ہر نئے افسر کو جلد از جلد دولت کی چمک دکھا کر رام کر لیں۔ وہاں جو سپاہی تعینات ہوتے تھے، وہ کھلی فضا میں سانس لینے کے عادی تھے، اس لئے مجھیروں سے اندر ہی اندر ساز باز کر لیتے تھے اور ناجائز تجارت والوں کے لئے خبری کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ تعیناتی کے کچھ دن بعد ہی مجھے اس بات کا علم ہو گیا کہ میرا ایک سپاہی رحیم بخش مجھیروں کا خاص آدمی ہے اور انہیں ایک ایک بات سے باخبر کرتا رہتا ہے۔ میں نے اُسے متعدد بار بستی کے سردار خدا بخش کے ساتھ بھی دیکھا تھا، جو اسمگلروں کا سرغنہ تھا۔ بظاہر وہ مجھے دُور ہی سے دیکھ کر سلام کے لئے ہاتھ اٹھا دیا کرتا تھا، مگر میں اپنے دوسرے ساتھیوں کی زبانی سن چکا تھا کہ خدا بخش اوپر سے جس قدر معصوم، بھولا بھالا، شریف اور ملنسار نظر آتا تھا، اندر سے اتنا ہی مکار، عیار، شاطر اور زہریلا بھی تھا۔

بیس پچیس روز تک میں خاموشی سے حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ اس عرصے میں میرا بینک بیلنس بھی، جو میں نے ایک فرضی نام سے کھول رکھا تھا، کم ہونے لگا تھا (جو مجھے منظور نہیں تھا) چنانچہ خود کو ماحول سے ایڈجسٹ کرنے کی خاطر میں نے ایک دن جب باقی سپاہی روزمرہ کی گشت پر گئے ہوئے تھے اور رحیم بخش تنہا چیک پوسٹ پر میرے ساتھ تھا، اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ حسب معمول اس نے میرے سامنے پینچ کر فوجوں جیسے انداز میں سیلوٹ کیا اور اینٹنشن پوزیشن میں کھڑا ہو گیا۔ تھری ناٹ تھری کو اس نے اُلٹے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔

”رحیم بخش!“ میں نے اسے دوستانہ انداز میں مخاطب کیا۔ ”آخر میں روز روز یہ مچھلی کھا کر کیسے گزارا کروں گا؟ اب تو مچھلی کے نام ہی سے میری طبیعت اُکٹانے لگتی ہے۔“

”آپ صرف اشارہ کریں، صاحب بہادر! مرغ مسلم اور کسی جان دار بکرے کی ران کی تہی کا انتظام بھی ہو سکتا ہے۔“ رحیم بخش نے جواب دیا۔

”لیکن یہ چیزیں کھا کر تو جسم میں گرمی کا احساس اور شدت اختیار کر لیتا ہے اور یہاں شہر سے اتنی دُور مجھیروں کی بستی میں.....“ میں نے جان بوجھ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں رحیم بخش کی فراست کو ٹٹولنا چاہتا تھا۔

”میں تو ان پڑھ اور اجڑ آدمی ہوں، صاحب بہادر! لیکن آپ نے تو گدڑی میں لعل والی بات ضرور سنی ہوگی۔“ رحیم بخش نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ وہ میرا اشارہ سمجھ چکا تھا، اس لئے ڈھکے چھپے لفظوں میں بولا۔ ”اور مارا، پستی، جیوانی اور گوار کی بندرگاہیں بھی بڑی خشک سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن وہاں ہر قسم کا اور ایک سے ایک بڑھیا مال ملتا ہے۔“

”یہ خدا بخش کیسا آدمی ہے؟“ میں نے گفتگو کو موڑ دیتے ہوئے سوال کیا۔

”بہت چلتا پڑھتا ہے، مگر یاروں کا یار بھی ہے۔“ رحیم بخش کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”مجھ سے پہلے یہاں جو افسر تعینات تھا، اس کے اور خدا بخش کے تعلقات کیسے تھے؟“

”شروع میں ٹھیک ہی تھے، لیکن ایک دو مہینے بعد دونوں میں خاصی دوستی پیدا ہو گئی تھی۔“ رحیم بخش نے کہا۔ ”خدا بخش یہاں کا سردار ہے، اس لئے بستی کا کوئی بچہ بھی اس کے اشارے کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھا سکتا۔“

”میں نے سنا ہے کہ وہ اسفلنگ بھی کرتا ہے۔“

”ضرور کرتا ہوگا، صاحب بہادر! لیکن ابھی تک پکڑا نہیں جاسکا، ہمیشہ بام مچھلی کی طرح قانون کے ہاتھوں میں آتے آتے پھسل کر بچ نکلتا ہے۔“

”رحیم بخش! ایک بات پوچھوں.....؟“ میں نے قدرے بے تکلفی سے کہا۔ ”سچ بچ بتاؤ گے؟“

”پوچھئے سر! میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔“

”کیا خدا بخش تم لوگوں کو کوئی بھتہ وغیرہ بھی دیتا ہے؟“

رحیم بخش نے میرے سوال کا فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا، پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”کوئی بھتہ مقرر نہیں سر! البتہ وہ کبھی کبھار ہمیں چائے پانی کا خرچہ دیتا رہتا ہے۔“

”کیا وہ تمہارے علاوہ اور سپاہیوں کا بھی اتنا ہی خیال رکھتا ہے؟“

”جی ہاں۔“

”رحیم بخش!“ میں نے اس بار ٹھوس لہجہ میں کہا۔ ”تم مجھے کے پرانے آدمی ہو، اس لئے شاید تمہیں علم ہوگا کہ میرا تبادلہ یہاں کس وجہ سے ہوا ہے۔“

”سنا تھا کہ آپ نے کچھ لڑکیوں والے کیس میں اسٹنٹ کلکٹر کو ناراض کر دیا تھا۔“

”تم نے غلط نہیں سنا۔“ میں نے اس کی تائید کی، پھر تھوڑے وقفے کے بعد بولا۔ ”تالی صرف ایک ہاتھ سے نہیں جیتی۔ اس کے لئے ایک ہاتھ کو دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا پڑتا ہے، ورنہ بات بگڑ جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ میں جان بوجھ کر کسی کی جانب سے آنکھ بند کر لوں اور وہ اکیلا ہی میری چشم پوشی سے مال سیٹا رہے، میرا کوئی خیال نہ کرے گا تو پھر مجھے بھی اس

کے راستے میں روڑے اٹکانے کا حق ہوگا۔“

”آپ حکم دیں، صاحب بہادر! رحیم بخش ویسا ہی کرے گا، جیسا آپ چاہیں گے۔“

”خدا بخش کیا کرتا ہے، کن لوگوں کے ساتھ مل کر قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے، مجھے اس کی مکمل تفصیل معلوم ہے۔“ میں نے رحیم بخش کو مرعوب کرنے کی خاطر ہوا میں تیر چھوڑا۔ ”میں چاہوں تو ان افراد کا تبادلہ بھی کہیں اور کر سکتا ہوں یا انتہائی رازداری سے بڑے افسروں کو اعتماد میں لے کر اچانک نئی نفری کے ساتھ خدا بخش اور اس کے ساتھیوں کو بے نقاب بھی کر سکتا ہوں۔ میں یہاں اپنی بیوی بچوں سے اتنی دور محض آنکھ بند کر کے اور لمبی تان کر سونے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ مجھے ایسے جال بٹنے بھی آتے ہیں، جس میں پھنس کر کوئی بام مچھلی تڑپ تو سکتی ہے لیکن پھسل کر اس کے شکنجے سے نہیں نکل سکتی۔“

”میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں، جناب!“ رحیم بخش نے مدھم آواز میں جواب دیا۔ ”خدا بخش کے بارے میں، میں نے کہا بھی تھا کہ وہ یاروں کا یار ہے، اس کی اتنی جرأت کبھی نہیں ہو سکتی کہ آپ کے کسی حکم سے انکار کر دے۔ آپ جیسا حکم دیں گے، جس طرح چاہیں گے، اسی طرح سب کچھ ہوگا۔“

جس روز میں نے رحیم بخش کو کریدا تھا، اس کے دو روز بعد ہی خدا بخش میرے دفتر میں موجود تھا۔ میں اس کی آمد کا مقصد پہلی ہی نظر میں بھانپ چکا تھا، لیکن جان بوجھ کر بے پروائی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”اور سناؤ، خدا بخش! آج ادھر کا راستہ کیسے بھول گئے؟“

”بس جی، آپ کو سلام کرنے کی غرض سے حاضر ہوا تھا۔“ اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

”بیس پچیس روز بعد تمہیں اچانک یہ سلام کرنے کا خیال کس طرح آ گیا؟“ میں نے چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

”جب تک کوئی ذریعہ نہ ہو صاحب جی! اس وقت تک اپنی طرف سے پہل کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ایسا کرنے سے بات بگڑ بھی جاتی ہے۔“

”خاصے سمجھ دار معلوم ہوتے ہو۔“ میں معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

”آپ کا تابعدار ہوں جی۔“ اس نے بڑی خوب صورتی سے اپنے مطلب کی طرف آتے ہوئے جواب دیا۔ ”دریا میں رہ کر مگر مجھ سے بیر کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ ہمارا اور آپ کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔“

”پہلے والے افسر کی تم کیا خدمت کرتے تھے؟“ میں نے کھل کر دریافت کیا۔

”یہ تو اپنے اپنے تعلق کی بات ہے، جناب! اس کے علاوہ خدا بخش ایک کی بات

پیٹ بھی بھرتا ہوں۔“

خدا بخش نے فوراً ہی جواب نہیں دیا، خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ پھر اچانک اس کی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک پیدا ہوئی۔ ایسی چمک، جو شکار کو قریب دیکھ کر ناگ یا ناگن کی آنکھوں میں پیدا ہوتی ہے۔

”آپ کا کام ہو جائے گا، جناب!“ وہ بڑی رازداری سے بولا۔ ”لیکن یہ بات صرف آپ کے اور خدا بخش کے درمیان رہے گی۔ رحیم بخش یا کسی اور کو بھی نہیں معلوم ہونی چاہئے۔ اشارہ کرنا میرا کام ہوگا، کامیابی یا ناکامی آپ کے مقدر کی بات ہے۔ ویسے کام لمبا ہی ہوگا۔“

”کیا تمہارے کوئی اور بھی.....“

”دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، جناب!“ اس نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”آپ صرف خدا بخش کی زبان پر بھروسہ کیجئے۔ یاری دوستی کی خاطر میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہوں۔ ایسی شان دار کامیابی کہ آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ سال بھر تک کوئی افسر پلٹ کر کیس کی بات نہیں کرے گا۔“

”ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن وعدہ خلافی نہیں ہونی چاہئے۔“

”مجھے منظور ہے۔“

خدا بخش اٹھ کر چلا گیا تو میں نے بڑے سکون کا سانس لیا، پچیس ہزار روپے ماہوار کی بالائی آمدنی اس زمانے میں کورنگی کریک کی چیک پوسٹ کے لئے بڑی بات تھی۔ وہاں کے ریکارڈ کے مطابق دو تین سال میں بمشکل ایک دو چھوٹے موٹے کیس ہوتے تھے۔ میں بڑی سنجیدگی سے غور کر رہا تھا کہ اگر خدا بخش کے کئے ہوئے وعدے کے مطابق میں نے دو تین ماہ کے اندر کوئی بڑا کیس کر لیا تو میرے لئے وہ ایک بڑا اعزاز بھی ہوگا۔

بہر حال، خدا بخش نے پہلا مہینہ ختم ہوتے ہی مجھے بالائی رقم پیش کر دی، جسے میں نے نہیں بلکہ ایک قابل اعتماد اکرم نامی سپاہی نے موصول کیا اور میری ہدایت کے مطابق پہلی فرصت میں اسے وہاں پہنچا دیا، جہاں کے لئے میں نے اسے تاکید کی تھی۔ کورنگی کریک جو پہلے میرے لئے کسی ریگستان سے کم نہیں تھا، اب میرے لئے نخلستان بن چکا تھا۔ پہلے میں ہفتے میں کم از کم ایک بار گھر ضرور جاتا تھا، لیکن اب اس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ رحیم بخش میرے لئے گڈڑی کے محل فراہم کرنے لگا تھا۔ وہ بڑے کام کا آدمی ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی بدولت مجھے زندگی میں پہلی بار اس بات کا بڑا خوشگوار تجربہ ہوا تھا کہ جو مہک پسینے اور مچھلی کی بساند میں بسے ہوئے جسم میں ہوتی ہے، وہ ایوننگ ان پیرس میں بسے ہوئے ریشم و خواب میں لپٹے ہوئے نازک اندام جسموں میں کہاں۔ (یہ کہانی اسی زمانے کی ہے، جب

دوسرے سے کرنے کا عادی نہیں۔“ اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔ ”آج آپ یہاں ہیں، کل کوئی نیا افسر تبدیل ہو کر آ سکتا ہے۔ اگر میں ایک کی بات دوسرے کو بتانے لگوں تو میری ساکھ کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ میں تو بدنام ہوں، صاحب جی! لیکن اپنے ساتھ دوسروں کو بدنام کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔“

مجھے خدا بخش کا وہ جواب پسند آیا، چنانچہ میں نے دوسرا انداز اختیار کیا۔ ”ایک مہینے میں کتنے کاہیر پھیر کر لیتے ہو؟“

”اس کا انحصار تو سمندر کے اتار چڑھاؤ پر ہوتا ہے۔ کبھی کاروبار کو ایک دم چار چاند لگ جاتے ہیں اور کبھی اتنا مندا ہو جاتا ہے کہ کبھی بھی مارنے کو نہیں ملتی۔ ہاتھ پر ہاتھ دھڑے بیٹھا رہنا پڑتا ہے۔“

”پھر بھی، ایک پھیرے میں پچیس پچاس تو کما لیتے ہو گے۔“

”کم و بیش اس کے لگ بھگ کچھ ہو جاتا ہے۔“ خدا بخش نے کسی گھاگ آدمی کی طرح معنی خیز انداز میں کہا۔ ”کتبہ والوں کو کبھی تو ملا کر چلنا پڑتا ہے۔“

”مہینے میں کتنے چکر لگا لیتے ہو؟“

”کبھی دو، کبھی تین۔ اور مارکیٹ چڑھی ہو تو سیزن کے موقع پر چار پھیرے بھی جان پر کھیل کر لگانے پڑتے ہیں۔“ اس بار بھی خدا بخش نے بات گھما پھرا کر کی۔ ”مگر جب سمندر چڑھا ہوا ہو تو تین چار مہینے تک فاقے بھی کرنے پڑتے ہیں۔“

”پچیس نمبر کے بارے میں تمہارا کیا فیصلہ ہے؟“ میں نے مخصوص انداز میں اس سے پچیس ہزار روپے ماہوار کی بات کی۔

”میں زیادہ مول تول کرنے کا عادی نہیں ہوں، صاحب جی! اس لئے آپ کی بات مجھے منظور ہے۔ لیکن ایک شرط پر۔“

”وہ کیا؟“

”آپ کو میرا بھی خیال رکھنا ہوگا۔ میرا مطلب ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اندھیرے میں مارا جاؤں۔“ وہ میری نظروں میں نظریں ڈال کر بولا۔ ”میرا خیال ہے، آپ میری بات سمجھ رہے ہوں گے۔“

”اگر ایسی کوئی بات میرے علم میں آئی تو رحیم بخش کے ذریعے تمہیں باخبر کر دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“ میں نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”مگر تمہیں بھی میری ایک بات کا خیال رکھنا ہوگا۔“

”آپ کھل کر بات کریں صاحب جی! خدا بخش ہلکے پیٹ کا آدمی نہیں ہے۔“

”دو تین مہینے میں تمہیں بھی ایک دو چھوٹی بڑی کھیپ فراہم کرنی ہوگی تاکہ میں قانون کا

”ایونگ ان پیرس“ ہی کا پہلے اور اچھے سینٹ میں شمار ہوتا تھا)

دو تین مہینے اسی عیش و آرام میں گزر گئے۔ اب میرے اشارے پر خدا بخش یا اس کے ساتھی مجھے دنیا کی ہر آسائش مہیا کر دیا کرتے تھے۔ ایک روز رات کے کھانے کے بعد میں سونے کے ارادے سے جانے لگا تو سپاہی اکرم نے (جو خاص طور پر میری رہائش پر ناٹ ڈیوٹی گارڈ کے فرائض انجام دیتا تھا) مجھ سے دہی زبان میں کہا۔

”سر! وہ خدا بخش نے آج رات بارہ بجے آپ کو مشرقی گھاٹ پر ملنے کو کہا ہے۔“

مشرقی گھاٹ بڑی سنان اور ویران جگہ تھی، جہاں عام طور پر بستی کے افراد دن میں بھی جانے سے گریز کرتے تھے اور خدا بخش نے مجھے وہاں رات بارہ بجے ملنے کی خاطر کہا تھا۔ میرے ذہن میں مختلف دوسوے اور خطرے سر اُبھارنے لگے۔ بڑی دیر تک میں کسی بھی پیش آنے والے حادثے کے امکانات پر غور کرتا رہا، پھر اکرم سے دہی زبان میں پوچھا۔

”تمہارا کیا مشورہ ہے؟ کیا خدا بخش جیسے اسمگلر سے رات کے بارہ بجے مشرقی گھاٹ پر ملنا مناسب ہوگا؟“

”بندہ تو خطرناک ہے جناب! لیکن میرا خیال ہے کہ وہ آپ کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کرے گا۔ اور پھر میں بھی دُور دُور کر آپ کا خیال رکھوں گا۔“ اکرم نے بڑے یقین سے کہا۔

”اگر خدا خواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو میں بھی حساب چکانے میں دیر نہیں کروں گا۔“

بہت غور و خوض کے بعد میں نے خدا بخش سے ملنے کا ارادہ طے کر لیا۔ رات کے ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے میں اپنے بچاؤ کی خاطر تمام کیل کانٹے سے لیس ہو کر پچھلے دروازے سے باہر نکلا اور مشرقی گھاٹ کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ میں اکرم کو چونکہ اپنے پروگرام سے مطلع کر چکا تھا، اس لئے مجھے قوی امید تھی کہ وہ کہیں آس پاس سے میری نگرانی کا کام انجام دیتا ہو اور میرے پیچھے پیچھے آ رہا ہوگا۔

جس وقت میں مشرقی گھاٹ پہنچا اس وقت بارہ بجتے میں کوئی چھ سات منٹ باقی تھے۔ میں بوئیں گھاٹ کے کنارے گیلی ریت پر چھل قدمی کرنے لگا۔ لیکن میں اس بات سے بھی انکار نہیں کروں گا کہ اس وقت میرے دل کی دھڑکنوں کی کیفیت دگرگوں ہو رہی تھی۔ پھر ٹھیک بارہ بجے گھاٹ کے قریب سے ایک انسانی ہیولا، جو غالباً وہاں پہلے سے موجود تھا، اُبھر کر سامنے آ گیا۔ میں نے جیب میں موجود پستول پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ میں اپنی جگہ رک کر اس سائے کو دیکھنے لگا، جو تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میری جانب بڑھ رہا تھا۔ اس وقت دُور دُور تک کسی آدمی یا آدم زاد کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اکرم میرے کہیں قریب آس پاس موجود تھا بھی یا نہیں، مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ بہر حال، جب انسانی ہیولا میرے قریب پہنچا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ خدا بخش ہی تھا، جس نے کسی خاص مصلحت کی بنا پر اپنے چہرے کو

پوری طرح چادر میں چھپا رکھا تھا، صرف اس کی آنکھیں نظر آرہی تھیں۔

”صاحب جی!“ خدا بخش نے بڑی مدہم آواز میں پوچھا۔ ”اکرم کے سوا کسی اور نے تو

آپ کو یہاں آتے نہیں دیکھا؟“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔ پھر بولا۔ ”مگر تم نے اتنی رات گئے مجھے کس مقصد سے بلایا ہے؟“

”اپنا ایک وعدہ پورا کرنے کی خاطر۔“

”وہ کیا؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

”آج منگل ہے۔“ خدا بخش نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے سرسراتے لہجے میں کہنا

شروع کیا۔ ”جمعات کو دن کے گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان ”فشرزنگ“ نامی لالچ آپ

کے دفتر کے سامنے والے ساحل پر آئے گی۔ بس آپ کو اُسے اُٹھل پھل کرنا ہے۔“

”فشرزنگ۔“ میں نے اس نام کو دہرایا۔ ”اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو یہ لالچ بشیر ناخدا

کی ملکیت ہے، جو رشتے میں تمہارا سالا بھی لگتا ہے۔“

”آپ کا اندازہ ٹھیک ہے جناب! لیکن وہ میرا سگا سالا نہیں لگتا، بس دُور پرے کی

رشتے داری ضرور ہے۔“

”اس لالچ میں کیا ہوگا؟“ میں نے اگلا سوال کیا۔

”پندرہ بیس لاکھ روپے کا ناجائز سامان ہوگا۔“ خدا بخش نے کہا۔ ”اتنا بڑا کیس ہے کہ

آپ کی قسمت چمک اُٹھے گی، صاحب جی!“

”اور بشیر ناخدا اسے میرے دفتر کے سامنے ساحل پر اتارنے کی حماقت کرے گا۔“ میں

نے حیرت کا اظہار کیا۔

”اسی کو تو ہماری زبان میں آنکھ مچولی کہتے ہیں۔“ خدا بخش نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”سب کچھ قانون کی نگاہوں کے سامنے اس قدر صفائی سے ہو جائے کہ قانون اس پر شک کی

گنجائش بھی نہ کر سکے۔“

”سامان کس قسم کا ہوگا؟“

”یہ میں نہیں بتاؤں گا، صاحب جی! تاکہ قسم کھانے کی گنجائش رہے۔“ خدا بخش نے

بڑی صاف گوئی سے جواب دیا۔ ”میں نے آپ کو خبری کر دی ہے، اب ذہانت سے کام لے

کر لالچ کا پوسٹ مارٹم کرنا آپ کا کام ہے۔“

”لیکن.....“

”سائنس کے ساتھ ساتھ اب دنیا میں ناجائز تجارت کا دھندا بھی ترقی کر رہا ہے۔“ خدا

بخش نے میرا جملہ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر آپ

کامیاب ہو گئے تو پھر پورے محکمے میں بس آپ ہی آپ کی دھوم ہوگی۔ اور اب میں چلتا ہوں۔ اگر کسی کو میری ذات پر شبہ بھی ہو گیا تو وہ مجھے اس غداری پر زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ساری سرداری دوسرے راستے سے نکل جائے گی۔“

پھر اس سے پیشتر کہ میں مزید کچھ کہتا، خدا بخش تیز تیز قدم اٹھاتا تاریکی میں گم ہو گیا۔ اس کے کچھ دیر بعد میں بھی واپس چیک پوسٹ پر پلٹ آیا۔ وہ رات میں نے جاگ کر گزاری تھی۔ خدا بخش نے جو خبری کی تھی، وہ میرے لئے کسی معصے سے کم نہیں تھی۔ اس کے علاوہ فشرز کنگ کا شمار بھی بڑی لائچوں میں ہوتا تھا، جس کا ایک ایک بخیہ اڈھیڑنا کچھ اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ بدھ کے روز بھی میں تمام دن فشرز کنگ پر چھاپے کے بارے میں مختلف پلان بناتا رہا۔ میرے ساتھ پولیس کی جو فری چیک پوسٹ پر تعینات تھی، اس کی تعداد اوّل تو اتنی کافی نہیں تھی کہ میں بشیر ناخدا اور اس کے ساتھیوں کو قابو کر سکتا، دوئم کہ مجھے سوائے اکرم نامی سپاہی کے، اور کسی پر اعتماد نہیں تھا۔

بہر حال، بدھ کے روز میں نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ میں گھر جا رہا ہوں اور رات گئے تک لوٹ آؤں گا۔ یہ دراصل ایک طرح کا بہانہ تھا۔ ورنہ چیک پوسٹ چھوڑنے کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ وہاں سے روانہ ہو کر میں سیدھا اپنے سپرنٹنڈنٹ کی رہائش گاہ پر پہنچا اور اس سے مزید با اعتماد فری مہیا کرنے کی درخواست کی اور یہ بھی کہا کہ اس نفری کو پہلے سے ہدایت کر دی جائے کہ وہ سادہ لباس میں بھیس بدل کر چھپروں کی بستی میں وقت مقررہ سے کچھ دیر پہلے اس طرح پہنچے کہ کانوں کان کسی کو اس کی بھنگ بھی نہ مل سکے۔ سپرنٹنڈنٹ کے استفسار پر میں نے اسے فشرز کنگ کے بارے میں صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ اس کے بارے میں مجھے میرے ایک قابل اعتماد مخبر نے اطلاع دی ہے کہ وہ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ لاکھوں کا مال اسمگل کر کے درآمد کرنے کی کوشش کریں گے۔ مال کے بارے میں چونکہ مجھے بھی کچھ اطلاع نہیں تھی، اس لئے میں نے اس سلسلے میں سپرنٹنڈنٹ کو بھی بس گول مول جواب دیا۔ سپرنٹنڈنٹ چونکہ شریف آدمی تھا، اس لئے اس نے بغیر کسی چھان بین کے وعدہ کر لیا کہ وہ سپاہیوں اور دو ایک افسروں کی ٹیم کے ساتھ خود بھی موقع واردات پر پہنچنے کی کوشش کرے گا اور صرف حالات خراب ہونے کی صورت میں اچانک سامنے آئے گا۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ میں سپرنٹنڈنٹ سے مل کر اسی رات گیارہ بجے واپس اپنی چیک پوسٹ پر پہنچ گیا۔ حسب معمول اس وقت بھی میری رہائش گاہ پر جو آفس کے ساتھ تھی، سپاہی اکرم تعینات تھا۔ میں نے اسے نصف شب گزر جانے کے بعد آواز دی۔ وہ میری پہلی ہی آواز سن کر کمرے میں آ گیا۔ میں نیند نہ آنے کا بہانہ کر کے کچھ دیر تک اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا، پھر سرسری طور پر پوچھا۔

”کیا چھپروں کی بستی میں خدا بخش کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ناجائز تجارت کے کام میں ملوث ہیں؟“

”ان کی گزر بسر ہی ناجائز تجارت پر ہوتی ہے۔ لیکن وہ لمبا ہاتھ مارنے کے عادی نہیں ہیں۔“ اکرم نے جواب دیا۔ ”بس یوں سمجھ لیجئے سرکار! کہ جو غذا شیر چیتوں کے شکار سے بچ جاتی ہے، یہ اسی پر گزارا کرتے ہیں۔“

”خدا بخش کے علاوہ دوسرا بڑا اسمگلر کون ہو سکتا ہے؟“

”بشیر ناخدا۔“ اکرم نے دہی زبان سے کہا۔ ”خدا بخش اور وہ دونوں آپس میں رشتے دار بھی ہیں۔ لیکن دونوں کے درمیان اکثر ٹھنسی رہتی ہے۔ مگر معاملہ آج تک آگے نہیں گیا۔ جب بھی ان دونوں میں جھج جھج ہوتی ہے، بستی کے بزرگ ان دونوں میں صلح صفائی کرا دیتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا، لیکن سنا ضرور ہے کہ بشیر ناخدا روز روز خوروں سے کھیلنے کا عادی نہیں ہے، تین چار مہینے میں صرف ایک لمبا ہاتھ مارتا ہے اور پھر آرام سے بیٹھ کر کھاتا ہے۔“

”رجیم بخش کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا وہ خدا بخش کے علاوہ بشیر ناخدا سے بھی گٹھ جوڑ رکھتا ہے؟“

”وہ میرا سنگی سا بھی ضرور ہے، سرکار! لیکن ہے بڑا لالچی۔ ہزار پانچ سو تو بڑی بات ہے، سو دو سو میں بھی پک جاتا ہے۔“

”مجھ سے پہلے جو افسر یہاں تعینات تھا، کیا اس کے تعلقات خدا بخش اور بشیر ناخدا دونوں سے تھے؟“

”آپ بھی افسر ہیں جناب! جس طرح چاہے کر سکتے ہیں۔“ اس بار اکرم نے درپردہ مجھے میری ایک غلطی کا احساس دلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آپ سے پہلے جو افسر تھے، وہ کبھی بستی کے کسی فرد کو بھی قریب نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔ جو کچھ لین دین کا معاملہ ہوتا تھا، وہ رجیم بخش کے ذریعے ہی ہوتا تھا۔“

”تمہارا اشارہ غالباً خدا بخش سے میری ملاقات کی طرف ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھ سے کوئی گستاخی سرزد ہوئی ہو تو معاف کر دیجئے گا سر! لیکن میں پھر یہی کہوں گا کہ آپ نے خدا بخش سے ملاقات کر کے اچھا نہیں کیا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اسے ٹالنے کی خاطر کہا۔ ”تم جا کر ڈیوٹی دو، میں پھر کسی وقت تمہاری بات پر غور کروں گا۔“

عام طور سے یہ ہوتا تھا کہ صبح دس بجے حاضری لگانے کے بعد دو سپاہیوں کے علاوہ باقی ساحل کی نگرانی کے لئے چلے جاتے تھے۔ لیکن جمعرات کے دن میں نے انہیں کہیں جانے

جب تک میں اجازت نہ دوں، کوئی لالچ سے نیچے نہ اترے۔“

بشیر ناخدا نے عجیب معنی خیز مسکراہٹ سے مجھے یوں دیکھا، جیسے میری حماقت کا احساس دلانا چاہتا ہو۔ پھر اس نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کر دی کہ کوئی بغیر حکم کے نیچے نہ اترے میری پوسٹنگ کے بعد چونکہ یہ دوسرا موقع تھا جب میں بذات خود کسی لالچ کو چیک کر رہا تھا۔ اس لئے ساحل پر بستی کے مرد اور عورتوں، بچوں کی خاصی تعداد تماشا دیکھنے کھڑی ہو گئی تھی۔ میں اکرم اور دو سپاہیوں کے ساتھ لالچ پر چلا گیا۔ باقی نفری کو میں نے نیچے محتاط رہنے کی تاکید کر دی تھی۔ ہر چند کہ دو سپاہیوں کا پوری لالچ کی تلاشی لینا خاصا دشوار تھا۔ لیکن اول تو میں بشیر ناخدا پر صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ ضابطہ کی خانہ پُری کے لئے محض سرسری چیکنگ ہے، دوسرے یہ کہ اس طرح میں اس کے چہرے پر مرتب ہونے والے تاثرات بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے اشارے پر اکرم اور دوسرے سپاہیوں نے بڑی مہارت کے ساتھ تلاشی شروع کر دی۔ میں ایک جانب بشیر ناخدا کے ساتھ کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ خدا بخش نے (میرے ساتھ دوستی ہو جانے کے بعد) مجھ سے جھوٹی خبری نہ کی ہوگی۔ لیکن یہ بھی حیرت تھی کہ خدا بخش نے نہ تو مال کی بابت کوئی نشان دہی کی تھی، نہ ہی یہ بتایا تھا کہ وہ مال کہاں سے برآمد ہو سکتا ہے، جس کی مالیت پندرہ بیس لاکھ بتائی گئی تھی۔ بظاہر مجھے وہاں سوائے بڑے بڑے جھینگوں کے اور کوئی شے نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے سرسری طور پر لالچ کے کین کو بھی دیکھا، لیکن مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ اب صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی کہ جھینگوں کو ان لوڈ کرانے کے بعد لالچ کے فرش کے تختوں کے نیچے کی تلاشی لی جائے، جہاں خاص طور سے دہرے فرش بنے ہوتے ہیں اور مال ان دونوں فرش کے درمیان چھپایا جاتا تھا۔ میں ابھی ان تمام پہلوؤں پر غور کر رہا تھا کہ بشیر ناخدا نے لالچ کے کین کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے اس شخص کی طرف اشارہ کیا، جو جوان ہونے کے باوجود کچھ بیمار بیمار سا نظر آ رہا تھا۔ اس کی میلی چلی شلوار پر داہنی جانب خون کے کچھ جے ہوئے داغ دے بھی موجود تھے۔

”یہ میرے ماما کا بیٹا ہے، جناب! راستے میں ایک حادثے سے دوچار ہو کر سخت مڑھال ہو گیا ہے۔ زخم خاصا گہرا آیا تھا، اس لئے میں نے اس کے چار پانچ ٹانگے لگا دیئے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو اسے جانے دوں۔ ماما فوری طور پر شہر لے جا کر کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا دے گا، ورنہ زہر باد بھی ہونے کا خطرہ ہے۔“

”کیا تم فرسٹ ایڈ کا کام بھی جانتے ہو؟“

”مجبوری سب کچھ سکھا دیتی ہے، جناب!“ وہ شانے اچکا کر بولا۔ ”اب ہر وقت کوئی ڈاکٹر تو ساتھ نہیں رکھا جاسکتا۔ ویسے پھوٹے موٹے زخموں اور بیماریوں کے لئے ہم خود ہی

سے روک دیا اور قدرے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

”تم لوگ روز گشت لگاتے ہو، حیلکن ابھی تک کوئی کیس بھی نہیں ہوا۔ اب میں خود تمہارے ساتھ گشت پر چلا کروں گا۔“

کسی نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ سب خاموشی سے سر جھکائے کھڑے رہے۔ میں جان بوجھ کر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ان کے کام پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتا رہا۔ اس وقت میں باہر دھوپ میں کھلے آسمان کے نیچے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس سے پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا تھا، اس لئے کسی کو اس بات کا شک نہیں ہوا کہ اس روز میں باہر کیوں بیٹھا تھا۔ میری نگاہیں بار بار ساحل کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ ٹھیک سوا گیارہ بجے جب فشرز کنگ ساحل کی طرف آ رہی تھیں تو میں نے جان بوجھ کر جیم بخش سے پوچھا۔

”یہ کس کی لالچ ہے؟“

”بشیر ناخدا کی جناب!“ جیم بخش نے بڑی بے پروائی سے کہا۔ ”وہ خاص طور پر جھینگوں کا کاروبار کرتا ہے، اس لئے کئی کئی دنوں تک کھلے سمندر میں شکار کرتا ہے۔ جھینگو بیرون ملک بھیجنے والے زیادہ تر بشیر ناخدا ہی سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔“

”کہیں جھینگو کی آڑ میں کوئی اور شکار تو نہیں کھیلا جاتا؟“ میں نے چپستے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”پہلے تم نے کبھی اس کی لالچ چیک کرنے کی کوشش کی ہے؟“

”کئی بار ہم اس کی تلاشی لے چکے ہیں، جناب! لیکن سوائے بڑے جھینگوں کی بڑی کھپ کے اور کوئی ناجائز چیز برآمد نہیں ہوئی۔“ اس بار بھی جیم بخش نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، آج ذرا میں بھی اپنا اطمینان کئے لیتا ہوں۔“

”جیسی آپ کی مرضی جناب!“

میں خاموشی سے فشرز کنگ کی جانب دیکھتا رہا۔ پھر جیسے ہی وہ کنارے پر پہنچ کر لنگر انداز ہوئی، میں سپاہیوں کو ساتھ آنے کا اشارہ کر کے اس کے قریب پہنچ گیا۔ سب سے پہلے جو شخص فشرز کنگ سے نیچے اتر ا وہ بشیر ناخدا ہی تھا۔

”سلام سرکار!“ اس نے مجھے دیکھ کر بڑی فرمانبرداری سے سلام کیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی یا گھبراہٹ کی کوئی علامت نہیں تھی۔

”تمہاری لالچ پر کس قسم کا سامان موجود ہے؟“ میں نے اُس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

”جھینگو ہیں سرکار!“ اس نے اس بار بھی بڑے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ چاہیں تو تلاشی لے کر اپنا اطمینان کر سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم میرے ساتھ آؤ اور اپنے آدمیوں کو ہدایت کر دو کہ

دوا دارو کر لیتے ہیں۔“

”اسے حادثہ کب پیش آیا تھا؟“ میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

”بس، صاحب بہادر! سب تقدیر کی بات ہے۔ پچھلی بار گیا تھا تو اسے سردی چڑھ کر اتنے زوروں کا بخار آیا تھا کہ ہم سب مایوس ہو گئے تھے، آدھے راستے سے واپس لوٹنا پڑا تھا۔ اس بار یہ مستول پر چڑھ کر کام کر رہا تھا کہ پاؤں رپٹ گیا، نیچے گرا تو داہنی ران میں ایک آنکڑا انک گیا۔ چار انچ گہرا زخم آیا تھا۔ بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ اگر ہم نے اُلٹے سیدھے ٹانگے لگا کر اور دیسی دوا دارو سے اس کا خون نہ بند کیا ہوتا تو اب تک اس کے آدھے جسم کا خون بہہ چکا ہوتا۔“

”اب تو اس کی حالت خاصی بہتر نظر آرہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”پھر بھی کسی ماہر سرجن کو دکھانا بہت ضروری ہے۔“

”اسی لئے تو آپ کی اجازت مانگ رہا ہوں۔“ بشیر ناخدا نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جہاں تک میری لالچ کا معاملہ ہے تو آپ بھلے دس بارہ آدمیوں کو اور بلا لیں، ایک تختہ اکھاڑ پچھاڑ کر اپنا اطمینان کر لیں، ایک چیز بھی غلط نکل آئے تو جو چور کی سزا، وہ میری۔“

بشیر ناخدا جس انداز میں گفتگو کر رہا تھا، اس میں اعتماد کی جھلک تھی۔ لیکن مجھے یہ خیال بھی لاحق تھا کہ خدا بخش نے جو مخبری کی ہے، وہ بھی غلط نہیں ہو سکتی۔ ویسے یہ بھی ممکن تھا کہ خدا بخش نے ایک مخصوص وقت میں میری توجہ فشرز کنگ کی جانب مبذول کر کے دوسری طرف سے اپنا کوئی لمبا مال کلیئر کر دیا ہو۔ لیکن یہ خیال دل کو نہیں لگتا تھا۔ اس لئے کہ وہ ہر ماہ جو مال غنیمت بطور نذرانہ پیش کرتا تھا، وہ ہیر پھیر کے بعد ہی کرتا تھا۔ پھر اسے بلا وجہ مجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ اچانک میرے ذہن میں خدا بخش کا ایک جملہ صدائے بازگشت بن کر گونجا۔ ”میں مال کے بارے میں کوئی بات نہیں بتاؤں گا تا کہ قسم کھانے کی گنجائش رہے۔ میں نے آپ کو مخبری کر دی، اب ذہانت سے کام لے کر لالچ کا پوسٹ مارٹم کرنا آپ کا کام ہے۔“ خدا بخش نے مال کی قیمت کا اندازہ بھی پندرہ بیس لاکھ لگایا تھا، جو کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اسے بیک جنبش قلم نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے کسی فوری خیال کے تحت بیمار نو جوان کی سمت معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بشیر ناخدا سے پوچھا۔

”مجھے تم سے ایک راز کی بات پوچھنی ہے۔ اگر کوئی آفیسر کسی اسٹیکر کا پندرہ بیس لاکھ کا سامان پکڑ لے تو بات کتنے پر طے ہو سکتی ہے؟“

میں نے محسوس کیا کہ پندرہ بیس لاکھ کا نام سن کر بشیر ناخدا کے چہرے پر بس ایک لمحے کو پریشانی کے اثرات نمایاں ہوئے، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ”یہ بات تو آپ کو وہی بتا سکتا ہے، جناب! جو اس قسم کے کام کرتا ہو۔ میں نے تو آج تک جھینگے

کے علاوہ کوئی دوسرا کاروبار نہیں کیا۔“

”پھر سوچ لو۔“ میں نے اُسے کریدنے کی خاطر اندھیرے میں آخری تیر پھینکا۔ ”ایک بار مال نچلے عملے کی نگاہوں میں آجائے تو پھر اس کے کئی حصے دار بن جاتے ہیں۔ اور ایسی صورت میں لین دین کی کوئی بات کرنا کم از کم میرے اصول کے خلاف ہے۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لئے ایک اور بات بتاؤں۔ میں نے آج تک کبھی کسی پر اوچھا ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔“

میرا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا، لیکن بشیر ناخدا نے ایک آخری کوشش اور کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا بندہ بہت تکلیف میں ہے۔ آپ اسے جانے دیں۔ اس کے بعد میں آپ سے باقی باتیں بھی طے کر لوں گا۔ ویسے جس نے مجھی آپ سے پندرہ بیس لاکھ کی بات کی ہے، وہ غلط کی ہے۔“

”پھر اصل مالیت کتنی ہے؟ تم ہی کھل کر بتا دو۔ قبل اس کے کہ میرے آدمی اصل جگہ تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کر لیں۔“

”زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ کا منافع ہو گا مجھے۔“ اس نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ سے آدھا سا جھکا کرنے کو تیار ہوں۔ آپ اپنے سپاہیوں کو بلا لیں۔“

”اور اگر میں تمہارا بندہ چھوڑنے سے پہلے معاملہ طے کرنا چاہوں، تو؟“ میں نے اپنے خیال کی مزید تصدیق کی خاطر بڑی سنجیدگی سے کہا۔

اس بار وہ کسی سمندر کے جھاگ ہی کی طرح بیٹھ گیا، پھر ایک دم بولی بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”تین لاکھ۔ اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔“

”اور اگر میں اصل مال کا نفی غفی کرنا چاہوں، تو؟“

”سوچ لیں آپ بھی۔“ اس نے بڑی دیدہ دلیری سے جواب دیا۔ ”اس مال میں بڑے بڑے افسروں کا حصہ بھی ہے، جنہیں آپ نہیں جانتے اور..... دریا میں رہ کر مگر مجھ سے پیر کرنا کچھ اچھا نہیں ہوتا۔“

”تم مجھے دھمکی دینے کی کوشش کر رہے ہو۔“ میں نے اسے خونخوار نظروں سے گھورا۔

”دھمکی نہیں جناب! وہ بات بتا رہا ہوں، جس میں ہم دونوں کا فائدہ ہے۔“

میں نے جواب دینے کے بجائے اپنے دونوں سپاہیوں کو اوپر بلایا، پھر اکرم سے حکمانہ لہجے میں بولا۔

”یہ جو شخص کبکین کے ساتھ لگا بیٹھا ہے، اسے اپنی تحویل میں لے لو۔ مجھے اس کا پوسٹ مارٹم کرانا ہے، صرف داہنی ٹانگ کا۔“

اکرم کو یہ حکم دیتے ہوئے میں نے جیب میں رکھا ہوا سرخ رومال نکال کر اسے پھیلا کر

نکل سکی۔ اس کمزوری میں شاید خوشی کا وہ احساس بھی شامل تھا، جو مال پکڑے جانے کی خبر سن کر مجھ پر بڑی شدت سے طاری ہوا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ نے میری کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

”میں تمہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ حکومت نے تمہیں فوری طور پر ڈبل اپ پروموشن دینے کے ساتھ ساتھ ایک لاکھ کے انعام کا حکم نامہ بھی جاری کر دیا ہے۔ تمہارے لئے ایک خوشخبری اور بھی ہے۔“

”وہ..... وہ کیا..... سس..... سرا“ میں نے بے شکل ہمت کر کے پوچھا۔  
 ”بشرِ ناخدا کے خلیفہ بیان کے بعد اس اسٹنٹ کلکٹر کو بھی فوری طور پر معطل کر دیا گیا ہے، جس سے ڈر کر تم نے چھٹی لی تھی۔“ سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ ”بشرِ ناخدا کا کہنا ہے کہ اسٹنٹ کلکٹر کے علاوہ محکمے کے کچھ اور بڑے افسروں کے ساتھ بھی اس کی سانجھ گانجھی، جن سے مل کر وہ لیے لیے ہاتھ مارا کرتا تھا۔ بہر حال تم نے جو کیس پکڑا ہے، وہ اپنی نوعیت کا پہلا کیس ہے۔ میں تمہیں دوبارہ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔“

مجھ پر ایک عجیب فرحت انگیزی کیفیت طاری تھی۔ میری آنکھیں مارے خوشی کے ڈبڈبا گئی تھیں۔ نرس نے میری کیفیت کا اندازہ لگایا تو جا کر ڈاکٹر کو بلا لائی، جس نے غالباً مجھے سکون بخشنے کی خاطر نیند کا انجکشن لگادیا تھا، جس کے کچھ دیر بعد میرا ذہن دوبارہ بتدریج تاریکی میں ڈوبنا چلا گیا۔

❖.....❖.....❖

اس واقعہ کو آج تقریباً اکتیس سال بیت چکے ہیں۔ میں اب ریٹائرڈ لائف گزار رہا ہوں۔ خدا کا دیا میرے پاس سب کچھ موجود ہے، مجھے کسی بات کی کوئی کمی نہیں۔ شاید اس لئے کہ میں نے ڈبل اپ پروموشن اور ایک لاکھ کا انعام (جو آج کے زمانے کے اعتبار سے کسی بھی طرح پچیس تیس لاکھ سے کم نہیں ہوگا) ملنے کے بعد ”مالِ غنیمت“ لینے سے توبہ کر لی تھی۔ دوج بھی کر چکا ہوں اور ہر طرح آسودہ حال ہوں۔ لیکن کبھی کبھی جب مجھے اپنے اسٹنٹ کلکٹر کا خیال آتا ہے تو میرے جسم میں جھرمھری سی دوڑ جاتی ہے۔

بشرِ ناخدا نے کچھ ایسے ناقابلِ تردید ثبوت پیش کئے تھے، جس کے بعد وہ کسی طور بھی ایک لمبی سزا سے نہیں بچ سکتا تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ اس کی ضمانت منسوخ کر کے گرفتار کیا جاتا، اس نے خود کو گولی مار کر خودکشی کر لی تھی۔ شاید اس طرح اس نے اپنی سزا مقرر کر کے خود کو انجام تک پہنچا دیا تھا۔ (خدا امرنے والے کی مغفرت کرے)

❖.....❖.....❖

ہوا میں ذرا سا لہرایا، پھر منہ پونچھے لگا۔ سپرنٹنڈنٹ سے میرا یہی اشارہ ملے ہوا تھا۔ وہ بھی ایسی صورت میں جب میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں اور مجھے اس کی کمک کی ضرورت پیش ہو۔

”حاجی ابراہیم!“ بشرِ ناخدا نے بلند آواز میں بیمار نظر آنے والے نوجوان سے کہا۔ ”صاحب کے ساتھ جانے کو تیار ہو جا۔ صاحب تیری ٹانگ کا پوسٹ مارٹم کرانے کا آخری فیصلہ کر چکا ہے۔“

یہ دراصل اس کا ایک اشارہ تھا، جو اس نے اپنے آدمیوں کو دیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ اتنی تیزی سے ہوا کہ مجھے سمجھنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ پہلے میں نے اکرم کے ساتھ کھڑے ہوئے اپنے سپاہی کو جیج مار کر نیچے گرتے دیکھا تھا، اس کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے میرے بائیں شانے کے اندر کسی نے پھلا ہوا سیسہ اتار دیا ہو۔ میں چکرا کر گرا، پھر میں نے گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز سنی تھی، اس کے بعد میرا ذہن گھپ اندھیروں میں ڈوبنا چلا گیا۔

❖.....❖.....❖

جس وقت مجھے دوبارہ ہوش آیا، اس وقت بھی میرے ذہن پر ہلکی ہلکی غنودگی طاری تھی۔ میں کسی ہسپتال کے کمرے میں تھا، جہاں نرس کے لباس میں لبوس ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ میرا سپرنٹنڈنٹ بھی موجود تھا۔ وہ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر بڑی مسرت سے بولا۔  
 ”خدا کا شکر ہے کہ تم بچ گئے۔“

”سسر.....!“

”نہیں۔“ سپرنٹنڈنٹ نے میرا جملہ کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”تم بولو نہیں، صرف سنتے رہو۔ بشرِ ناخدا اور اس کے ساتھی تم کو جان سے مارنے کا فیصلہ کر چکے تھے، لیکن جب میرے سادہ لباس والوں نے فائر کھولا تو وہ بوکھلا کر سمندر میں چھلانگ لگانے لگے۔ لیکن وہ مریض اور بشرِ ناخدا ہمارے ہاتھ آ گیا۔ یہ بھی غنیمت ہوا کہ تمہارا وفادار سپاہی اکرم تین گولیاں لگنے کے باوجود بچ گیا۔ اسی نے مجھے اس مریض اور اس کی ٹانگ کے پوسٹ مارٹم والی بات بتائی تھی۔ پھر جانتے ہو کیا ہوا؟ مریض کی ٹانگ کے ٹائٹل کھول کر سب سرجن نے اس کا معائنہ کیا تو وہ پلاسٹک کی تھیلی بھی برآمد ہوگئی، جس کے اندر پندرہ لاکھ کے قیمتی ہیرے نہایت چابکدستی سے چھپائے گئے تھے اور اسے آپریشن کے بعد ہی حاجی ابراہیم نامی نوجوان کی ران کے اندر چھپا دیا گیا تھا۔ بہر حال کیس کی کامیابی کی خوشی کے ساتھ مجھے اس بات کا دکھ بھی ہے کہ ہمارے دو سپاہی بھی کام آ گئے۔“

میں نے کچھ پوچھنا چاہا، لیکن کمزوری اور فقاہت کے مارے میرے منہ سے آواز نہیں



## پس پردہ

پاکستان فلم انڈسٹری میں اس کی کم و بیش وہی پوزیشن تھی، جو بھارت میں دیوان سردار بھاری لال، وی شانتا رام اور سہراب مودی جیسے بڑے لوگوں کو حاصل تھی۔ پروڈیوسر، ڈسٹری بیوٹر اور فنانسر کے علاوہ بھی اس نے فلم کے اور بھی کئی شعبوں کو سنبھال رکھا تھا۔ اسے اگر فلم انڈسٹری کا ستون کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کی وجہ سے بہت سارے خاندان پل رہے تھے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے، جب پاکستان عالم وجود میں آیا تھا۔ اس وقت انڈسٹری میں صرف دو چار افراد ہی ایسے تھے، جو فلم سازی کے میدان میں خال خال نظر آتے تھے۔ بھارت کی فلموں کے مقابلے میں جہاں اسٹوڈیو کے صدر دروازے سے سیٹ تک سینکڑوں ہیرادور ہیردینیں لائن میں کھڑی نظر آتی ہیں، یہاں پاکستان میں گئے چنے اور لٹے چنے فلمی افراد کی نفی نہ ہونے کے برابر تھی، لیکن اس شخص واحد کے آنے سے فلمی انڈسٹری کو بڑا استحکام ملا اور اسٹوڈیوز میں رونقیں نظر آنے لگیں۔ جن لوگوں کے پاس فن تھا، لیکن فن پیش کرنے کے لئے سرمایہ نہیں تھا، وہ بھی دھندے سے لگ گئے۔ ایک مقامی اسٹوڈیو نے پروڈیوسرز اور ڈائریکٹروں کو کریڈٹ کی رعایت دے رکھی تھی، لیکن شرط یہ تھی کہ کوئی فلم اس وقت تک پھانک سے باہر نہیں نکل سکتی، جب تک اسٹوڈیو مالکان کو اس مدد میں مکمل ادائیگی نہ کردی جائے۔ چنانچہ جس طرح موسم برسات میں چیونٹیوں کی فوج اچانک نمودار ہوتی ہے، اسی طرح کریڈٹ سے فائدہ اٹھانے کی خاطر کچھ ایسے افراد بھی فلم سازی کے میدان میں کود پڑے، جن کو نہ فلم بنانے کا تجربہ تھا، نہ ہدایت کاری کا۔

میں ایسے ہی ایک فلم ساز اور ہدایت کار سے بہ خوبی واقف ہوں، جو دن بھر دفتر میں بیٹھے چینی اور چاول کے پرٹ (وہ راشننگ کا زمانہ تھا) مالی غنیمت لے کر راشن کی دکان کے مالکوں کے فرضی ناموں سے کاٹا کرتے تھے۔ اچھے خاصے صحت مند اور خوبد جوان تھے۔ دو چار خوب صورت لڑکیوں نے انہیں اُلٹو بنا کر مال کھینچنے کی خاطر ہیر و کہنا شروع کیا تو وہ بچ بچ

کے ہیر و بننے کے خواب دیکھنے لگے۔ چنانچہ ایک شام جب میں ان کے دو کمروں کے مختصر سے کوارٹر میں گیا تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ باہر کا کمرہ جو بس دو چار واجبی قسم کے فرنیچر سے ڈرائنگ روم کہلاتا تھا، اس روز نہ صرف یہ کہ خاصا صاف ستھرا نظر آ رہا تھا بلکہ دیواروں پر رنگ و روغن کے علاوہ صوفہ سیٹ اور میز کرسیاں بھی تھیں۔

”خیریت تو ہے؟“ میں نے اس بے سرو سامانی کی سرو سامانی دیکھنے کے بعد حیرت سے کہا۔ ”کیا ترقی ہو گئی ہے یا کوئی لمبا پرٹ کاٹ دیا ہے؟“

”یار! تو اپنا دوست ہے، تجھ سے کیا پردہ؟“ وہ بڑی ڈھٹائی سے بولے۔ ”فی الحال اسی کمرے کو ڈرائنگ ٹھاک کر لیا ہے۔ لیکن تم دیکھنا، مہینے دو مہینے بعد تمہارا یار کسی بڑی بلڈنگ کے خوب صورت سے آفس میں ریوالوگ چیر پر بیٹھا مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہوگا اور ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت اور حسین تتلیاں میرے ارد گرد منڈلا رہی ہوں گی۔“

”تتلیوں کا مسئلہ تو خیر بعد میں پیش آئے گا۔“ میں نے موصوف کی ذہنی کیفیت پر افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال اطلاعات عرض ہے کہ آپ کے چہرے پر سرے سے مونچھ نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے تو پھر تاؤ کس پر دیں گے؟“

”یار! تیری یہی باتیں مجھے بار بار یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ میں پہلی فلم کامیڈی پیش کروں۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے بولے۔ ”کہانی، مکالمے اور منظر نامہ وغیرہ لکھنے کی تمام تر ذمہ داری تم پر ہوگی۔“

”کیا.....؟“ میں چونکا۔ ”کوئی فلم بنانے کا ارادہ ہے؟“

”ابھی تو ابتدا ہے، پیارے!“ وہ مسکرا کر آنکھ مارتے ہوئے بولے۔ ”آگے آگے دیکھتے ہوتا ہے کیا۔“

”فلم بنانے کے لئے سرمایہ کہاں سے آئے گا؟“ کہانی نویس وغیرہ بننے کے خواب نے مجھے بھی کچھ دیر کے لئے سنجیدہ بننے پر مجبور کر دیا۔

”چند ہزار میں اسٹوڈیو مع جملہ خام مال اور ہنرمندوں کے مل رہا ہے۔“ وہ بڑے جذباتی لہجے میں بولے۔ ”ادھر فلم چار آنے مکمل ہوئی، ادھر دھڑا دھڑا ڈسٹری بیوٹروں کی جانب سے ایڈوانس کی پیشکش شروع۔ وہی مثل ہے کہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ آئے چوکھا۔ ایک فلم ہٹ ہو گئی تو دارے نیارے ہو جائیں گے۔“

”ہیر وٹن اور ادا کاروں کی خدمات بھی کیا اسٹوڈیو والے ادھار دینے کو تیار ہیں؟“

”اس کا انتخاب میں کر چکا ہوں۔“ وہ ایک ادا سے بولے۔ ”ہیر وٹن کا کردار میں ادا کروں گا اور ہیر وٹن کے کردار کے لئے میں نے شہناز کے بارے میں طے کر لیا ہے۔ بڑے باپ کی بیٹی ہے، ہیر وٹن بننے کے چکر میں لاکھ دو لاکھ بھی خرچ کرنے پر آمادہ ہو جائے گی۔“

ہدایت کاری کا شعبہ بھی میں اپنے ہی پاس رکھوں گا۔“

”لیکن شہناز کے چہرے پر تو بڑے بڑے مہارے دور سے نظر آتے ہیں۔“

”نرے اتحق ہیں آپ۔“ موصوف، جن کو میری اطلاع کے مطابق ابھی تک اسٹوڈیو کے بڑے سیاہ پھانک سے اندر داخل ہونے کا موقع بھی نہیں ملا تھا، حالانکہ ان کی ساری دعائیں صرف دربان ہو چکی تھیں، مہارت بھرے انداز میں بولے۔

”یار! میک اپ مین بھی آخر کوئی چیز ہوتا ہے۔ تم دیکھنا تو سہی، میک اپ کرنے والا اپنی شہناز کو پری سے پری پیکر بنا دے گا۔ پہچانا بھی دشوار ہو جائے گا۔“

”اور اگر ہٹ ہونے کے بعد اس نے ہمیں بھی پہچاننے سے انکار کر دیا تو؟“

”تمہاری طرح میری عقل میں بھس نہیں بھرا ہوا ہے۔“ وہ بڑی رازداری سے دہی زبان میں بولے۔ ”میں اسے سائن کرنے سے پہلے اس بات کا انگری منٹ کر لوں گا کہ وہ میری پانچ فلمیں مکمل کرانے کے بعد ہی کسی دوسری فلم میں کام کر سکے گی۔“

ابھی ہمارے درمیان یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ بغیر استری کی ایک شیروانی اپنے اور منہ میں پان کا بیڑا دبائے محلے کے ایک بھٹکے شاعر جو گلی کے لڑکوں کو گھر گھر کر اپنی شاعری سنانے پر بھند رہتے تھے، بڑے کردوفر سے کمرے میں داخل ہوئے۔ میرے دوست نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا، پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولے۔

”خواجہ صاحب! میں نے آپ کو ایک خاص کام کی خاطر زحمت دی ہے۔“

”زبے نصیب۔ فرمائیے، کارِ لائق کیا ہے؟“

”میں ایک فلم بنانا رہا ہوں۔ آپ کو اس کے گانے لکھنے ہوں گے۔ لیکن اس بات کا خیال رہے کہ اس کی بھٹک کسی اور کو نہ ملنے پائے۔ ورنہ اچھے اور ہٹ گانے فلم ریلیز ہونے سے پہلے چوری ہو جاتے ہیں۔ ایک بار بمبئی میں بھی دو چوٹی کے ہدایت کاروں کے درمیان اسی بات پر جوتم پیزا ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔“

”آپ اس کی مطلق پروانہ کریں۔“ شاعر نے جو شاعر کم اور کامیڈین زیادہ نظر آ رہے تھے، جلدی سے کہا۔ ”گانے کے ایک ایک بول کھڑے سمیت میرے سینے کے نہاں خانوں میں دفن رہیں گے۔“

”کوئی مزاحیہ گانا ہے تیار آپ کے پاس؟“

”اس وقت تو نہیں ہے، لیکن دو گھنٹے بعد میں دو گانے تیار کر کے دوبارہ حاضر ہوتا ہوں۔“ انہوں نے کہا پھر جلدی سے اٹھ کر چلے گئے۔ ان کے ساتھ ہی میں بھی اٹھنے لگا تو میرے دوست نے کہا۔

”تم کہاں چل دیئے؟“

”کہانی کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ جیسے ہی ہتھے لگ گئی، دوبارہ حاضر ہو جاؤں گا۔“ میں نے شاعر کے لہجے کی نقل اتاری تو کمرے میں ہمارے ملے جلے ہتھے گونج اٹھے۔

اس کے بعد وہی ہوا، جس کا مجھے ڈر تھا۔ فلم دو آنے بھی نہیں بن پائی تھی کہ اسٹوڈیو کے مالکان کو کسی خبر نے اطلاع دی کہ فلم سازی کی آڑ میں کیا کیا گل کھلائے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اسٹوڈیو مالک نے جتنی بھی بری بھلی فلم بنی تھی، اس کو دیکھنے کی فرمائش کر دی اور ایک دو گانا سننے کے بعد ہی ہمارے دوست کو انتہائی باعزت طور پر ”اسٹوڈیو نکالا“ کا حکم دے دیا، جس کی تعمیل میں وہاں کے پٹھان چوکیدار اور دیگر کارندوں کو کوئی خاص محنت نہیں کرنی پڑی..... اور خیر سے بدھو گھر کو آ گئے۔

بہر حال، یہ سب کچھ تو محض زبیب داستان کے لئے چند حقائق تھے، جو میں نے بیان کرنے اس لئے ضروری سمجھے کہ اس شخص کی خوبیوں کو اُجاگر کیا جاسکے، جس کا نام مرنے کے بعد آج بھی لوگوں کی زبان پر موجود ہے۔

پاکستان میں فلمی حالات کو سدھارنے اور دامے درمے سننے اس میں پیش پیش رہنے میں اس کی ذات کو بڑا دخل تھا۔ وہ جو ہر شناس تھا اور کام کی لگن بھی رکھتا تھا۔ اس لئے قدرت اسے نوازتی رہی۔ وہ ہر کام یا کام کی بات شروع کرنے سے پیشتر ”إن شاء اللہ“ اور ”اگر خدا کو منظور ہوا“ ضرور کہتا تھا۔ بے حد ملنسار طبیعت کا مالک تھا۔ درمیانہ قد، کھلتی ہوئی رنگت اور آنکھوں میں جھلکنے والی ذہانت نے اس کی شخصیت کو ہر دلعزیز بنا رکھا تھا۔ خوش اخلاق ہونے کے ساتھ ساتھ خوش گفتار بھی تھا، اس لئے ملنے والے اس کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ شہر میں اور بھی بے شمار ڈسٹری بیوٹر اور پروڈیوسر موجود تھے۔ لیکن جو بات اس میں تھی، وہ کسی اور میں نہیں تھی۔ اس کے مخالفین اس کی شہرت کے گراف کو نیچے گرانے کی خاطر طرح طرح کے ہتھ کڈے اور اوچھے ہتھیار استعمال کیا کرتے تھے، لیکن وہ اپنے ان حریفوں سے بھی ہمیشہ بڑے اخلاق اور محبت سے پیش آتا تھا۔

میری اس سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی، جب مجھے ایک فائل دے کر میرے سپرنٹنڈنٹ نے کہا تھا۔ ”فیصل صاحب! یہ شخص کسی ذات برادری سے تعلق رکھتا ہے، اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ ہمیں جو رپورٹ اوپر سے موصول ہوئی ہے، اس کے مطابق یہ شخص بزنس کی آڑ میں پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے۔ خاص طور پر چوری چھپے انڈین فلمیں استعمال کر رہا ہے۔ آپ کو ایک ہفتے کے اندر اندر اپنی انکوائری رپورٹ براہ راست کلکٹر صاحب کو پیش کرنی ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر کام کیجئے گا، ورنہ آپ کی اچھی خاصی ساکھ کو بھی دھچکا پہنچ سکتا ہے۔“

میں فائل لے کر اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ کراچی کے تقسیم کاروں سے لے کر اسٹوڈیو

جس نے کئی فائلیں اور ایک رجسٹر اٹھا رکھا تھا۔ اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”یہ میرے آفس منیجر ہیں۔ دفتر کا سارا حساب کتاب اور کاروبار کی تمام دیکھ بھال بھی انہی کے ذمے ہے۔“

”خوش ہوئی آپ سے مل کر۔“ میں نے منیجر صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے جواب دیا۔ ”کہانی کا مکمل اور تفصیلی پلاٹ آپ کے سامنے موجود ہے۔“ اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”آپ چاہیں تو یہاں بیٹھ کر اسے سمجھ لیں اور چاہیں تو گھر لے جا کر اچھی طرح اس کی دیکھ بھال کر لیں۔“

اس کا جواب سن کر میں چونکا۔ شاید اسے میری اصلیت کا علم ہو چکا تھا۔ پھر بھی میں نے ایک چانس لینے کی خاطر کہا۔ ”کہیں ان فائلوں میں وہ کہانیاں اور منظر نامے تو نہیں ہیں جو ریجنلٹ ہونے کے بعد.....“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ساری کہانیاں سنسر سے پاس شدہ ہیں۔ دیے آپ چاہیں تو اپورٹ ایکسپورٹ کے دفتر سے بھی ان کی تصدیق کر سکتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں کوئی طنز نہیں تھا۔ معصومیت سے بولا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ میرے کچھ دوستوں نے میرے ساتھ مہربانی کی ہے، جو آپ کو زحمت اٹھانی پڑی۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کون لوگ ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔“

وہ یقیناً نہ صرف مجھے پہچان چکا تھا بلکہ اسے میری اصلیت کا بھی بخوبی علم تھا۔ پھر اس سے پیشتر کہ میں کوئی مناسب جواب دیتا، اس نے بڑے دوستانہ انداز میں اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ کو میری وجہ سے ادھر ادھر آنا جانا پڑا۔ براہ راست مجھ سے ملاقات کر لینے تو اتنی تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔“

”میرے محترم!“ میں نے اس کی سادگی سے متاثر ہو کر جواب دیا۔ ”آپ فلم ساز بھی ہیں، اس لئے سمجھتے ہوں گے کہ کبھی کبھی کوئی ایسی چوہن آ جاتی ہے، جب کسی کردار کو اپنی مرضی کے خلاف بھی ریکٹ کرنا پڑتا ہے۔“

”میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں، لیکن بڑی کرپا (مہربانی) ہوگی آپ کی، اگر آپ ہمارا ریکارڈ چیک کر لیں۔ ان شاء اللہ! اس میں کوئی گھپلایا ہیر پھیر نہیں ملے گا، آپ کو۔“

”مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے، پھر بھی میں آپ سے درخواست کروں گا۔“

”آپ حکم کریں۔“

”مجھے ایسی فلموں کے نام اور ان کے درآمدی کاغذات کی ایک فہرست مہیا کر دیں، جو

کے مالکان تک کسی نہ کسی حوالے سے مجھے جانتے تھے۔ شاید اسی لئے وہ فائل بھی میرے سپرد کی گئی تھی۔ اوّل تو میرا ذاتی خیال تھا کہ رپورٹ کسی رجسٹر یا محض ایک صاف ستھری شخصیت کو بدنام کرنے کی خاطر کی گئی ہے۔ دوسرے میں فلمی دنیا کے جتنے افراد سے ملا، ان میں بیشتر نے یہی کہا کہ وہ رپورٹ سراسر بہتان ہے۔ میں نے دیگر ایجنسیوں سے بھی رابطہ قائم کیا، انہوں نے بھی فلموں کی اس سنگت کے بارے میں اپنی لائسنس کا اظہار کیا۔ ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں مذکورہ شخص کے آفس پہنچ گیا۔ اس نے بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا۔ میرے انکار کرنے کے باوجود اصرار کر کے میری خاطر تواضع کی، پھر اس سے پہلے کہ میں اصل مقصد کی طرف آتا، اس نے گھٹی بجا کر چہرہ کو بلایا اور نہایت نرم لہجے میں یہ تاکید کر دی کہ بغیر اجازت کسی اور کو اندر نہ آنے دیا جائے۔ چہرہ اسی کے جانے کے بعد اس نے میری جانب بڑے پیار بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے دیکھا۔

”فیصل صاحب! میں جانتا ہوں کہ آپ اس وقت میرے پاس کس کام سے آئے ہیں۔“

”حیرت ہے..... آپ کو میرا نام بھی معلوم ہے۔ جبکہ ابھی تک ہم نے ایک دوسرے سے اپنا تعارف بھی نہیں کرایا۔“

”میرا تعارف تو آپ باہر میرے بورڈ پر پڑھ چکے ہیں۔ رہا آپ کا معاملہ تو آپ شاید بھول رہے ہیں کہ ہمارا تعارف حکیم صاحب نے اپنے سینما پر کرایا تھا۔“

”اوہ..... یاد آیا۔“ میں نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ ”دراصل مجھے فلمی کہانیاں لکھنے کا شوق ہے۔ میں نے حکیم صاحب کو بتایا تھا اور درخواست بھی کی تھی کہ وہ آپ سے میری ملاقات کرا دیں۔ لیکن پھر بیماری کی وجہ سے آپ کے پاس حاضر نہیں ہو سکا۔ شکر ہے کہ آپ نے مجھے پہچان کر میری مشکل آسان کر دی۔“

”مجھے یقین ہے کہ آپ ضرور اچھی کہانیاں لکھتے ہوں گے۔“ اس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت آپ کون سے ٹاپک پر کہانی سنائیں گے؟“

”اس وقت تو میں محض ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا تھا۔“ میں نے جلدی سے ایک خوب صورت بہانہ تراشا۔ ”آپ اگر مہربانی کر کے مجھے کوئی فرصت کا وقت دیں تو میں اطمینان سے بیٹھ رہا۔“

”کہانی کا ایک پلاٹ ہے میرے پاس۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اسی پر کچھ لکھ ڈالیں۔“ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ لیکن اس وقت بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”شکریہ۔ اسے تو میں اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔“

جواب میں وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ دوبارہ واپس آیا تو اس کے ساتھ اس کا منیجر بھی تھا،

”یو آر رائٹ۔“ وہ میرا جملہ تیزی سے کاٹتے ہوئے بولے۔ ”میری اپنی رپورٹ بھی یہی ہے کہ وہ شخص با اصول واقع ہوا ہے۔ آپ ایسا کریں کہ یہ فائل میرے اسٹینو کو دے دیں۔ میں اسے کبھی فرصت سے پڑھ لوں گا۔“

میں نے اٹھ کر زمین پر پاؤں مار کر سیٹھ کیا، پھر فائل باہر لا کر اسٹینو کے حوالے کر دی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے میرے کاندھوں سے کوئی وزنی بوجھ اتر گیا ہو۔ اس کے بعد میری اور اس کی دو ایک ملاقاتیں حکیم صاحب کے سینما پر ہوئیں۔ پھر حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ اپنی ذاتی انا کی خاطر مجھے اس ملازمت کو ترک کرنا پڑا۔ کچھ عرصہ بیکار رہا، پھر میرے والد کے ایک شاگرد نے جو ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے، مجھے آبکاری اور محصولات کے محکمے میں ملازمت دلا دی۔ نئی ملازمت میں ایڈجسٹ کرنے کی خاطر میں اس قدر مصروف رہا کہ پھر میری اور اس شخص کی ملاقات نہ ہو سکی، جسے میں آج بھی خود سے بہت قریب سمجھتا ہوں (وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے) بلاشبہ اس نے اور اس کے ادارے نے پاکستانی فلمی ساکھ کو جو سہارا دیا، وہ قابل تحسین تھا۔ فلمی دنیا سے متعلق آج کل کے نئے چہرے جو کبھی مرنے والے کی شکل بھی نہیں دیکھ سکے، وہ بھی اس کا نام بڑی عزت اور احترام سے لیتے ہیں۔ اب میں اصل کہانی کی طرف آتا ہوں!

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرا تبادلہ نہ چاہنے کے باوجود آبکاری کے شعبے میں کر دیا گیا تھا۔ مجھے ملازمت میں آئے چونکہ سات آٹھ سال گزر چکے تھے، اس لئے میں ہر شخص سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ یہ بھی تھوڑا بہت جانتا تھا کہ کون افسر کس ٹائپ کا ہے اور بالائی آمدنی کی خاطر اس نے کیا کیا طریق کار وضع کر رکھے ہیں۔ شعبہ محصولات اور آبکاری کی پوسٹنگ میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ ٹیکسیشن سائینڈ میں آئے میں نمک ملایا جاتا ہے، جب کہ ضروری اور بنیادی سہولتیں نہ ہونے کے سبب آبکاری سے متعلق افسران کو بحالت مجبوری بھی کسی کیس پر اپنی جیب خاص سے خرچ کی جانے والی رقم کو پورا کرنے کی خاطر نمک میں آٹا ملانا پڑتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں ایسی تعیناتی سے ہمیشہ دور بھاگتا تھا، جہاں قسمت کی دیوی (بالائی آمدنی) کا زیادہ عمل دخل ہوتا تھا۔

بہر حال، میں بحالت مجبوری آبکاری میں اپنے دن گن کر پورے کر رہا تھا اور اپنی سی پوری پوری کوشش میں مصروف تھا کہ میرا تبادلہ محصولات سے متعلق کسی اور شعبے میں ہو جائے۔

آبکاری میں یوں تو میرے بہت سارے جانے پہچانے چہرے اور دوست احباب تھے، لیکن میں ”پس پردہ“ کے عنوان کے تحت بطور خاص اس انسپکٹر کا ذکر کروں گا، جو اس کہانی کا بنیادی ”بدکردار“ ہے۔ اس کا نام یوں تو شفیق احمد تھا، لیکن وہ اپنے نام کے اعتبار سے بالکل

بھارت سے منگوائی گئی ہیں۔“

”محمود صاحب!“ اس نے اپنے منہ سے کہا۔ ”آپ فیصل صاحب کے مطلوبہ کاغذات کب تک فراہم کر سکیں گے؟“

”ٹائپ کرانے میں کچھ وقت تو لگے گا سر!“

”کوئی بات نہیں۔ میں کل کسی وقت دوبارہ آ جاؤں گا۔“ پھر میں نے اٹھتے ہوئے اس شخص سے کہا، جو ذات، پات، رنگ و نسل کی تمیز سے بالاتر ہو کر ہر بات میں ان شاء اللہ ضرور کہتا تھا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میں نے آپ کو تکلیف دی، لیکن.....“

”آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔“ اس نے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”ڈیوٹی بہر حال ڈیوٹی ہوتی ہے۔ رہا کہانی کا معاملہ تو میں آپ کو اس کے لئے بھی ضرور وقت دوں گا۔“

اس کے آخری جملے میں بڑی بے تکلفانہ اپنائیت تھی۔ میں جواب دینے کے بجائے مسکرایا، پھر اسے سلام کر کے باہر آ گیا۔ دوسرے روز اس کے دفتر پہنچا تو پہلے کمرے میں محمود صاحب سے ملاقات ہوئی، انہوں نے میرے مطلوبہ کاغذات اور فلموں کی فہرست بڑے سلیقے سے تیار کر رکھی تھی۔ میں نے فائل لیتے وقت ان کا شکریہ ادا کیا، اٹھنے لگا تو بولے۔

”آئیے۔ میں آپ کو سیٹھ صاحب کے کمرے تک پہنچا دیتا ہوں۔“

”شکریہ، اس وقت میں ذرا جلدی میں ہوں۔ آپ ان تک میرا سلام پہنچا دیجئے گا۔ میں پھر کبھی ضرور حاضر ہوں گا۔“

میں خاموشی سے فائل لے کر واپس گھر آ گیا۔ فرصت ملنے پر کاغذات کی جانچ پڑتال کی تو وہ نہ صرف یہ کہ ہر اعتبار سے مکمل تھے بلکہ باقاعدہ تصدیق شدہ تھے۔ میں نے اسی رات بیٹھ کر اپنی تفصیلی رپورٹ تیار کی اور دوسری صبح پوری فائل لے کر کلکٹر صاحب کے سامنے پیش ہو گیا، جن کی تعریف میں پہلے بھی کئی کہانیوں میں کر چکا ہوں۔

”کم آن مسٹر فیصل!“ کلکٹر صاحب نے مجھے دوستوں کی طرح مخاطب کیا، پھر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے حسب معمول بڑی تیز رفتاری سے بولے۔ ”آپ غالباً اس وقت انڈین فلموں کی اسمگلنگ رپورٹ لے کر آئے ہیں؟“

”یس سر!“ سپرنٹنڈنٹ صاحب کا یہی حکم تھا کہ رپورٹ براہ راست آپ کو پیش کی جائے۔“

”آپ کی کیا فائنڈنگز ہیں؟“ انہوں نے فائل لے کر سرسری طور پر اُلٹتے ہوئے دریافت کیا۔

”میرا ذاتی خیال یہ ہے سر! کہ کسی دشمن نے.....“

سیٹ واقع ہوا تھا۔ خود بھی کھاتا تھا اور اوپر والوں کو بھی کھلانے میں کبھی دریغ سے کام نہیں لیتا تھا۔ انپکٹر ہونے کے باوجود وہ بڑی شاہانہ زندگی گزارتا تھا۔ سفید رنگ کی ایک لمبی گاڑی تھی اس کے پاس، جسے ایک باوردی ڈرائیور چلاتا تھا۔ اس کا اثر و رسوخ اتنا اوپر تک تھا کہ وہ چھوٹے موٹے افسروں کو تو منہ لگانے کا بھی عادی نہیں تھا۔ بات چیت کرنے کے معاملے میں وہ بلاشبہ لکھنؤ کی پیداوار لگتا تھا۔ لیکن ”لب پہ رام رام اور بھل میں چھری“ والی مثال اس پر پوری طرح صادق آتی تھی۔ ہمیشہ اونچے اونچے ہاتھ مارنے کا عادی تھا۔ کسی آکٹوپس کے مانند اپنے شکار کو اس طرح اپنے چنگل میں دبوچتا تھا کہ بے گناہ ہونے کے باوجود اسے جہنم کی آگ نظر آنے لگتی تھی۔ اوپر کی آمدنی کے سلسلے میں وہ کسی سودے بازی کو پسند نہیں کرتا تھا، جو منہ سے نکل گئی بس وہی رقم پتھر کی لکیر بن جاتی تھی۔ کسی جال میں پھنسے ہوئے معصوم انسان پر بھی رحم کھانا اس کی سرشت کے خلاف تھا۔

خوش گفتار ہونے کے ساتھ ساتھ خوش لباس بھی تھا، لیکن طبعا وہ کسی سمندر کی طرح گہرا تھا، جس کی تھام پلنی مشکل ہوتی ہے۔ کچھ بے تکلف دوستوں نے اسے میٹھی چھری کا نام دے رکھا تھا۔ لیکن وہ دوستوں کی بات کا کبھی برا نہیں مانتا تھا۔ ان کو بات بات پر یہی تلقین کرتا تھا کہ اگر کو کھانا ہے تو پھر ہاتھی کا کھاؤ، چھوٹے موٹے جانوروں سے انسان شکم سیر نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی دھاک دُور دُور تک بیٹھی ہوئی تھی۔ لوگ اس کے سائے سے بھی کترانے کی کوشش کرتے۔ اس کے ظاہر اور باطن میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اس کے قریبی دوست بھی اس کو سمجھنے سے قاصر تھے۔

وہ جو زندگی گزار رہا تھا، وہ بڑی قابل رشک تھی۔ ساحل سمندر کے قریب واقع ایک عالی شان ہوٹل کے مالک نے اسے ایک ڈبل بیڈ کی چابی مفت دے رکھی تھی۔ وہاں اس کے لئے طعام و قیام کے علاوہ اپنے پلانے کا انتظام بھی مفت ہی تھا۔ صدر میں واقع ایک نائٹ کلب میں اس کے لئے چھ نشستوں والی ایک میز ہمیشہ مخصوص رہتی تھی۔ وہ چھوٹی موٹی عورتوں سے عشق کرنے کا عادی نہیں تھا۔ اس زمانے کی دو ایک ایسی مشہور خاتون اداکارائیں جو اپنے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کو بھی گھاس نہیں ڈالتی تھیں، اس کے ساتھ گھومنا پھرنا اور داد عیش دینے میں فخر سمجھتی تھیں۔ کچھ اونچے گھرانوں کی حسینائیں بھی تھیں، جو اس پر جان چڑھتی تھیں اور اس کی ذات پر بڑی بڑی رقیں بھی نچھاور کرنے کو تیار رہتی تھیں۔ لیکن وہ عشق کے معاملے میں بھی ”بھنورے“ کا شاگرد تھا، جو کسی ایک کلی یا پھول پر قناعت نہیں کرتا تھا۔ اپنی گاڑی کی کچھلی نشست کے اطراف اس نے اعلیٰ قسم کے قیمتی اور دبیز پردے ڈال رکھے تھے۔ باہر والے تو کجا، گاڑی چلانے والا ڈرائیور بھی ”پس پردہ“ کھیلے جانے والے ڈرائے کو دیکھنے سے قاصر تھا۔ محض صوتی اثرات پر گزرا کرتا تھا۔

وہ شادی شدہ تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اپنی بیوی سے بہت ٹوٹ کر محبت کرتا تھا۔ لیکن ادھر ادھر منہ مارنے اور بیوی کی امانت میں خیانت کرنے سے بھی باز نہیں آتا تھا۔ اچھا خاصا ادبی ذوق رکھتا تھا۔ بذلہ سخ اس غضب کا تھا کہ جس محفل میں بیٹھ جاتا، اسے زعفران زار بنا دیا کرتا تھا۔ لیکن اس تصویر کا دوسرا رخ بڑا مکروہ اور گھناؤنا تھا۔ فلمی اداکاراؤں میں سے ایک مہوش اس کی بہت فیورٹ تھی۔ تھی تو واجبی صورت شکل اور ناک نقشبے کی، لیکن اس کی آنکھوں میں نہ جانے کون سا سحر تھا، جس نے شفیق کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ وہ ہر لڑکی یا عورت سے فیض یاب ہونے کے بعد بڑے کھلے اور غلیظ انداز میں اس کی ہنسی اڑایا کرتا تھا، لیکن مہوش کے خلاف کوئی بات سنی اسے گوارا نہیں تھی۔ ایک بار اس کے ایک بے تکلف دوست نے مہوش کی ”فرمائش“ کی تو شفیق نے اس پر ریوا لور نکال لیا تھا۔ اگر دوسرے ساتھیوں نے بیچ بچاؤ نہ کرایا ہوتا تو معاملہ سنگین نوعیت بھی اختیار کر سکتا تھا۔ اس حادثے کے دوسرے ہی دن شفیق نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اپنے ساتھی کا تبادلہ ایک ایسے دُور دراز علاقے میں کرا دیا، جہاں جانے کا نام سن کر لوگوں کی روح فنا ہوتی تھی۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ شفیق کم از کم میری بہت عزت کرتا تھا، لیکن میں ہمیشہ اس سے خائف ہی رہتا تھا۔ ایک دن ہم دونوں دفتر میں بیٹھے کولڈ کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ شفیق نے اچانک مجھے مخاطب کر کے خاصی سنجیدگی سے کہا۔

”یار! تم کہیں سے پچاس ہزار کا فوری بندوبست کر سکتے ہو؟ میں دو روز بعد تمہیں پچاس کے بچپن لوٹا دوں گا۔“

”ایسی کیا ضرورت پیش آگئی؟“

”وہ اپنی مہوش ہے نا، اسے کوئی ضرورت پیش آگئی ہے۔ آج صبح ہی اس کا فون آیا تھا۔“

مجھے حیرت تھی کہ شفیق جیسا انپکٹر جولا کھوں میں کھیلنے کا عادی تھا، اس وقت صرف پچاس ہزار کے لئے پریشان تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی ماہانہ اورگی بندھی آمدنی پچاس ہزار سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ بھتے کی رقم کا بھی کوئی شمار نہیں تھا، جو اسے ہفتہ وار ملتی تھی۔ اس کے مخصوص سپاہی بھی جس ٹھاٹ باٹھ سے رہتے تھے، اس کا تصور اعلیٰ اور دیانت دار افسران بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ماہانہ آمدنی کے علاوہ وہ جو کیس کرتا تھا، اس میں بھی منہ مانگی رقم وصول کرتا تھا۔ یہاں یہ بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ شفیق کے بیشتر کیس پلانڈ (Planted) ہوتے تھے۔ اس کے سپاہی تربیت یافتہ شکاری کتوں کی طرح اونچے شکار کی بو سونگھتے پھرتے تھے، پھر جب کوئی موٹی اسامی نظر میں آ جاتی تھی تو ایک طرف سے خود اپنے کارندوں کے ہاتھوں اس کو ستے داموں اسمگلنگ کا مال سپلائی کراتے تھے اور دوسری طرف

سے چھاپہ مار کر اسے پوری طرح جکڑ لیتے تھے اور مالی طور پر رنگا کر دینے کے بعد ہی اسے با عزت طور پر چھوڑ دیا کرتے تھے۔ اس کا علم اوپر والے افسران کو بھی تھا، لیکن وہ اپنے حصے کے مالی غنیمت کی وجہ سے آنکھ بند ہی رکھتے تھے۔

”تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔“ شفیق نے مجھے خاموش پا کر کہا۔ پھر خود ہی مسکرا کر بولا۔  
”معاف کرنا یا ر! میں بھی کتنا احمق ہوں کہ چڑیا کے گھونسلے میں شتر مرغ تلاش کر رہا ہوں۔“  
”شفیق بھائی!“ میں نے اس کی بات پر صاف گوئی سے عرض کیا۔ ”سو پچاس کی بات ہوتی تو میں حاضر تھا، لیکن.....“

”ایک بات کہوں۔ برا نہ منانا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”تم اپنا تبادلہ کہیں اور کرالو۔ کیوں یہاں بیٹھ کر کسی مستحق کا حق مار رہے ہو؟“

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ قسمت کی دیوی اس پر مہربان تھی اور قدرت نے اپنی رتی ڈھیلی چھوڑ رکھی تھی، ویسا ہی اس وقت بھی ہوا۔ ابھی شفیق پچاس ہزار کے خیال میں گم تھا کہ اس کا سپاہی جس کا نام گل ضمیر تھا، تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ پھر اس نے ایک تہ کیا ہوا کاغذ جیب سے نکال کر شفیق کے حوالے کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی اہم اطلاع ہوگی، جسے گل ضمیر مجھ سے چھپانا چاہتا تھا۔ میں شفیق کے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ پرچہ پڑھنے کے بعد اس کی نگاہوں میں وہی چمک نمودار ہوئی، جو عقاب کی آنکھوں میں اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب وہ کسی شکار پر جھپٹنے کے لئے پرواز کا ارادہ کرتا ہے۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ معافی کی رسم آج ہی ہونے والی ہے؟“ شفیق نے گل ضمیر سے دریافت کیا۔

”میں کچے کام نہیں کرتا، صاحب! بلکہ میں نے اپنا پارٹ بھی ادا کر دیا ہے۔“ گل ضمیر نے جس کا نام ضمیر فروش زیادہ مناسب رہتا، مسکرا کر جواب دیا۔ ”ڈرائیور کی مٹھی بھی پانچ ہزار سے گرم کر دی ہے اور بعد میں انعام کا لالچ بھی دے آیا ہوں۔ بس آپ چل کر کندھے پر ہاتھ رکھ دیں۔ اسامی موٹی بھی ہے اور ڈرپوک بھی، ہمیں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔“

”ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ معافی کی رسم اگر آج ہونے والی ہے تو وہ سالا دفتر کیوں آیا ہے؟“

”اصولی بندہ ہے صاحب! اپنا کام شام نمٹانے آیا ہوگا۔ اسی بہانے اپنا کام بھی ہو جائے گا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ شکار تلاش کیا ہے۔“

”مال کتنا ہے؟“ شفیق نے کاغذ کا ٹکڑا پہلے پھاڑا، پھر لائٹر جیب سے نکال کر اسے جلاتے ہوئے پوچھا۔

”پورے چوبیس دانے۔“

”دفتر سے اس کی روائی کب ہوگی؟“

”اس نے دو اور تین کے درمیان اٹھنے کو کہا ہے۔ لیکن ہمیں دو بجے سے پہلے پہنچنا ہوگا، تاکہ کام کہیں خراب نہ ہو جائے۔“  
”راستہ کیا ہوگا؟“

”میں نے وہ بھی پوچھ لیا ہے۔“ گل ضمیر بڑے عجیب انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔  
”قبرستان سے ہو کر گزرے گا۔ وہ جگہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ ہم اسے ساتھ لے جا کر کسی قبر پر فاتحہ بھی پڑھ لیں گے۔ کسی کو شبہ نہیں ہوگا۔“

”تمہاری بسوں کا کیا حال ہے؟“ شفیق نے اپنی دسی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا تو گل ضمیر ہچکچایا۔ میری موجودگی میں شاید وہ اپنا راز کھولنے کو آمادہ نہیں تھا۔ لیکن میرے لئے وہ بات کچھ زیادہ تعجب خیز بھی نہیں تھی۔ مجھے علم تھا کہ بیشتر سیکشن کے زیادہ تر سپاہی جودن بھر ٹوٹی پھوٹی بیٹنوں پر بیٹھے نظر آتے تھے، ان کی مالی حالت ”پس پردہ“ کچھ اور تھی، سب ہی نے گھر بھر رکھا تھا اور مختلف کاروبار میں ان کی حیثیت کسی بھی لکھ بیتی سینٹھ سے کم نہیں تھی۔ گل ضمیر کی چار بسیں مختلف روٹس پر چلتی تھیں۔ ہزاروں کی روزانہ آمدنی تھی۔

”سانپ کیوں سونگھ گیا؟“ شفیق نے اسے خاموش پا کر تنبیہ کی سے پوچھا۔ ”کیا آج کل پولیس زیادہ پریشان کر رہی ہے؟ تم لوگ بھی تو سالو! کنجوسی سے کام لیتے ہو۔ چار کی جگہ پانچ کا بھتہ طے کر لو۔ کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

گل ضمیر بھر بھی خاموش رہا تو شفیق اس کی وجہ سمجھ گیا، اسے دھتکارنے والے انداز میں ہاتھ سے اشارہ کر کے باہر جانے کو کہا، پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

”اب بھی مسلمان ہو جاؤ۔ ورنہ ریٹائرمنٹ کے بعد میری باتیں یاد آئیں گی۔“

”کہاں کا پروگرام بن رہا ہے؟“ میں نے اس کی بات ٹالتے ہوئے پوچھا۔

”سوری۔ میں قبل از وقت اپنی سیکرٹ ڈسکلوز کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ ویسے یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ جب دیتا ہے، چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔“ وہ کسی کاروباری آدمی کی طرح قبل از وقت منافع کا حساب لگاتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ اسامی ایک لاکھ سے کم کی نہیں ہے۔ لیکن آج میں اس کے ساتھ پچیس تیس ہزار کی رعایت بھی کر دوں گا۔“

”رعایت اور آپ؟“ میں نے زہر خند سے جواب دیا۔

”عید بقرعید پر جولا ہے بھی پان کھا لیتے ہیں۔ لیکن یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”فنی الحال یوں سمجھ لو کہ کبھی کبھی پتویشن ایسی ہوتی ہے کہ مجھ جیسے نیک دل انسان کو بھی اپنے شکار پر ترس آ جاتا ہے۔ آخر انسانیت بھی کوئی چیز ہے۔“ اس نے

مسکرا کر آنکھ مارتے ہوئے کہا، پھر شان بے نیازی سے قدم اٹھاتا کمرے سے باہر چلا گیا۔ شفیق کے جانے کے بعد میں اپنے دفتری کاموں میں مصروف ہو گیا۔ مجھے آبکاری برانچ میں آئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے، لیکن میں سب کے بارے میں تھوڑا بہت ضرور جانتا تھا۔ خود میرا آفیسر بھی جو میری موجودگی میں میری تعریفیں کیا کرتا تھا، میری غیر موجودگی میں اپنے دوسرے ”کماؤ پوت“ ماتحتوں کی موجودگی میں مجھے گالیاں بکا کرتا تھا۔ اس برانچ میں وہی مثل تھی کہ ”جتنا گڈالو، اتنا ہی بیٹھا ہوگا“ لیکن میرے پاس گوتھا ہی نہیں تو ڈالتا کہاں سے؟

بہر حال مجھے شفیق کے سارے سپاہیوں میں گل ضمیر کے بارے میں بخوبی معلوم تھا کہ وہ کسی جلاد سے کم نہیں تھا۔ ”قربانی کے جانور کو اگر پانی پلا دو تو وہ زیادہ ہاتھ پیر مارتا ہے“ یہ مثال اس کی خود ساختہ تھی، جسے وہ دوسرے سپاہیوں کی موجودگی میں بڑے فخر سے بار بار دہراتا تھا۔ شفیق کا منہ چڑھا تھا، اس لئے دوسرے اسٹاف کے علاوہ آبکاری آفیسر صاحب بھی (جو اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں) اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے ہمیشہ اس کی خیریت دریافت کرنے کے لئے ایک ہی جملہ استعمال کرتے تھے۔ ”سناؤ دلبر! کیا حال چال ہے؟“ اور جواب میں گل ضمیر مسکین سی شکل بنا کر کہتا۔ ”بس گزر بسر ہو رہی ہے، مائی باپ!“ اس کا انداز بظاہر ایسا ہی ہوتا تھا جیسے گھر میں دو وقت سے چولہا جلنے کی نوبت نہ آئی ہو۔

میرے اپنے سپاہیوں کا حال بھی دوسرے سپاہیوں سے کچھ کم نہیں تھا۔ جب میں نے اپنے سیکشن کا چارج لیا تھا تو سب ہی کے چہرے خزاں رسیدہ درختوں کی طرح سوکھ گئے تھے۔ کچھ دنوں تک ہمارے درمیان خاموش رسہ کشی جاری رہی، پھر ایک دن شفیق ہی نے مجھے سمجھایا تھا۔

”یار! مجھے معلوم ہے کہ تم بہت زیادہ عابد و زاہد ہو۔ لیکن غریبوں کے پیٹ پر کیوں لات مارتے ہو؟ ایک نصیحت میری یاد رکھنا، وہ جو کسی دانشور یا شاید فلاسفر نے کہا ہے تاکہ کبھی کبھی پیر کے نیچے دبی ہوئی چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے، وہی مثال ان سپاہیوں کی بھی ہے۔ تم زیادہ سختی کرو گے تو یہ اتنے ہیں کہ الٹی سیدھی خبری کر کے اور جوش دلا کر تمہیں کسی معاملے میں پھنسانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اپنی راہ چلو۔ لیکن ان کو سیدھی راہ پر چلنے کی اجازت دے دو۔ یہ سب کسان ٹائپ لوگ ہیں۔ خود ہی بوئیں گے اور خود ہی کاٹ لیں گے۔ تمہاری بات بھی بنی رہے گی اور ان کا کام بھی چلتا رہے گا۔ آگے تمہاری مرضی۔“

مجھے معلوم تھا کہ آبکاری برانچ ایک ایسا دریاتھا، جس میں رہ کر کسی مگر مجھ سے بیر رکھنا کسی طرح سے بھی مناسب نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے دلی زبان میں ماتحتوں تک یہ بات پہنچا دی کہ وہ جس طرح چاہیں اپنا منہ کالا کرتے رہیں، لیکن اس کی بھنگ میرے کان تک نہیں آنی

چاہئے۔ اس روز کے بعد سے ہمارے درمیان رسہ کشی کی کیفیت ختم ہو گئی تھی اور میرا ماتحت عملہ بھی بڑی ”تابعداری“ سے میری خدمت انجام دینے لگا تھا۔ غرضیکہ اس دنیا کا باوا آدم ہی کچھ الگ تھلگ اور زالا تھا۔ آپ اگر ذرا سی ترمیم کی اجازت دیں تو میں یہ کہوں گا کہ وہاں میری حالت ”کانوں کے درمیان اندھے راجا“ جیسی تھی۔ لیکن میرا ایک ماتحت نبی بخش (خدا اُس کی بھی مغفرت کرے) جو شفیق سے محض دو ہاتھ پیچھے تھا، میری بڑی عزت کرتا تھا اور برے بھلے سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ میں نے اسے یوں اپنا دوست بنا رکھا تھا تاکہ مجھے معلوم ہوتا رہے کہ اس حشر کے میدان میں میرے کمرے سے باہر نفسا نفسی کا کیا عالم ہے۔

جس روز شفیق نے مجھ سے پچاس ہزار مانگے تھے اور گل ضمیر نے اسے ایک سادہ کاغذ کی صورت میں ”بئیر چیک“ دیا تھا، اس کے کوئی چار دن بعد نبی بخش نے مجھے شفیق کے اس کیس کے بارے میں جو تفصیل سنائی، اسے سن کر مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ اس لئے کہ وہ کیس اسی شخصیت سے متعلق تھا، جس کے سلسلے میں بہت عرصہ پہلے بھارتی فلمیں اسمگل کرنے کی انکوائری میں کر چکا تھا۔ میں نے اس کا نام سنا تو نبی بخش سے کرید کرید کر ایک ایک بات کی تفصیل پوچھنے لگا۔

”چار روز پہلے کی بات ہے سر! میں دفتر کے نیچے کھڑا کسی کا انتظار کر رہا تھا کہ شفیق صاحب اپنی چھاپہ مار ٹیم کے ساتھ نکلے۔ مجھے دیکھا تو ایک لمحے کے لئے رک کر میری خیریت دریافت کرتے رہے، پھر مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی اور میں ان کے ساتھ چلا گیا۔“ نبی بخش نے مجھے تفصیل سناتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے اس قبرستان کے قریب پوزیشن سنبھال رکھی تھی، جو طارق روڈ کے کنارے واقع ہے۔ میں شفیق صاحب کے ساتھ تھا، جب کہ دوسرے سپاہیوں کی قیادت گل ضمیر کے ہاتھ میں تھی۔ غالباً ساڑھے تین بجے ایک گاڑی نے قبرستان سے گھوم کر طارق روڈ کی طرف آنے کے لئے اپنی رفتار مدہم کی تو گل ضمیر تیزی سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔ ڈرائیور کو گاڑی روکنی پڑی۔ پھر گل ضمیر نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص سے کچھ کہا تھا۔ انداز ایسا ہی تھا کہ دیکھنے والوں کو کوئی شک نہیں گزرا۔ میں بھی ایک لمحے کو یہی سمجھا کہ وہ گل ضمیر کا کوئی پرانا شناسا ہے۔ لیکن جب اس نے ہاتھ کے مخصوص انداز سے ہمیں اشارہ کیا تو میں سمجھ گیا کہ مرغا جال میں پھنس گیا ہے۔ ہم ٹپکنے والے انداز میں آگے بڑھے اور گاڑی میں اس طرح بیٹھ گئے، جیسے وہ گاڑی ہمارے باپ کی جاگیر رہی ہو۔ گل ضمیر نے اتنی دیر میں گاڑی کے ڈرائیور کو نہ جانے کیا کہا تھا کہ وہ نیچے اتر کر اس کے ساتھ قبرستان کی طرف چلا گیا۔ میں نے اگلی سیٹ کا انتخاب کیا تھا، جب کہ شفیق صاحب نے پچھلی نشست پر پوزیشن سنبھال لی تھی۔

”میں نے آپ لوگوں کو پہچانا نہیں۔“ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے قدرے سہمے

ہوئے انداز میں باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں آپ لوگوں سے پہلی بار مل رہا ہوں۔“

”درست فرمایا آپ نے۔“ شفیق نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں بھی آپ جیسے مہربان لوگوں سے صرف ایک بار ملنے کا عادی ہوں، دوسری بار ملاقات کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔“

”کیا چاہتے ہیں آپ لوگ؟“

”میں ہیرو بننا چاہتا ہوں۔“ شفیق نے معصومیت سے جواب دیا۔ ”دفتر میں کئی بار آپ کو سلام کرنے کی غرض سے حاضر ہوا لیکن آپ کے چہرے اور دفتر کے دوسرے عملے نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی، اس لئے مجبوراً یہ طریق کار اختیار کرنا پڑا۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔“ اس نے ناگواری کا اظہار کیا۔

”مجھے آپ سے ایک شکایت اور بھی ہے۔“ شفیق نے حسب عادت اس کی جانب اپنا گھیرا تنگ کرنے کی خاطر جواب دیا۔ ”آج آپ کی اکلوتی بیٹی کی سگائی ہے اور آپ نے ہمیں شاید اچھوت سمجھ کر کوئی دعوت نامہ نہیں بھیجا۔ گانا تو مجھے نہیں آتا، لیکن ٹھوڑا بہت بجانا ضرور آتا ہے۔“

”آپ اگر فلم لائن میں ہیرو کے بجائے ولن کے رول ادا کریں تو زیادہ کامیاب رہیں گے۔“ وہ قدرے طنزی سے بولا۔ ”سگائی والی بات پر اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ زمانہ چونکہ لوٹ مار، چوری چکاری، ڈاکا زنی یا اغوا برائے تادان کا نہیں تھا، اس لئے وہ شفیق کا شمار بھی ان سر پھرے نوجوانوں میں کر رہا تھا، جن کے سروں پر فلمی دنیا میں جا کر راتوں رات لکھ پتی بننے کا بھوت سوار رہتا ہے۔“

”آپ جو ہر شئاس ہیں، مہاراج!“ شفیق نے مسکرا کر کہا۔ ”اگر آپ سفارش کر کے مجھے ولن کا رول دلادیں، تب بھی میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔“

”تمہیں معلوم ہے کہ آج میری بیٹی کی سگائی ہے۔“ وہ اس بار قدرے ناگوار لہجے میں بولا۔

”اسی لئے تو میں نے سوچا کہ آپ ذرا جلدی میں میرے کام آجائیں گے۔“

”اتر و گاڑی سے، ورنہ.....“

”ناراض نہ ہوں، سیٹھ جی! آپ میری تصویر دیکھ لیں۔ بڑا فوٹو جینک فیس ہے۔ شاید آپ کو پسند آجائے۔“ شفیق نے جواب دیا۔ پھر جب سے اپنا سرکاری شناختی کارڈ نکال کر دکھایا تو وہ شخص بوکھلا گیا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے پوچھا۔ ”مگر مجھے کس شے کی بنیاد پر روکا گیا ہے؟“

”میں نے سنا ہے کہ عام دعوتوں کے علاوہ لڑکے لڑکیوں کی سگائی کے شہ موقوفے پر بھی آپ کے یہاں شراب کا دور چلتا ہے؟“

”میں سمجھا نہیں۔“ وہ تیزی سے بولا۔

”ڈکی کھلے گی تو سب سمجھ میں آجائے گا۔“ شفیق نے اس بار خالص افسرانہ انداز میں جواب دیا۔ ”مجھے خبر نے اطلاع دی ہے کہ آپ نے مہمانوں کی آؤ بھگت کے لئے ڈکی میں اسمگل کی ہوئی شراب کی بوتلیں چھپا رکھی ہیں۔“

”آئی سی۔“ وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ ”شاید میرے کسی دشمن نے مجھے پریشان کرنے کی خاطر جھوٹی اطلاع دی ہے۔ بہر حال، آپ اپنا اطمینان کرنے کی خاطر پوری کار کی تلاشی لے لیں۔ لیکن پلیر، ذرا جلدی کریں۔ مجھے گھر پہنچ کر مہمانوں کے لئے انتظام بھی کرنا ہے۔“

شفیق نے مجھے ڈکی کھول کر تلاشی لینے کو کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ شخص پوری طرح جال میں پھنس چکا ہے۔ میں جا کر ڈرائیور کو بلا لایا، گل ضمیر بھی اس کے ساتھ ہی لگا ہوا تھا۔ میں نے ڈکی کھولی تو اس میں شراب کی بوتلوں کی دو جھلیاں موجود تھیں۔ ان بوتلوں پر دور ہی سے S.P.D.N.P لکھا نظر آ رہا تھا، جس کا مطلب تھا کہ ان بوتلوں کو سنگاپور سے لایا گیا ہے اور ان پر ڈیوٹی بھی ادا کی گئی ہے۔ میں صرف ایک بوتل لے کر دوبارہ گاڑی میں داخل ہوا تو اس شخص کی آنکھیں یوں کھلی کی کھلی رہ گئیں، جیسے وہ دن میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہو۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ بالکل بے قصور ہے۔ لیکن اگر مشیر نامہ بن جاتا اور دو گواہوں کے دستخط ہو جاتے تو پھر قانون کی نظروں میں اس کی حیثیت بھی وہی ہوتی، جو اسمگلنگ کرنے والے کسی ملزم کی ہوتی ہے۔

”ڈکی میں اس قسم کی کتنی بوتلیں ہیں؟“ شفیق نے مجھ سے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

”دو درجن۔“ میں نے جواب دیا۔

”سیٹھ صاحب!“ شفیق نے اسے مخاطب کیا، لہجہ ان قصائیوں جیسا تھا، جو اٹلی چھری سے حلال کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ”لڑکی کی سگائی کے موقع پر کیا دو درجن بوتلیں کم نہیں پڑیں گی؟“

”میں خدا کی سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ میرا ان بوتلوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ حالات کے پیش نظر اس کی کشادہ پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھرنے لگے تھے۔

”پھر تو اس کا فیصلہ قانون ہی کرے گا۔“ شفیق نے مجھ سے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم دو گواہوں کو بلا کر قانونی کاغذات تیار کرو اور کسی سپاہی سے کہو کہ وہ آکر ان باعزت سیٹھ



صاحب کو ہتھکڑی پہنا دے۔“

”پلیز.....!“ وہ تقریباً رو دیا۔ ”یہ میری عزت کا معاملہ ہے۔ گھر پر مہمان بیٹھے ہوں گے، شام کو لڑکے والے آرہے ہیں۔ اس موقع پر اگر آپ نے مجھے گرفتار کیا تو میری عزت خاک میں مل جائے گی۔ ویسے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ شراب کی یہ بوتلیں کسی دشمن نے.....“

”رنگے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ہر مجرم خود کو معصوم ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔“ شفیق نے دوبارہ تحکمانہ انداز میں اسے ہتھکڑی لگانے کو کہا تو اس غریب کی حالت بالکل ہی غیر ہو گئی۔ جال میں پھنسے ہوئے معصوم پرندے کے مانند پھڑپھڑا کر بولا۔

”میں ہر خدمت کے لئے تیار ہوں۔ پلیز، میری پوزیشن کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“

”ایک لاکھ.....“ شفیق نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔ ”اس سے کم پر سودا نہیں ہو سکتا۔“

”لیکن اتنی رقم تو اس وقت.....“

”بریف کیس کھول کر دیکھ لیں۔“ شفیق نے سرد آواز میں جواب دیا۔ ”چیل کے گھونسلے میں ماس نہ ہو، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

اس نے لرزرتے ہاتھوں سے بریف کیس کھولا، ایک بندھی گڈی پچاس ہزار کی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ بڑے بڑے نوٹ اور بھی تھے۔ اس نے بمشکل کھلے ہوئے نوٹوں کو شمار کیا اور ”مردہ آواز میں بولا۔“

”اس وقت میرے پاس کل ساٹھ ہزار چھ سو روپے ہیں۔“

”ساٹھ ہزار نقد اور پندرہ ہزار میرا آدمی تمہارے ساتھ گھر جا کر لے گا۔ باقی رہے پچیس ہزار تو وہ تم میری طرف سے اپنی لڑکی کو سلامی دے دینا۔ لیکن اتنا دھیان رہے کہ اگر تم نے زیادہ چتر یا چالاک بننے کی کوشش کی تو پھر میں تمہیں مہمانوں کی موجودگی میں ہتھکڑی لگانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔“ شفیق نے بے رحمی سے کہا۔ ”بات اگر زیادہ آدمیوں کے درمیان پھیل جانے کا خطرہ ہو تو پھر میں پچاس لاکھ پر بھی پیشاب کر دیتا ہوں۔“

نبی بخش نے مجھ سے کہا۔ ”پھر وہی ہوا، جو شفیق صاحب نے چاہا تھا۔ اس شخص نے ساٹھ ہزار کی رقم بے گناہ ہونے کے باوجود فوری طور پر ادا کر دی اور باقی پندرہ ہزار کچھ دیر بعد گل ضمیر لے کر آ گیا۔ شفیق صاحب نے مجھے بھی ایک مناسب رقم دینے کی کوشش کی تھی، لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس لئے کہ میں نے آج تک کبھی کسی مجرم کو چار اڈال کر نہیں پکڑا دوسری صورت میں مجھے بھی اخراجات پورے کرنے کے لئے کچھ لین دین کرنا پڑتا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ہمارے شعبے میں سہولت نام کی کوئی شے نہیں ہے۔“

شفیق میرے ساتھیوں میں سے ہے۔“ میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ”لیکن ایک بات یاد رکھنا، نبی بخش! جو شخص معصوم اور بے گناہوں کو پریشان کرتا ہے، اس کی بخشش ذرا مشکل ہی سے ہوتی ہے۔ کبھی نہ کبھی سب کھایا پیا نکل پڑتا ہے۔“

شفیق کی لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ جاری رہا، لیکن مجھے اس کے بارے میں آئے دن جو حالات اور خبریں ملتی رہتی تھیں، ان کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اس لئے کہ میرا تبادلہ جائیداد، ٹیکس کے ایک ایسے ڈویژن میں ہو گیا تھا، جہاں مصروفیت ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ البتہ مجھے اس بات کا قلق ضرور تھا کہ شفیق نے اس شخص کو پریشان کیا تھا جو نہ صرف شریف اور با اصول تھا بلکہ غریبوں اور ضرورت مندوں کے لئے اس کی سخاوت کل بھی اتنی ہی تھی، جتنی آج تک مشہور ہے۔ اس واقعہ کے بعد میں نے حکیم صاحب کے سینما پر آنا جانا بالکل ہی ترک کر دیا۔ صرف فون پر علیک سلیک کر لیا کرتا تھا۔ مجھے اس بات کا خیال ستاتا رہتا تھا کہ اگر کبھی میرا اس شخص سے آمناسامنا ہو گیا تو وہ میرے بارے میں کیا خیال کرے گا؟

بہر حال، وقت گزرتا گیا۔ جائیداد ٹیکس سے میرا تبادلہ شعبہ تفریحات میں ہو گیا، جہاں سینما کی چیکنگ کے لئے ہر آفیسر کا جانا ضروری تھا۔ لیکن پھر بھی میں حکیم صاحب کے سینما پر جانے سے گریز ہی کرتا رہا۔ ایک دن دفتر میں بیٹھا مصروف کار تھا کہ فون کی کھنٹی بجی۔ ریسپور اٹھایا تو دوسری جانب سے سینما ایسوسی ایشن کے چیئرمین کی آواز سنائی دی۔ (وہ شریف آدمی بھی اب دنیا سے گوج کر چکا ہے۔“

”فیصل میاں! تم نے خبر لی؟“

”کیسی خبر؟“

”..... کا انتقال ہو گیا۔“ چیئرمین نے اسی فلم ساز، تقسیم کار کا نام لیا تو میرے ذہن کو ایسا دھچکا لگا جیسے میرا اپنا کوئی قریبی رشتہ دار مر گیا ہو۔ میں نے فون پر چیئرمین سے وعدہ کیا کہ اس کی آخری رسومات میں ضرور شریک ہوں گا۔ لیکن شرمندگی کی وجہ سے گیا نہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مجھے اس بات کا دکھ بھی تھا کہ جو مرد قلندر دن بھر میں سینکڑوں مرتبہ ”إن شاء اللہ“ اور ”اگر خدا کو منظور ہوا“ کہا کرتا تھا، اس کا مزار تعمیر ہونے کے بجائے اس کی راکھ کو سمندر میں بہا دیا جائے گا۔

اس کی موت کے سانحے کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد میں سیکرٹریٹ گیا تو وہاں میری ملاقات شفیق سے بھی ہو گئی۔ پہلی نظر میں، میں اسے پہچان نہ سکا۔ عجیب حلیہ بنا رکھا تھا اس نے۔ داڑھی کئی روز سے بنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ لباس کے علاوہ اس کے اپنے اندر بھی وہ کردار اور شان و شوکت نظر نہیں آ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ پورے محکمے میں مشہور تھا۔

”یہ شفیق نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟“ میں نے سیکرٹری کے پی اے سے پوچھا۔

کے آگے پیچھے ہاتھ باندھے منڈلایا کرتے تھے، جس کی ذات کی آڑ میں وہ لاکھوں کمایا کرتے تھے، آج دنیا بھر کے ہنگاموں کی طرح انہوں نے بھی اس سے منہ موڑ لیا تھا۔ مجھے بھی اب ملازمت سے سبکدوش ہوئے دس گیارہ سال سے زیادہ بیت چکے ہیں۔ شفیق کی زندگی اور موت کے بارے میں سوچتا ہوں تو خدا کے خوف سے لرز اٹھتا ہوں۔ خدا جانے اسے کس غریب کی آہ لگ گئی تھی؟ کس کی جدوجہد نے اس کے ہرے بھرے گلشن کو تاراج کر دیا تھا؟ یا پھر یہ انسان کی اپنی غفلت اور بے حسی کا نتیجہ ہے جو وہ ہمیشہ پیش نظر پر نظر رکھتا ہے۔ ”پس منظر“ کے بارے میں غور کرنے کی ضرورت پر کبھی توجہ نہیں دیتا!



”کیا آج کل کوئی اچھی پوسٹنگ نہیں ہے جو موصوف نے ظاہری طور پر سوگ منارکھا ہے؟“ ”کیا تمہیں علم نہیں؟“ پی اے نے حیرت سے کہا۔ ”شفیق کا ریٹائرمنٹ ہو گیا ہے، آج پنشن کے سلسلے میں آیا ہے تاکہ ضروری کاغذات بنوا سکے۔“

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ دو سال اور سات مہینے کے بعد بھی میں ملازمت سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”فکر تو ہم جیسے لوگوں کو ہونی چاہئے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد گھر کا خرچ وغیرہ.....“

”پلیز.....!“ پی اے نے میری بات کاٹتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ”تمہیں شاید شفیق کے حالات کا علم نہیں ہے، اس کی بیوی ایک عرصے سے بیمار تھی۔ لیکن ڈاکٹر مرض کی صحیح تشخیص نہیں کر پا رہے تھے۔ اب پتہ چلا ہے کہ اسے کینسر جیسے موذی مرض نے اپنی پلیٹ میں لے رکھا ہے۔ شفیق اس کا علاج کرانے کی غرض سے باہر جا رہا ہے۔ اس کے مالی حالات اب وہ نہیں ہیں، جو پہلے تھے۔ سنا ہے وہ اپنی کوشی بیٹے کا سودا بھی کر رہا ہے۔“

مجھے دکھ ہوا۔ شفیق بہر حال میرے ساتھیوں میں سے تھا۔ میں نے دوسرے آفس میں جا کر اس سے ملاقات کی۔ بڑا بچھا بچھا اور دل گرفتہ نظر آ رہا تھا۔ گفتگو میں اب وہ پہلے جیسی بذلہ سخی بھی نہیں تھی۔ میں کچھ دیر اس سے باتیں کرنے اور تسلیاں دینے کے بعد اپنے دفتر آ گیا۔ چھ ماہ بعد اچانک ایک روز معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کا بیرون ملک انتقال ہو گیا ہے۔ پھر کوئی تین چار مہینے بعد میرے ایک ماتحت نے بتایا کہ شفیق کراچی واپس آ گیا ہے اور آج کل ایک مقامی ہسپتال میں زیر علاج ہے۔

”خیریت؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔ ”شفیق کو کیا ہوا؟“

”انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔“

میں نے اسی شام جا کر اس سے ملنے کی کوشش کی۔ وہ انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں تھا، جہاں سوائے قریبی عزیز داروں کے، کسی اور کو ملاقات کی اجازت نہیں تھی۔ ہسپتال میں میرے کچھ دوسرے ساتھی بھی موجود تھے، ان کے ذریعے علم ہوا کہ شفیق گزشتہ تین روز سے موت اور زیست کی حالت سے دوچار ہے۔ ڈاکٹروں کو اس کی طرف سے زیادہ اُمید نہیں تھی۔ میں کچھ دیر تک وہاں رہا، پھر واپس آ گیا۔ دوسرے روز دفتر کے بعد گھر پہنچ کر میں ہسپتال جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ مجھے شفیق کی موت کی اندوہناک اطلاع ملی اور میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ بڑی دیر تک میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔

دوسرے روز اس کے جنازے میں شریک ہوا تو یہ دیکھ کر اور تکلیف ہوئی کہ دفتر والوں کی حاضری بہت کم تھی۔ وہ سپاہی، افسران اور ماتحت جو ملازمت کے دوران ہمہ وقت شفیق

## ڈبل گیم

لڑکی خاصی قبول صورت تھی۔ اس کے جسمانی نشیب و فراز تنگ لباس کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی اُجاگر ہو گئے تھے۔ نشیلا آنکھیں اس بات کی چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ نشہ کرنے کی بھی عادی تھی۔ وہ اس وقت تنہا نہیں تھی۔ ایک سوئیڈ بوٹڈ نو جوان بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ لڑکی کا کوئی عزیز یا رشتہ دار نہیں تھا، ممکن ہے میرا یہ اندازہ غلط رہا ہو، لیکن ان دونوں کو پہلی نظر میں دیکھنے کے بعد کم از کم میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے محض دوست ہیں۔ اس خیال کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لڑکی نے میز پر بیٹھے ہی ایک سگریٹ جلا کر اس کے کش اس انداز میں لینے شروع کر دیئے تھے، جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ نشہ کرنے کی عادی ہے۔ محض شوق کی خاطر سگریٹ پینے والی لڑکیاں عام طور سے سگریٹ پھونکنے پر اکتفا کرتی ہیں۔ جب کہ وہ گہرے گہرے کش لگا رہی تھی۔ اس کی کیفیت میں تشنگی کا احساس بھی شامل نظر آ رہا تھا۔

کیفے گرائڈ کے وسیع و عریض ہال میں اس وقت زیادہ افراد نہیں تھے۔ متعدد میزیں ایسے گوشہ عافیت میں بھی خالی تھیں، جہاں بیٹھ کر وہ نہایت آرام سے راز و نیاز کی باتیں کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ہماری میز سے دو میز چھوڑ کر ایک میز پر بیٹھنے کو ترجیح دی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میرا تھاٹھ کا تھا۔

میں اس وقت تنہا نہیں تھا، انسپکٹر جمال الدین بھی میرے ساتھ تھا۔ یہ صرف اس لئے کہ بے حد بذلہ سخ واقع ہوا تھا، بلکہ نہایت ایماندار اور صاف گو بھی تھا۔ معاملہ فہم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بے حد زور اندیش بھی تھا۔ اپنی ان ہی خوبیوں کے سبب وہ محکمے کے سربراہ رحمان صاحب کے بھی بہت قریب تھا۔ کارکردگی کے اعتبار سے بھی وہ اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں ہمیشہ پیش پیش رہنے کا عادی تھا۔ کسی کیس کے پیچھے لگنے کے باوجود ہمیشہ غیر سنجیدہ دکھائی دیتا تھا۔ یہ اس کی فطرت نہیں تھی، بلکہ اس نے اپنی شخصیت پر مجرموں کو پھانسنے کے لئے ایک خول چڑھا رکھا تھا۔ کیس پکڑ لینے کے بعد وہ اپنا چولا بدل کر اتنا سخت گیر بن جاتا

تھا کہ اس کے ساتھیوں کو بھی اس سے خوف محسوس ہوتا تھا۔

میری اور جمال الدین کی دوستی خاصی گاڑھی تھی۔ ہم زیادہ تر ایک ساتھ کسی کیس پر کام کرتے تھے، اس لئے میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے زندگی میں کبھی ایک پائی بھی رشوت میں نہیں لی تھی۔ وہ اپنی سادگی اور کسی کیس میں کامیابی ہی کو ہفت اقلیم کی دولت سمجھتا تھا۔ غرضیکہ وہ بڑی خوبیوں اور پہلو دار شخصیت کا مالک تھا۔ مجھے اس نو وارد جوڑے کی طرف متوجہ پا کر بولا۔

”خیریت تو ہے؟“

”مجھے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”کیوں؟..... کیا تم اس خاتون کو پہلے سے جانتے ہو؟“ اس نے دبی زبان میں

پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اسے آج پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ لیکن نہ جانے کیوں میری چھٹی جس کسی آنے والے خطرے کا سگنل دے رہی ہے۔“

”پھر تم یہ کالے اور سفید کی تفریق کس وجہ سے کر رہے ہو؟“

”تمہارا کیا اندازہ ہے ان کے بارے میں؟.....“ میں نے جمال الدین سے

دریافت کیا۔

”گو برڈز (LOVE BIRDS)“ جمال الدین نے حسب معمول مسکراتے ہوئے شوخی

سے جواب دیا۔ ”یہاں دانہ چنے آئے ہیں۔ کچھ درپستائیں گے، پھر اگلی ملاقات کا وقت اور جگہ کا تعین کرنے کے بعد ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن جائیں گے۔“

”میرا خیال کچھ اور ہے۔“ میں نے کن آنکھوں سے اس جوڑے کی طرف دیکھتے ہوئے

کہا۔ ”اگر تمہارا خیال درست ہے تو پھر ان کو کسی پرسکون گوشے میں بیٹھنا چاہئے تھا، جہاں یہ چونچیں بھی لڑا سکتے۔ ہمارے قریب بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”کیفے گرائڈ میں سب چلتا ہے۔ یہاں زیادہ تر وہی جوڑے نظر آتے ہیں، جن کا تعلق

اونچے گھرانے سے ہوتا ہے۔ اونچے گھرانے والے زیادہ تر مغربی تہذیب کے دلدادہ ہوتے

ہیں اور مغربی تہذیب میں شرم و حیاء نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس لئے ان کے لئے قربتوں

اور فاصلوں کا خیال رکھنا بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔“ جمال الدین نے بے پروائی سے کہا۔

”اس لئے براہ کرم ان کا خیال دل سے نکال کر جلدی جلدی پلٹیں اور کپ صاف کرو، ہمیں

ابھی ایئر پورٹ بھی چلنا ہے۔“

میں تسلیم کرتا ہوں کہ جوانی کے اس دور میں لڑکیوں کے سلسلے میں میری شہرت کچھ زیادہ

اچھی نہیں تھی، اس لئے میں نے جمال الدین کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے جلدی جلدی چلن

سینڈوچ اور کولڈ کافی ختم کی، پھر ہم دونوں اٹھ کر باہر آ گئے۔ مین گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے میری نظر ایک بار پھر اسی میز کی جانب اٹھ گئی۔ لڑکی میری ہی طرف متوجہ تھی۔ ہماری نظریں چار ہوئیں تو اس نے بڑی مہارت سے داہنی پلکوں کو ذرا سا جھپکایا، پھر اس کے گداز ہونوں پر مخصوص مسکراہٹ ابھر آئی۔ لڑکی کی وہ حرکت اس بات کی تصدیق کرتی تھی کہ وہ کس قماش کی ہے۔ جمال الدین گیٹ سے باہر نکل چکا تھا، اس لئے میں نے وہاں رکنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ ایک سوال میرے ذہن میں ضرور چکرانے لگا۔ ”اگر وہ لڑکی مردم خور تھی تو پھر ایک شکار کی موجودگی میں اس نے مجھے آنکھ مارنے کی ضرورت کیوں محسوس کی تھی؟“ بہر حال میں نے نگاہوں کے اس تصادم اور لڑکی کی اس حرکت کا ذکر جمال الدین سے نہیں کیا۔

اس واقعے کے کئی ایک ماہ بعد میں اپنے تجربے (جس کا کوڈ ”اے ون“ تھا) سے ملا تو وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے بڑے پرجوش انداز میں کہا۔

”فیصل صاحب! میں آپ کے لئے عنقریب ایک ایسی ڈش (کیس کو وہ ہمیشہ ڈش کہا کرتا تھا) تیار کر رہا ہوں کہ آپ اسے ہڑپ کر کے خوشی سے اُچھل پڑیں گے۔“

”کوئی بڑی پھلتی ہے؟“ میں نے دہلی زبان میں پوچھا۔ ہم اس وقت ایک پرائیویٹ کار میں کلفٹن کے ساحلی علاقے پر گھوم رہے تھے اور میں نے ”اے ون“ کو کار میں بٹھانے سے پہلے اس بات کا اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ کوئی تیسرا شخص ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ ویسے بھی ”اے ون“ جس ٹھاٹس سے رہنے کا عادی تھا، اس پر تجربہ ہونے کا اندیشہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کئی بار وہ ملاقات کی غرض سے دفتر بھی آچکا تھا۔ لیکن یہ بات کسی کو بھی نہیں معلوم ہو سکی کہ اس کی اصلیت کیا ہے؟ میرے ساتھی ہم دونوں کو دوست ہی سمجھتے تھے۔

”مجھلی نہیں بلکہ مگرچھ کہئے۔ لیکن اس کو جال میں پھانسنے کی خاطر آپ کو خاصی محنت اور ٹرک سے کام لینا پڑے گا۔“ اے ون نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جتنی بڑی اسامی ہے، اتنی ہی خطرناک بھی ہے۔ دیکھنے میں تو وہ سوکھا ہوا جھینگا لگتا ہے، لیکن چاکلیٹ (ناجائز تجارت کا خاص سونا) اور فارن کرنسی کے بارے میں آج کل ہر طرف اسی کا طوطی بول رہا ہے، ہفتہ پندرہ دن میں کروڑوں کا مال ادھر سے ادھر ہوتا ہے۔ لیکن ابھی تک کوئی ایجنسی اس پر کامیاب ہاتھ نہیں ڈال سکی۔ ایک نمبر کا چلتا پڑہ ہے۔“

”تمہارا اشارہ کہیں یعقوب گاندھی کی طرف تو نہیں ہے؟“

”آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟“ اے ون نے حیرت سے پوچھا۔

”آج کل ہر طرف اسی کی شہرت ہو رہی ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”چاکلیٹ کا دھندا تو اس نے شاید ابھی شروع کیا ہے، لیکن فارن کرنسی کی اسمگلنگ کے بارے میں وہ

خاصا بدنام ہے۔“

”لیکن ابھی تک کوئی اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکا۔“ اے ون نے جواب دیا۔ ”گوٹ پھنس جانے کی صورت میں وہ ایک کی جگہ دس خرچ کر دینے میں بھی دیر نہیں لگاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مختلف محکموں کی کالی بھیڑوں کو خرید رکھا ہے، جو اسے پل پل کی خبر سے آگاہ کرتے ہیں اور ماہانہ بھتہ وصول کر رہے ہیں۔“

”کیا میرے محکمے کا کوئی آدمی بھی اس سے ملا ہوا ہے؟“

”ہو بھی سکتا ہے۔ لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لئے عرض کر دوں کہ آج کل وہ آدھا مسلمان اور آدھا ہندو (نام کی مناسبت سے) کرنسی کے بجائے چاکلیٹ میں زیادہ کما رہا ہے۔ ایک ایک وقت میں چار چار اور چھ چھ جیکٹس (Jackets) چل رہی ہیں۔“

چار چھ جیکٹوں کے بارے میں سننے کے بعد میں اور سنجیدہ ہو گیا۔ اس لئے کہ ایک جیکٹ میں سو خفیہ خانے ہوتے تھے اور ہر خانے میں دس تو لے کی چاکلیٹ ہوتی تھی۔ گویا ایک جیکٹ میں ایک ہزار تولہ سونا ہوتا تھا۔ یہ جیکٹس اتنی خوب صورتی اور مہارت سے تیار کی جاتی تھیں کہ ان میں اور دوسری جیکٹوں میں ذرہ برابر فرق بھی نہیں ہوتا تھا۔

”تمہیں یقین ہے کہ وہ ایک پھیرے میں اتنا لمبا رسک لیتا ہوگا؟“ میں نے اپنے جیلے پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

”ایک سو ایک فیصد۔“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ”اپنا تو کام ہی یہی ہے کہ دن رات ایسے آدمیوں کی تلاش کی جائے، جو ناجائز تجارت کے ذریعے ملک کو کروڑوں کا دھوکا دے رہے ہیں۔ وہ قانون کے ہتھے چڑھ جائیں تو حکومت کا بھی بھلا ہوتا اور اپنی دال روٹی بھی چلتی رہتی ہے۔ لیکن اس بار دال کی بات نہیں ہوگی۔ پارٹی اونچی ہے، اس لئے آپ کو دال میں بگھار بھی کرنا ہوگا۔“

”کیا مطلب؟“

”پندرہ فیصد۔“ اے ون نے مختصر آ کہا۔

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ تجربوں کو چونکہ حکومت کی جانب سے فوری طور پر معقول رقم نہیں ملتی تھی، اس لئے پکڑے جانے والے سونے کا دس فیصد مشیر نامہ بنانے سے پہلے علیحدہ کر کے ان کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ اس کا علم رحمان صاحب کو بھی تھا۔ میرے اور اے ون کے درمیان خاصی دوستی تھی۔ میں اکثر اس کے مال کی بھی حفاظت کرتا تھا۔ رحمان صاحب کو اس بات کا علم تھا لیکن انہوں نے اس سلسلے میں کبھی کوئی باز پرس مجھ سے نہیں کی تھی۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ جب تک کوئی فرد بذاتِ خود ناجائز تجارت نہ کرتا ہو یا اس

کاروبار میں ملوث نہ ہو، کبھی اچھا تجربہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انہوں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اس بات کی رعایت دے رکھی تھی کہ کسی تجربے کے مال پر ہاتھ نہ ڈالا جائے۔

یعقوب گاندھی جیسے اسمگلر پر ہاتھ ڈالنا کوئی آسان بات نہیں تھی، لیکن پندرہ فیصد کمیشن والی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ ایک بار تو لالچ آیا کہ بڑی چھپی کے عوض پندرہ فیصد پر بھی ہامی بھریوں۔ لیکن میرے اوپر رحمان صاحب کی خاص شفقت تھی، اس لئے میں ان کے اعتماد کو دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اے دن سے کہا۔

”پندرہ فیصد والی بات میں رحمان صاحب سے پوچھنے بغیر طے نہیں کر سکتا۔ مجھے امید ہے کہ وہ آمادہ ہو جائیں گے۔ ورنہ دوسری صورت میں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایڈوانس ریورڈ کی رقم جو مجھے ملے گی، وہ میں تمہارے حوالے کر دوں گا۔“

”آپ پہلے رحمان صاحب سے بات کر لیں، پھر دیکھا جائے گا۔“

”لیکن تمہیں وعدہ کرنا ہوگا، یہ کیس تم کسی اور کو نہیں دو گے۔“

”اس سے پہلے بھی ایسا کبھی نہیں ہوا، نہ آئندہ ہوگا۔“ اے دن نے سنجیدگی سے کہا۔

”آپ سے چونکہ اپنا کارورہ مل گیا ہے، اس لئے تجربی کام میں صرف دوستی کی وجہ سے آپ کے لئے کرتا ہوں۔ ورنہ خدا کا بڑا فضل ہے اپنے اوپر۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں نے اسپئر پارٹس کا کاروبار کر رکھا ہے، جس میں چار پیسے عزت سے مل جاتے ہیں۔ تجربی میں تو موت کا کھٹکا بھی ہر وقت سر پر لٹکتا رہتا ہے۔ اور یعقوب گاندھی۔ اگر اسے بھٹک بھی مل گئی کہ میری وجہ سے اسے کوئی بھاری نقصان ہوا ہے تو وہ مجھے تو کیا، میری سات پشتوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ بھروسے کے چھتے کو ہاتھ لگانا بڑی جان جو حکم کا کام ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ اے دن اپنی پندرہ فیصد والی مانگ میں کوئی کمی نہیں کرے گا، چنانچہ میں دوسرے ہی روز رحمان صاحب کے اپارٹمنٹ پر پہنچ گیا۔ وہ میری پوری بات بڑی توجہ سے سنتے رہے، پھر میری بات ختم ہونے کے بعد بولے۔

”آپ پندرہ فیصد پر بھی اس کے ساتھ سوداؤں کر لیجئے۔ لیکن اس شرط پر کہ وہ کم از کم چار جیکٹ کا کیس پکڑوائے گا۔ اس سے کم پر وہی دس فیصد دیا جائے گا۔“

”رائٹ سر۔“

”ایک بات اور۔“ رحمان صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”کیس پکڑنے کے سلسلے میں آپ اموشنل ہونے کی غلطی نہیں کریں گے۔ اور جب تک میں نہ کہوں، آپ یعقوب گاندھی پر ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔“

”رائٹ سر!“ میں نے بڑے مہذب لہجے میں کہا اور رحمان صاحب کو سیلوٹ جھانڑتا ہوا ان کے اپارٹمنٹ سے باہر آ گیا۔

حسب وعدہ تین روز بعد میں نے اپنے مخبر سے دوبارہ ملاقات کی۔ اس بار ملاقات ہاکس بے کے ایک ہٹ میں ہوئی۔ اس ہٹ کا بندوبست بھی اے دن نے کیا تھا۔ میں وعدے کے مطابق وہاں پہنچا تو وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے ساتھ ایک شخص اور بھی تھا جو لباس کے اعتبار سے متوسط درجے کا کوئی فرد نظر آتا تھا۔ صورت شکل بھی بس واجبی تھی، لیکن وہ ایک اعلیٰ برائڈ کا سگریٹ پی رہا تھا۔ اے دن نے مجھ سے فون پر جگہ اور وقت کا تعین کرتے وقت یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی اور شخص بھی ہوگا، چنانچہ میں اپنی جگہ محتاط ہو گیا۔ کچھ دیر تک میرے اور مخبر کے درمیان تفریحی قسم کی باتیں ہوتی رہیں، تیسرا شخص مسکین صورت بنائے ہماری گفتگو سن رہا۔ اس کے بارے میں میری تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ چنانچہ جب میں نے اشاروں میں اپنی کیفیت کا اظہار کیا تو اے دن نے مسکرا کر کہا۔

”یہ میرا پرانا ساتھی سلیم گھانچہ ہے۔ کسی زمانے میں ہم دونوں نے مل کر ایک ساتھ چاکلیٹ کا بزنس اختیار کیا تھا۔ یہ بڑے کام کا آدمی ہے، کراچی کے علاوہ اندرون سندھ کے چپے چپے سے بھی واقف ہے۔ اس کے علاوہ ڈھاکہ کے گلی کوچے بھی اس کے دیکھے بھالے ہیں۔ دو تین سال تک ہم دونوں ساتھ ساتھ کام کرتے رہے۔ پھر یہ ایک بڑی اونچی پارٹی کے ساتھ مل گیا۔ آج کل بھی یہ اسی پارٹی کے لئے کام کر رہا ہے۔“ اے دن نے اس سے اپنی بے تکلفی کا اظہار کرنے کی خاطر ایک ہلکی پھلکی گالی بکتے ہوئے کہا۔ ”اس کی صورت شکل اور لباس پر نہ جائیے گا، یہ حلیہ تو اس نے مختلف چھاپہ مارا۔ جینسیوں سے بچنے کی خاطر بنا رکھا ہے، ورنہ آج کل تو اس کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑا ہی میں ہے۔ دونوں مٹھیاں بھر بھر کر بڑا بگڑا مال کما رہا ہے۔“

تمہید چونکہ زیادہ طول پکڑتی جا رہی تھی، اس لئے میں نے اپنے مخبر سے پوچھا۔ ”تم نے یہ نہیں بتایا کہ گھانچہ بھائی آج کل کس کے لئے کام کر رہے ہیں؟“

”میں کوئی چار پانچ سال سے یعقوب گاندھی کے ساتھ ہوں۔“ اس بار اے دن کے بجائے خود سلیم گھانچہ نے جواب دیا۔ ”میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ ہمارے کھوئی ہر محکمے کے ایسے بندوں پر نظر رکھتے ہیں جو ہمارے بجائے حکومت کے زیادہ خیر خواہ ہوتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے مقابلے میں حکومت ان کو روپے میں دو آنے بھی نہیں دیتی۔“

”تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”آپ کا نام فیصل ہے۔ آپ کا تعلق لینڈ کسٹم کے انٹیلی جینس کے شعبے سے ہے۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جنٹرفری صاحب سے آپ کی کوئی عزیز داری بھی ہوتی ہے۔ رحمان صاحب آپ پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کرتے ہیں۔ جمال الدین صاحب اور آپ ایک دوسرے کے بہت

گہرے دوست ہیں اور یہ کہ آپ نے اب تک سونے کے جتنے کیس پکڑے ہیں، وہ کسی آفیسر نے نہیں پکڑے۔“ سلیم گھانچی نے گویا ایک ہی سانس میں میرے بارے میں اپنی تمام معلومات بیان کر ڈالیں، پھر سگریٹ کا ایک لمبا کش لگا کر بولا۔ ”اگر آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات اور بھی بتا دوں؟“

”وہ کیا؟“

”خوب صورت چھو کر یوں کے معاملے میں آپ کی پرواز کسی جیٹ طیارے سے کم نہیں ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”آپ کہیں تو آٹھ دس کے نام بھی گنوا سکتا ہوں۔“

”میرا خیال ہے کہ پہلے کام کی بات ہو جائے۔ دوسری باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔“ اے دن نے جلدی سے کہا، پھر سنجیدگی سے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”در اصل بات یہ ہے فیصل بھائی! کہ ادھر کچھ عرصے سے یعقوب گاندھی نے اپنے یار کے علاوہ دو چار مرغنے اور بھی پال رکھے ہیں۔ کسی بھی بزنس میں جتنے شراکت دار بڑھتے جائیں، اتنے ہی کسی آمدنی بھی ہٹتی جاتی ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ یعقوب گاندھی کو کوئی ایسا چھوٹا موٹا سبق سکھایا جائے کہ اسے کھوئے اور کھرے کی تمیز کرنی آجائے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے براہ راست سلیم گھانچی کو ٹٹولا۔

”اپنا ایسا خیال نہ ہوتا تو میں ادھر آپ کے رو برو نہ بیٹھا ہوتا۔“

”کیا تم اس معاملے میں براہ راست میری مدد کرو گے؟“ میں نے اسے اور پکا کرنے کی خاطر کہا۔ ”میرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم دوسرے مرغنوں میں سے کسی ایک کو پکڑو تو تمہارا کام بھی ہو جائے گا اور تمہارا نام بھی درمیان میں نہیں آئے گا۔“

”یہ آپ کا خیال ہے۔“ میں نے بڑے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔ ”ہم جس لائن کے لوگ ہیں، وہاں باپ بیٹے پر اور بیٹا باپ پر بھی شبہ کرتا ہے۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ اگر کشتی میں کوئی سوراخ ہو جائے اور پانی بھرنے لگے تو پھر کسی کے کپڑے بھی سوکھے نہیں رہتے۔ یہی دستور ہمارے بزنس کا ہے۔ کوئی مال کسی کی غلطی سے بھی تھمو ہو جائے (پکڑا جائے) تو سیٹھ سب کوشے کی نظروں سے دیکھتا ہے اور جب تک اصل بندے کا پتہ نہ چل جائے، وہ چین سے نہیں بیٹھتا۔“

”ایسی صورت میں تو اگر میں نے تمہارے سیٹھ کو پکڑ لیا یا اس کے مال پر چھاپ مارا تو وہ تم پر بھی ضرور شک کرے گا۔“ میں نے اسے مزید کریدنے کی خاطر پہلو بدل کر کہا۔ ”جس طرح تم لوگ ہمارے محکموں کے افسران کے پیچھے لگے رہتے ہو، اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بھی تم لوگوں کی نگرانی کراتا ہو اور اسے اپنے خاص آدمی کے ذریعے تم لوگوں کے بارے میں بھی پل پل کی خبر ملتی رہتی ہو۔“

”آپ کا خیال غلط نہیں ہے، صاحب!“ وہ تیزی سے بولا۔ ”ہمارے اوپر بھی جاسوسی کرنے والے موجود ہوتے ہیں۔ لیکن ہم اپنے سائے کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ ایک جگہ پہنچنے کی خاطر اگر آپ سیدھے راستے کے بجائے دس بارہ اُلٹے راستے اختیار کریں تو اس کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ کوئی کھوجی پیچھے لگا ہے یا نہیں۔ اور پھر میں تو دس گیارہ سال کی عمر سے اسی دھندے میں سانس لے رہا ہوں۔“

سلیم گھانچی مجھے ضرورت سے کچھ زیادہ زیرک اور تجربہ کار نظر آ رہا تھا۔ ایک آدھ بار میرے تجربے اشارے کنایوں میں مجھ سے کہا تھا کہ میں آنکھ بند کر کے اس پر اعتبار کر سکتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود ایک اہم سوال رہ رہ کر میرے ذہن میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہا تھا۔ ”اگر سلیم گھانچی، یعقوب گاندھی کا خاص آدمی تھا اور اس کے ذریعے ہزاروں اور لاکھوں کماتا رہا تھا تو پھر وہ ان کے خلاف مجبری کیوں کرنا چاہتا تھا؟“ میں نے جب ڈھکے چھپے لفظوں میں اس پر اپنے خیال کا اظہار کیا تو وہ مسکرا کر بولا۔

”مجھے یقین تھا کہ آپ یہ سوال ضرور کریں گے۔“ اس نے ایک سگریٹ پھینک کر دوسرا جلایا، پھر تھوڑے توقف سے بولا۔ ”اگر بات مردوں کی حد تک محدود رہتی تو شاید میں اس وقت آپ کے سامنے نہ ہوتا۔ لیکن جب معاملہ زر، زن اور زمین کا آجائے تو پھر سب کچھ جائز ہو جاتا ہے۔“

”تمہارے ساتھ کیا معاملہ درپیش ہے؟ زر کا، زن کا یا زمین کا؟“ میں نے قدرے بے تکلفی سے دریافت کیا۔

”زر اور زمین کے معاملے میں اللہ کا بڑا فضل ہے صاحب! لیکن زن کے معاملے میں،

میں بھی آپ ہی کی طرح اپنی ہار کبھی تسلیم نہیں کرتا۔ چاہے جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔“

”اوہ!“ میں مسکرایا۔ ”میرے بارے میں تم نے خاصی معلومات اکٹھا کر رکھی ہیں۔“

”مجھے تو یہ بھی معلوم ہے صاحب! کہ آپ بھی حکومت کو تھوڑا بہت چونا لگاتے رہتے ہیں۔“ اس نے معنی خیز لہجہ اختیار کیا۔ ”آپ کی پہنچ جہاز کے کاک پٹ تک ہے، مجھے اس کی بھی خبر ہے اور جس بندے کا مال آپ کراچی سے ڈھاکا روانہ کرتے تھے، مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے۔“

میں نے سلیم گھانچی کے خیال کی نفی کرنے کے بجائے محض مسکرا کر خاموش ہو جانے پر اکتفا کیا۔ لیکن یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک پارٹی کو ٹریپ کرنے کی خاطر اور اس کے کسی بڑے کنسائنمنٹ پر ہاتھ ڈالنے کی خاطر میں نے رحمان صاحب کی اجازت ہی سے اس کی دو چار چھوٹی چھوٹی ٹھیکیں ڈھاکا بھجوائی تھیں۔ جہاں تک کاک پٹ تک رسائی کا معاملہ تھا، اس میں بھی رحمان صاحب ہی نے میری مدد کی تھی اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کر

کے ہوائی کمپنی کے ایک کیپٹن سے میری ملاقات کرا دی تھی۔ مجھے خصوصی طور پر یہ رعایت حاصل تھی کہ میں بغیر کسی روک ٹوک کے کاک پٹ تک جاسکتا تھا۔ اس کیس میں خدا کا شکر ہے کہ مجھے کسی شرمندگی کا سامنا نہیں ہوا اور میں پارٹی کی ایک بڑی کھپ پکڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بہر حال، مجھے اس بات پر حیرت ضرور ہو رہی تھی کہ سلیم گھانچی کو اتنے اندر کی بات کس طرح معلوم ہوئی؟

”تم ابھی زن کے معاملے کی کوئی بات کہہ رہے تھے۔“ میں نے اس کے آخری جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”قصہ کیا ہے؟“

”میں بتاتا ہوں۔“ اے دن نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”آج کل یعقوب گاندھی بھی ایک خوب صورت لڑکی کے سلسلے میں لنگوٹ کا کچا ہو رہا ہے۔ اپنے پرانے ساتھیوں کو نظر انداز کر کے وہ اس لڑکی کو فائدہ پہنچانا چاہتا ہے۔“

”لڑکی کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ اور وہ تمہارے سیٹھ کے لئے کیا خدمت انجام دے رہی ہے؟“ میں نے سلیم گھانچی سے دریافت کیا۔

”آپ اسے ایک بار دیکھ چکے ہیں۔“ سلیم گھانچی مسکرا کر بولا۔ ”آپ کو لائن دینے کی خاطر اس نے آپ کو آنکھ بھی ماری تھی۔ لیکن بات اس سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ آپ چونکہ جمال الدین صاحب کے ساتھ زیادہ اٹھتے بیٹھتے ہیں، اس لئے سیٹھ نے اس حرافہ کو چارہ ڈالنے سے روک دیا۔ بہت سے دوسرے لوگوں کے علاوہ سیٹھ کا بھی یہی خیال ہے کہ جمال الدین صاحب بکاؤ مال نہیں ہیں۔“

آنکھ مارنے کے حوالے سے میرے ذہن میں وہی لڑکی ابھر آئی، جس کو میں نے پہلی بار کیفے رائٹ میں ایک سوئڈ بوئڈ نو جوان کے ساتھ دیکھا تھا۔ میں نے سلیم گھانچی کو کیفے گرائڈ کا حوالہ دیا تو اس نے مسکرا کر ہلکا سا طنز کیا۔

”میں جانتا ہوں صاحب! خوب صورت لڑکیوں کے بارے میں آپ کا ذہن کسی آٹومیک مشین ہی کی طرح کام کرتا ہے۔“

”وہ لڑکی تمہارے سیٹھ کے لئے کیا کام سرانجام دیتی ہے؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”متعلقہ محکمے کے کسی ایسے آفیسر کو اپنے حسن کے جال میں پھانسنے کا جو مال ادھر سے ادھر کرنے میں سیٹھ کے کام آسکے۔“

”کیا تم بھی اس لڑکی میں دلچسپی لے رہے ہو؟“

”پہلے لے رہا تھا، لیکن اب نہیں۔“ سلیم گھانچی نے کسی زہریلے سانپ کی طرح مل کھا کر جواب دیا۔ ”میں اس پر ہزاروں خرچ کرتا رہا ہوں، لیکن یہ بھی میری ہی حماقت تھی کہ

ایک بار میں نے سیٹھ کے کہنے پر ان دونوں کی ملاقات کرا دی۔ شاید اپنے ہی کسی آدمی نے سیٹھ تک میرے اور مونا کے چکر کی خبری کر دی تھی۔“

وہ ایک لمحے کو رکا، پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔

”مونا اس کا اصلی نام نہیں ہے۔ وہ مختلف لوگوں سے مختلف ناموں سے ملتی ہے۔ دولت اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ وہ راتوں رات کروڑ پتی بننے کے خواب دیکھتی ہے۔ اسی خواب کی خاطر وہ اپنے آپ کو بھی لٹانے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیتی۔ بہر حال سیٹھ نے پہلی ہی ملاقات میں اسے بطور چارہ استعمال کرنے کی ٹھان لی۔ جانے اس نے مونا کو کیا چکر دیا کہ اب وہ صرف اسی کی ہو کر رہ گئی ہے۔ میرے سامنے آتی ہے تو اس طرح آنکھ پھیر لیتی ہے، جیسے ہم پہلے کبھی ایک دوسرے سے ملے ہی نہ ہوں۔“

”کیا مونا پھپی (مال لے جانے) کا کام بھی کرتی ہے؟“

”جی نہیں..... وہ صرف کام کے افسران کو پھانسنے کا کام کرتی ہے اور سیٹھ اس کے عشق میں چکر گھسی (دیوانہ) ہو رہا ہے۔ دونوں ہاتھ سے اس کی ایک ایک مسکراہٹ پر مال لٹا رہا ہے۔“

”سمجھ گیا۔ گویا تم مونا سے انتقام لینے کی خاطر اپنے سیٹھ کو پکڑوانا چاہتے ہو۔“

”بالکل یہی بات ہے۔“ اے دن نے تیزی سے کہا۔ ”سیٹھ چونکہ اپنے یار اور مونا کے چکر سے واقف ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے کہنے پر اپنے یار کا پٹا ہی کاٹ دے۔ ہم وہ وقت آنے سے پہلے ہی ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہیں اور آپ کو اس سلسلے میں میرے یار کی مدد کرنی پڑے گی۔“

”ایک تیر سے دو شکار..... میں سمجھا نہیں؟“

”میں سمجھاتا ہوں۔“ سلیم گھانچی نے سرسراتے انداز میں کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ سیٹھ کا مال بھی پکڑا جائے اور اس کے ساتھ ہی مونا کو بھی کوئی شدید نقصان اٹھانا پڑے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں اس کے لئے تیار ہوں۔“

”پندرہ فیصد والی بات کا کیا بنا؟“ اے دن نے پوچھا۔

جواب میں، میں نے اسے رحمان سے ہونے والی گفتگو اپنی طرف سے سنا دی۔

”فیصل صاحب! مجھے اُمید تھی کہ آپ اس کیس میں میری شرط ضرور مان لیں گے۔ رہا مال کا سوال تو آپ مطمئن رہیں، دو چار جیکٹ سے زیادہ ہی ہوگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کیس آپ کی سروس کا سب سے بڑا کیس ثابت ہو۔“

”تمہارے ذہن میں کیا پلان ہے؟“ میں نے اے دن سے دریافت کیا۔

”پلان تو بہت سے ہیں جی۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ کوئی ادھما ہاتھ نہ ڈالا جائے۔“

سلیم گھانچی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ویسے بھی ہمیں سب کام بڑی احتیاط اور رازداری سے کرنا ہوگا۔ سیٹھ کو اگر میرے بارے میں شبہ بھی ہو گیا تو میری لاش کے ٹکڑے کر کے سمندر میں پھینکوا دے گا۔ مال پکڑے جانے کے بعد وہ بالکل ہی جنونی ہو جاتا ہے۔ اپنے دو آدمیوں کو پہلے بھی قتل کرا چکا ہے، جن میں سے ایک تو بالکل ہی بے قصور تھا۔“

”تم اس کی فکر نہ کرو۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔ ”اے دن میرے ساتھ ایک عرصے سے کام کر رہا ہے، لیکن آج تک کسی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی کہ کون میرے لئے خبری کا کام کرتا ہے۔“

”بس، پھر معاملہ طے سمجھئے۔“ سلیم گھانچی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں بہت جلد کوئی معاملہ فٹ کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”ایک بات اور۔“ میں نے پوچھا۔ ”تم نے اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں بتایا، جسے میں نے موتا کے ساتھ کینے گرائڈ میں دیکھا تھا۔“

”اس کا نام ہاشم ہے۔ صرافے میں اس کے باپ کی دکان ہے۔“ اے دن نے جواب دیا۔ ”باپ کھاتا ہے اور بیٹا لڑکیوں پر اڑاتا ہے۔“

”کیا ہاشم کو موتا کی اصلیت کا علم ہے؟“

”جی نہیں۔“ سلیم گھانچی نے ایک مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے کہا۔ ”ان کے درمیان شیریں فرہاد کا ڈراما الگ ہی الگ چل رہا ہے۔“

اس کے بعد ہمارے درمیان سیٹھ یعقوب گاندھی کے بارے میں کچھ اور ضروری باتیں ہوئیں، پھر ہم وقفے وقفے سے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

اس ملاقات کے کوئی دو ہفتے بعد میں دفتر میں بیٹھا اپنے ساتھی انسپٹر ان سے خوش گپوں میں مصروف تھا، جب ایک سپاہی نے آکر مجھے اطلاع دی کہ کسی عثمان بھائی کا فون ہے۔ ٹیلی فون چونکہ جنرل فون پر آیا تھا، چنانچہ مجھے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آنا پڑا، جہاں ایک کلرک فون انینڈ کرنے کی ڈیوٹی پر موجود تھا۔ اس وقت شام کے ساڑھے چھ بجے تھے۔ عثمان بھائی میرے لئے ایک نیا نام تھا۔ بہر حال جب میں نے ریسپور اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری جانب سے اے دن کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے کسی اہم ضرورت کے تحت نام بدل کر فون کیا ہوگا۔

”میں اس وقت لیبیلہ چوک سے بول رہا ہوں۔ آپ وقت ضائع کئے بغیر آجائیے، مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“

ضروری بات ہماری لغت میں بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اے دن کے پاس یقیناً کوئی ایسی اہم اطلاع تھی، جو مجھے فوری طور پر دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے دفتر کی جپ لینے کے

بجائے باہر نکل کر ایک ٹیکسی پکڑی اور لیبیلہ چوک کی طرف روانہ ہو گیا۔ اے دن مجھے چوک سے پہلے ہی اُلٹے ہاتھ پر کھڑا مل گیا۔ ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد اس نے شیش محل ہوٹل چلنے کی فرمائش کی، جو کھارادر میں واقع تھا۔ راستے میں ہمارے درمیان بے تکلف دوستوں کی طرح گفتگو ہوتی رہی۔ پھر جب ہم شیش محل ہوٹل پہنچ کر ایک فیملی روم میں داخل ہوئے تو اے دن نے بیرے کو چائے اور بسکٹ وغیرہ کا آرڈر دیا۔ پھر اس کے جانے کے بعد دبی زبان میں بولا۔

”فیصل صاحب! میں چاہتا ہوں کہ آپ فوری طور پر جمال الدین صاحب، یا پھر اپنے اعتماد کے کسی دوسرے آدمی کو یعقوب گاندھی کے گھر کی نگرانی پر تعینات کر دیں۔“

”کوئی خاص بات؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، آپ کو فون کرنے سے پہلے سلیم گھانچی میرے پاس آیا تھا، بہت جلدی میں تھا وہ۔“ اے دن نے کہا۔ ”اس کے بیان کے مطابق اس وقت یعقوب گاندھی کے فلیٹ پر پوری سات جیکبیں لوڈڈ حالت میں موجود ہیں، جو کسی وقت بھی ڈھا کا کے لئے روانہ کی جا سکتی ہیں۔“

”فلیٹ پر.....“ میں نے تعجب سے کہا۔ اس لئے کہ میری اطلاع کے مطابق یعقوب گاندھی سوسائٹی کے علاقے میں رہتا تھا۔

”ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور ہوتے ہیں۔“ اے دن نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اتنے اونچے پینے پر کام کرنے والوں کے ایک نہیں بلکہ کئی ٹھکانے ہوتے ہیں۔ وہ آئے دن اپنے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں، تاکہ متعلقہ حکموں کی نظروں سے محفوظ رہ سکیں.....“

وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ میرا ہمارا آرڈر سرور کے چلا گیا تو اے دن نے چائے بناتے ہوئے کہا۔

”میں ابھی چل کر آپ کو وہ جگہ دکھا دوں گا، جہاں جیکبیں موجود ہیں۔“

”کیا یہ سات جیکبیں بیک وقت سات مختلف افراد پہن کر ڈھا کا جائیں گے؟“

”اس کے امکانات کم ہیں..... یعقوب گاندھی جیسا ہوشیار اسمگلر اتنا بڑا رسک نہیں لے گا۔“

”گویا ہمیں پہلی کھپ نکلتے ہی اسے پکڑنا ہوگا اور ساتھ ساتھ باقی جیکبوں کے لئے اس کے فلیٹ پر چھاپ بھی مارنا ہوگا۔“

”ہاں۔ لیکن سارا کام بہت احتیاط سے ہونا چاہئے۔ سلیم گھانچی نے بتایا ہے کہ یعقوب گاندھی کے اپنے بھی دو ایک افراد پوری طرح چوکس ہیں اور فلیٹ کے چاروں طرف اس



بات کی نگرانی کرتے پھر رہے ہیں کہ کہیں کوئی آدمی اس مال کی ٹوہ میں نہ لگا ہو۔“ اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”ایک خاص بات اور بتا دوں۔ میں آپ کو ابھی جو فلیٹ دکھانے لے چلوں گا، وہ آبکاری پولیس اسٹیشن کے سامنے والی ایک گلی میں ہے، وہی راستہ بی بی بسکٹ فیکٹری تک جاتا ہے۔ مال چار منزلہ عمارت کی چوتھی منزل پر ہے۔ علاقہ گنجان ہونے کے سبب ایک عمارت کی چھت دوسری عمارت سے اتنی قریب اور ملی ہوئی ہے کہ منٹوں میں مال اوپر ہی اوپر، کہیں سے کہیں پہنچایا جاسکتا ہے۔ سلیم گھانچ کی اطلاع کے مطابق قرب و جوار کی عمارتوں میں بھی یعقوب گاندھی کے آدمی رہتے ہیں۔ اس لئے آپ کو کوئی ایسا بھرپور قدم اٹھانا پڑے گا کہ ایک جیکٹ بھی نہ نکل سکے۔“

ضروری گفتگو کے بعد اے دن نے دور سے مجھے وہ عمارت اور فلیٹ بھی دکھا دیا، جہاں مال موجود تھا۔ اس اہم اطلاع کے ملنے کے بعد میرے اندر خون کی گردش خاصی تیز ہو گئی۔ میری خواہش تھی کہ میں پہلی فرصت میں سونے کی اس کثیر مقدار کو پکڑ کر رحمان صاحب اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے حلقے میں زیادہ اونچا مقام حاصل کر سکوں۔ وہ جوانی اور جذبات کا زمانہ تھا، چنانچہ اسی رات میں رحمان صاحب سے ملا۔ وہ بڑی توجہ سے میری باتیں سنتے رہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ان کے چہرے پر بھی خون کی تمازت بڑھ رہی تھی۔ جب میں انہیں اے دن سے ملنے کی پوری روداد سنا چکا تو انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

”اب آپ کا کیا پلان ہے؟“

”سر! اگر آپ مجھے سرچ وارنٹ دے دیں تو میں کل صبح ہی وہاں ریڈ کر دوں۔“

”کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کی ریڈ کامیاب ہوگی؟“

”لیس سر!“

”گڈ!“ رحمان صاحب نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر دوسرے ہی لمحے بے حد سنجیدگی سے بولے۔ ”مسٹر فیصل! میرا خیال ہے کہ آپ ابھی انٹیلی جنس برانچ کے لئے پوری طرح سے میچور نہیں ہوئے۔“

”میں سمجھا نہیں سر!“ میں نے ہٹا کر دریافت کیا۔ یہاں یہ بھی بتانا چلوں کہ رحمان صاحب نہ صرف یہ کہ بے حد محنتی اور ایماندار آفیسر تھے، بلکہ اپنے ماتحتوں کا ہمیشہ بہت خیال رکھتے تھے۔

”آپ کا کیا خیال ہے؟“ رحمان صاحب نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ”کیا آٹھ لاکھ کا سونا (اس زمانے میں سونے کی قیمت کراچی میں ایک سو دس، ایک سو پندرہ روپے اور ڈھاکا میں اسی مناسبت سے ایک سو چالیس اور پینتالیس ہوا کرتی تھی) ہمارے محکمے کے کسی ذمے دار آفیسر سے زیادہ قیمتی ہو سکتا ہے۔“

”لیکن سر!“ میں نے سہمے سہمے مگر جذباتی لہجے میں کہا۔ ”دیر ہونے کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ مال ادھر سے ادھر ہو جائے اور ہم کامیاب نہ ہو سکیں۔“

”ڈونٹ وری اینڈ نیور مائنڈ۔“ رحمان صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ ”اگر سات ہزار تو لے سونا ہمارے قبضے میں آنا ہے تو آکر رہے گا۔ ورنہ آپ کچھ بھی کر لیں، ہوگا وہی جو ہونا ہے۔“

”پھر آپ کا کیا حکم ہے سر؟“

”آپ ذاتی طور پر صرف اتنا کریں کہ مسٹر جمال الدین کو بھیس بدل کر اس فلیٹ کی نگرانی پر مامور کر دیں۔ وہ ایک ذمہ دار، ایماندار اور بھرپور صلاحیتوں کا مالک شخص ہے۔ آئی لائیک ہم ویری جُج! مجھے یقین ہے کہ وہ ترقی کرے گا۔“

”مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ میں نے دبی زبان میں پوچھا۔

”جب تک کیس مکمل نہ ہو جائے، آپ زیادہ تر دفتر سے دور ہی رہنے کی کوشش کریں۔ ہو سکتا ہے، یعقوب گاندھی کے لوگ بھی ہمارے دفتر کی نگرانی پر مامور ہوں۔ لیکن آپ فون پر روزانہ مجھ سے کنٹیکٹ رکھیں گے۔ باقی کیا کرنا ہے، کیس کو کس انداز میں پلان کرنا ہے اور کب ہمیں ریڈ کرنی ہوگی، یہ سارے معاملات میں مسٹر جعفری سے طے کر لوں گا۔“

میں نے رائٹ سر! کہہ کر اٹھنے کی کوشش کی۔ اس وقت اس خیال سے میرے جذبات کو ٹھیس پہنچی تھی کہ اگر فوری طور پر کوئی اقدام نہ کیا گیا اور اتنا بڑا کیس ہاتھ سے نکل گیا تو کیا ہو گا؟ رحمان صاحب میں جہاں اور بہت ساری خوبیاں تھیں، وہاں چہرہ شناسی میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ میرے چہرے کے تاثرات کو پڑھتے ہوئے بولے۔

”مسٹر فیصل! چویشن کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ کوئی بڑے سے بڑا کیس بھی میری نظروں میں اپنے کسی آفیسر کی زندگی کے مقابلے میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ آپ نے مجھے جو انفارمیشن دی ہے، مجھے اس پر سو فیصد یقین ہے۔ رہا اے دن کا معاملہ تو اگر خدا نخواستہ کیس ہاتھ سے نکل گیا، پھر بھی میں حسب وعدہ اسے کمپنسیٹ (Compensate) ضرور کروں گا۔ آئی ہوپ دیٹ ناؤ یو آر سیٹفائد۔“

”لیس سر!“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر سلیوٹ کر کے رحمان صاحب کے اپارٹمنٹ سے باہر آ گیا۔

میرے عزیز ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جعفری صاحب اور رحمان صاحب کسی زمانے میں الہ آباد یونیورسٹی میں کلاس فیلورہ چکے تھے، اس لئے رحمان صاحب ان کے ساتھ ساتھ میرا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ لیکن اس وقت نہ جانے کیوں مجھے ان کا فیصلہ پسند نہیں آیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک پرانے اور تجربہ کار آفیسر تھے اور میں ایک نوآموز اور جذباتی انسان تھا، جسے

کسی کیس کو پکڑنے کے بعد ایک عجیب قسم کی برتری کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے اندر یہ خواہش رہتی ہے کہ وہ دوسروں پر سبقت لے جائے اور ان کے سامنے گردن اونچی کر کے چلے۔ رحمان صاحب نے ہم تمام ایشیائی جنس افسران کے اندر ایسا ہی جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ بہر حال میرے لئے رحمان صاحب کے حکم سے مفر کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جمال الدین پر مجھے پورا پورا اعتماد تھا، اس لئے میں نے اسے مختصر حالات سے آگاہ کیا اور مطلوبہ فلیٹ پر نظر رکھنے کی ذمہ داری سونپ دی۔ آپ شاید اس بات پر یقین نہ کریں گے کہ جمال الدین نے اسی روز سے ابھیس بدل کر مطلوبہ فلیٹ کو نظر میں رکھنے کی خاطر ایک سبزی کا ٹھیلہ لگا لیا تھا اور اس مہارت سے اپنے آپ کو اس رنگ میں رنگا تھا کہ وہ کوئی خاندانی اور پیشہ ور سبزی فروش ہی نظر آتا تھا۔

رحمان صاحب کے حکم کے مطابق میں نے دفتر آنا جانا بھی کم کر دیا تھا۔ ہفتے دس روز میں ایک چکر لگایا کرتا تھا۔ لیکن رحمان صاحب اور اے ون سے میرا روزانہ رابطہ رہتا تھا۔ جو کچھ مجھے اے ون سے معلوم ہوتا، میں اسے رحمان صاحب کے علم میں لے آتا تھا۔ میں جب بھی ان سے ریڈ کرنے کی گزارش کرتا، وہ ایک ہی جواب دیتے۔ ”ڈونٹ وری! سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔“ میں نے ایک دو مرتبہ جعفری صاحب سے بھی معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کیا کارگزاری کر رہے ہیں لیکن وہ بھی بڑی خوب صورتی سے مجھے ٹال گئے۔ حالات کے پیش نظر میری الجھن روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ ایک فطری بات تھی۔ میں نے جس کیس کی انفارمیشن دی تھی، وہ صرف میرے لئے نہیں بلکہ پورے محکمے کے لئے ایک مثالی کیس ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن خود مجھے بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس کے بارے میں کیا لائحہ عمل اختیار کیا جا رہا تھا۔

اس روز میں دفتر گیا تو میرا موڈ کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، میری طبیعت میں ایک قسم کا چڑچڑاپن آ گیا تھا۔ دفتر میں داخل ہونے کے بعد ابھی میں کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ سپرنٹنڈنٹ سراج الدین کا بلاوا آ گیا۔ میں جانے کے لئے اٹھا تو میرے سامنے اسپیکر اکبر خان نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”یہ کدو خان (اکبر خان) نے کچھ زیادہ ہی پستہ قد ہونے کی وجہ سے سپرنٹنڈنٹ کو اسی لقب سے نواز رکھا تھا) چار پانچ روز سے تمہارے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ کل تمہارے ہی سلسلے میں اپنے جعفری صاحب کی بھی اس سے منہ ماری ہو چکی ہے، اس لئے تم گرمی سے کام نہ لینا۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لئے ایک اور بھی گرما گرم خبر ہے۔“

”وہ کیا؟“

”اپنے کدو خان صاحب آج کل عشق فرما رہے ہیں اور وہ بھی اپنے سے ڈیڑھ گئی لمبی

خاتون سے۔ بقول ابن صفی کے، دونوں ڈیڑھ متوالے لگتے ہیں۔“ اکبر خان نے جو ہا کی کا بین الاقوامی کھلاڑی رہ چکا تھا اور سپرنٹنڈنٹ کو بقول شخصے گھاس ڈالنے کا بھی عادی نہیں تھا، مسکراتے ہوئے کہا۔ ”شاید وہ اس وقت بھی موجود ہو۔ اس کی موجودگی میں کدو خان کچھ زیادہ ہی اکڑفوں دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔“

اکبر خان کی بات سننے کے بعد میں سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں داخل ہوا تو جیسے مجھے الیکٹرک شاک سا لگا۔ اکبر خان نے جس خاتون کا ذکر کیا تھا، وہ اس وقت بھی سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ کرسی جوڑے بیٹھی تھی اور وہ مونا کے سوا کوئی اور نہیں تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ایسے فاتحانہ انداز میں مسکرائی، جیسے اس نے دشمن کا کوئی اہم قلعہ تسخیر کر لیا ہو۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے پہچان گئی تھی۔ لیکن میں دیدہ و دانستہ انجان ہی بنا رہا۔ سپرنٹنڈنٹ کے اشارے پر میں جب ایک کرسی پر بیٹھ گیا تو اس نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

”میری اطلاع کے مطابق آپ آج کل پورے پورے ہفتے بغیر کسی درخواست کے غائب رہتے ہیں۔“

”جی ہاں۔“ میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”کچھ گھریلو مصروفیات ہیں، جن میں الجھا ہوا ہوں۔“

”مسٹر فیصل! آپ ایک ذمہ دار افسر ہیں اور آپ کو اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔“ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”آپ کے دوست اور ساتھی جمال الدین صاحب بھی کئی دنوں سے نظر نہیں آرہے ہیں۔“

”مجھے جمال الدین کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ اس لئے کہ میں خود اپنے گھریلو معاملات میں الجھا ہوا ہوں۔“ میں نے اسے دوبارہ اپنے بارے میں بتایا۔

”کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ دونوں میرے علم میں لائے بغیر کسی کیس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں؟“ سپرنٹنڈنٹ نے مجھے ناولتی نظروں سے دیکھا۔

”میں فی الحال کسی کیس پکڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“ میں نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ میں رحمان صاحب سے مل کر اپنے تبادلے کی درخواست بھی کروں۔“

”ایسی کیا بات ہے، جو آپ اس قدر دل برداشتہ ہو رہے ہیں؟“ اس بار سپرنٹنڈنٹ کے لہجے میں چالوسی کا عنصر بھی شامل تھا۔ ”کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“

”شکریہ سہرا۔“

”کیا آپ کو واقعی جمال الدین کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے؟“ وہ پھر سنجیدہ ہو گیا۔

”اکبر خان نے غلط نہیں کہا تھا، مونا کی موجودگی میں وہ کچھ زیادہ ہی شان جھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔“

کے جھنڈے گاڑ چکے ہیں اور ان علاقوں سے بے شمار کیسز بھی پکڑ چکے ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کے ساتھ جا کر ان علاقوں کا تھوڑا بہت سروے کرادیں۔“ سپرنٹنڈنٹ نے اپنا جملہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں اس کام کے لئے کسی اور کو مامور کر سکتا تھا، لیکن مجھے آپ پر زیادہ اعتماد ہے۔“

میں نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا اندازہ تھا کہ یعقوب گاندھی مونا یا ناہید کے ذریعے سراج الدین کو خرید چکا ہے۔ ہو سکتا تھا، کسی وجہ سے کراچی میں میری موجودگی بھی اسے ناپسند ہو۔ اسے میرے بارے میں یہ شبہ ہو گیا ہو کہ کراچی میں میری موجودگی اس کے سات ہزار تونہ سونے کے لئے بھی خطرناک ہو سکتی تھی (میں زیادہ تر سونے کے ہی کیسز پکڑنے میں مہارت حاصل کر چکا تھا، جس کی وجہ میری ذاتی قابلیت کم اور اے ون کی تجربی زیادہ تھی) یہ بھی ممکن تھا کہ سراج الدین کو جمال الدین کی غیر حاضری کی وجہ سے میرے اوپر کسی قسم کا شک ہو گیا ہو اور وہ مجھے وقتی طور پر کراچی سے دور رکھنا چاہتا ہو۔ بہر صورت مجھے ناہید یا مونا کے ساتھ سندھ کے اندرونی علاقوں میں بھیجنے میں سپرنٹنڈنٹ کی کوئی نہ کوئی سازش ضرور تھی۔

”آپ تو سوچ میں پڑ گئے۔“ اس نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔ ”میں عرض کر چکا ہوں سراج کہ آج کل مجھے کچھ گھریلو پریشانیاں لاحق ہیں۔ اس لئے میں فی الحال کراچی سے باہر نہیں جاسکتا۔“

”اور آپ دفتر سے غیر حاضر رہنے کی درخواست بھی نہیں دے سکتے۔“ سپرنٹنڈنٹ اپنی اصلیت پر اتر آیا، طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”جعفری کی وجہ سے۔“

”پلیز سراج!“ میں نے تیزی سے کہا۔ ”مسٹر جعفری سے میری رشتہ داری صرف گھریلو تک محدود ہے۔ جہاں تک غیر حاضر رہنے کا تعلق ہے تو میں ابھی آپ کو ایک مہینے کی درخواست لکھ کر دیئے دیتا ہوں۔“

”مسٹر فیصل!“ سراج الدین نے آخری حربہ استعمال کرنے کی کوشش کی۔ ”آپ نے وہ محاورہ ضرور سنا ہوگا کہ دریا میں رہ کر مگر مجھ سے بیر لینا دانش مندی نہیں کہلاتا۔“

”میں نے ایک محاورہ اور بھی سنا ہے۔“ میں نے تھلا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ”کبھی کے دن بڑے ہوتے ہیں اور کبھی کی راتیں۔“ پھر اس سے پیشتر کہ بات آگے بڑھتی، میں تیزی سے قدم اٹھاتا کمرے سے باہر آ گیا۔ ایک مہینے کی چھٹی کی درخواست لکھ کر آفس سپرنٹنڈنٹ کے حوالے کی اور گھر واپس آ گیا۔

سراج الدین اور مونا کو ایک ساتھ دیکھ کر مجھے رہ رہ کر یہی خیال آ رہا تھا کہ کہیں ان دونوں کی ساز باز سے میرا بننا بنایا کیس خراب نہ ہو جائے۔ شام کو بھی میرا ذہن اسی اڈھیڑ

”سراج! آئی ایم سوری۔“ میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”میں مسٹر جمال کا اسسٹنٹ نہیں ہوں، جو اس کے بارے میں ہر بات جانتا میرے لئے لازم ہو۔“

سپرنٹنڈنٹ بل کھا کر رہ گیا، مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، مونا جو مجھے برابر نکلتی باندھے دیکھ رہی تھی، بولی۔

”مسٹر فیصل! میرا خیال ہے کہ میں آپ کو پہلے بھی دیکھ چکی ہوں۔ کہاں؟ یہ یاد نہیں آ رہا۔“

”ہو سکتا ہے، آپ نے کہیں دیکھا ہو لیکن میں آپ کو آج پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش کی۔

سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ مونا کو دیکھ کر میرے ذہن کے کسی گوشے میں خطرے کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئی تھیں۔ اس نے یقیناً سپرنٹنڈنٹ کو اپنے کام کا آدمی سمجھنے کے بعد ہی تعلقات بڑھائے ہوں گے۔ سلیم گھانچی نے بھی مونا کے بارے میں مجھے خاصی تفصیل سے بتا رکھا تھا۔ میں کڑیوں سے کڑیاں ملانے میں مصروف تھا کہ مونا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ کا بھی نہ کبھی کیسے گرانڈ جانے کا اتفاق تو ضرور ہوا ہوگا۔ بڑی پرسکون جگہ ہے۔“

”میں تو کام کے سلسلے میں اکثر بڑے بڑے ہوٹلوں میں بھی جاتا رہتا ہوں۔ آپ نے خاص طور پر کیسے گرانڈ کا ہی نام کیوں لیا؟“ میں نے براہ راست مونا سے پوچھا۔

”مسٹر فیصل!“ سپرنٹنڈنٹ نے میرے جملے کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”میں ناہید میری ایک عزیزہ کی صاحب زادی ہیں۔ میں نے اس وقت آپ کو ان ہی کے ایک کام کی غرض سے بلایا تھا۔“

مجھے ایک اور جھٹکا لگا۔ سلیم گھانچی نے یہی کہا تھا کہ وہ مختلف لوگوں سے مختلف نام سے ملتی ہے۔ اس کے علاوہ سپرنٹنڈنٹ نے جس دیدہ دلیری سے اسے اپنی ایک عزیزہ کی صاحب زادی کہا تھا، وہ بھی میرے لئے کچھ کم حیرت انگیز بات نہیں تھی۔ سراج الدین یوں تو دیکھنے میں بہت معصوم اور سیدھا سادا لگتا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ اندر سے کس قدر کڑوا ہے۔ اس کے علاوہ بے انتہا رشتی بھی واقع ہوا تھا۔ رحمان صاحب بھی اس بات سے واقف تھے، لیکن سراج الدین نے والد اور رحمان صاحب کے والد کے درمیان کبھی سلام دعا رہ چکی تھی، اس لئے وہ سراج الدین کو طرح دے جاتے تھے۔ دل سے پسند نہیں کرتے تھے۔

”فرمائیے، میرے لائق کیا خدمت ہے؟“

”دراصل میں ناہید، سندھ کے پسماندہ علاقوں کے بارے میں تھیسس (THESIS) لکھنا چاہ رہی ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ آپ کھوکھرا پار سے لے کر کنری تک اپنی معلومات

نہ میں لگا ہوا تھا کہ اے دن کا فون آگیا۔ میں نے ریسپورڈ اٹھایا تو اس نے تیزی سے کہا۔  
”فیصل صاحب! میں دوبار آپ کو دفتر بھی فون کر چکا ہوں، لیکن آپ سے بات نہیں ہو سکی۔“

”کوئی اہم اطلاع؟“

”جی ہاں..... سلیم گھانچی نے ابھی دو گھنٹے پہلے مجھے فون کیا تھا۔ اس نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ یعقوب گاندھی کو اس بات کی بھٹک ل گئی ہے کہ کچھ لوگ اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔“

”جو لوگ اس قسم کے دھندے کرتے ہیں، وہ اکثر اپنے سائے سے بھی چونک جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے، یعقوب گاندھی کو بھی محض شبہ ہوا ہو۔“

”ہو سکتا ہے۔ لیکن شبہ ہونے کے بعد یہ لوگ اپنے بچاؤ کا کوئی خانہ بند نہیں ہونے دیتے۔“ اے دن نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”سلیم گھانچی کی اطلاع کے مطابق آج رات یا پھر صبح کسی وقت مال فلیٹ سے ہٹا دیا جائے گا۔ اگر آپ لوگوں نے فوری طور پر چھاپہ نہ مارا تو میری اور اس کی ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔ ناکامی کی صورت میں ہمیں پندرہ منٹ کے حساب سے کوئی ایک لاکھ کا نقصان الگ برداشت کرنا ہوگا۔“

میں اے دن کی بات سمجھ رہا تھا۔ وہ میرا قابل اعتماد تجربہ تھا۔ لیکن ایک لاکھ کی رقم کچھ اتنی معمولی بھی نہیں تھی کہ وہ اسے میری خاطر ہاتھ سے نکل جانے دیتا۔ تجربہ کیا ہی ہو، اسے تجربی کے بعد اپنی رقم کا سب سے زیادہ لالچ ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کا احساس بھی تھا کہ کچھ دوسری ایجنسیاں اتنے بڑے کیس کی خاطر بیس پرسنٹ پر مال نکالنے پر بھی آمادہ ہو سکتی تھیں۔ خود وہ اپنے لئے جو خورد برد کرتے، وہ الگ بات تھی۔ اے دن نے جس شے کا اظہار کیا تھا، اس کے پیچھے بھی مجھے سراج الدین کا ہاتھ نظر آ رہا تھا۔ دفتر سے میری اور جمال الدین کی ایک ہی وقت میں غیر حاضری نے اسے یقیناً بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہوگا۔ وہ بڑا ہی لالچی اور بد دیانت آفیسر تھا۔ روپے کی خاطر سب کچھ کر سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مونا یا ناہید کی طرف سے کوئی معقول رقم ملنے کے بعد اس نے کوئی نہ کوئی پارٹ ضرور ادا کیا ہوگا۔

بہر حال میں نے اے دن کو یقین دلایا کہ اس کا نقصان نہیں ہونے دیا جائے گا۔ پھر اسی روز اندھیرا پھیلنے کے بعد میں کسی متوقع تعاقب سے بچتا بچتا رحمان صاحب کے اپارٹمنٹ تک پہنچ گیا۔ میں نے رحمان صاحب کو پوری زوداد سنائی تو وہ بھی سوچ میں پڑ گئے۔ میں نے انہیں بہت کم غصے میں دیکھا تھا، لیکن اس وقت ان کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو رہا تھا، جو اس بات کی علامت تھی کہ انہیں بھی سراج الدین سے کم از کم اس بات کی امید نہیں تھی، وہ ان کے اعتماد کو بھی دھوکا دے سکتا ہے۔

خاصی دیر تک وہ پہلو بدلتے رہے اور کسی گہری سوچ میں غرق رہے۔ پھر تیزی سے ریسپورڈ اٹھاتے ہوئے بولے۔

”آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی سب کچھ ٹھیک کئے دیتا ہوں۔“

اس کے بعد انہوں نے فون پر جعفری صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ کچھ دیر تک کیس کے بارے میں دریافت کرتے رہے، پھر بے حد سنجیدگی سے بولے۔

”مسٹر جعفری! آپ فوری آپریشن کے لئے تمام افسران کو ریڈ سگنل دے دیں۔ ہمیں آج رات ہی وہاں ریڈ کرنا ہے اور ایک خاص بات اور نوٹ کریں۔ اس ریڈ میں سراج الدین کو پیش پیش رہنا ہوگا۔ آپ اسی وقت اس کے گھر جا کر کہیں کہ میں نے اسے فوراً بلایا ہے۔ جب وہ تیار ہو کر آپ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جائے اس کے بعد اسے اصل صورت حال سے آگاہ کیجئے گا۔ لیکن اس بات کا بڑی سختی سے خیال رکھئے گا کہ آپریشن کی اطلاع دینے کے بعد آپ اسے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی نگاہوں سے دور نہیں ہونے دیں گے۔ میں سمجھتا ہوں، لیکن یہ میرا آرڈر ہے اور میں آپ کو پورا پورا اختیار دے رہا ہوں۔ ڈونٹ ویٹ ٹائم۔ اگر وہ ایسی کوئی کوشش کرے تو آپ اسے میرے حکم سے منع کر دیں۔ اوہ یس، آپ اس کے ساتھ زبردستی بھی کر سکتے ہیں۔ میں بعد میں سب دیکھ لوں گا۔“

”آپ اطمینان رکھئے، مسٹر فیصل!“ رحمان صاحب نے فون رکھنے کے بعد کہا۔ ”ریڈ آج رات ہی ہوگی۔ لیکن میں آپ کو خاص طور پر محتاط رہنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ سراج الدین کے درمیان میں آجانے سے معاملہ سنگین بھی ہو سکتا ہے۔ بٹ ڈونٹ وری۔ میں آپ کی حفاظت کا بھی انتظام کر ادوں گا۔“

میں اٹھنے لگا تو رحمان صاحب نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔

”ون منٹ..... ریڈ کے رزلٹ سے مسٹر جعفری آپ کو آگاہ کر دیں گے۔ لیکن میں آپ کو سختی سے حکم دے رہا ہوں کہ آپ کم از کم دو ہفتے تک گھر سے باہر نہیں نکلیں گے۔ اٹ از مانی آرڈر۔“

میں یس سر کہہ کر اپارٹمنٹ سے باہر آ گیا۔ رحمان صاحب نے جعفری صاحب سے جو گفتگو کی تھی، اس سے میں نے بہ خوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ انہوں نے نہایت دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے سپرنٹنڈنٹ سراج الدین کو محض اس لئے ریڈنگ پارٹی کے ساتھ جانے کا حکم دیا تھا، تاکہ کیس پکڑے جانے کی صورت میں یعقوب گاندھی اور مونا دونوں یہی نتیجہ اخذ کریں کہ اس نے ان لوگوں کے ساتھ ڈبل گیم پلے کرنے کی کوشش کی ہے۔ گویا جو گیم سپرنٹنڈنٹ صاحب حکومت کے ساتھ کھیلنے کی سازش کر رہے تھے، اٹان ہی کو اس گیم کے جال میں پھانس دیا گیا تھا۔

گھر آنے کے بعد میں بڑی بے چینی کی کیفیت سے دوچار رہا۔ ٹیلی فون کے قریب بیٹھا میں کسی اطلاع کا منتظر تھا۔ وقت جوں جوں گزرتا جا رہا تھا، میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے صبح ایک بجے تک اسی الجھن سے دوچار رہنا پڑا، پھر فون کی کھٹی بجی تو میں نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔

”مبارک ہو، فیصل صاحب!“ دوسری جانب سے اے دن کی آواز ابھری۔ ”کیس پکڑا گیا۔ لیکن صرف پانچ جیکبلیں ہاتھ لگی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دو پہلے ہی کسی وقت ہٹا دی گئی تھیں۔ چاکلیٹ کے علاوہ یعقوب گاندھی کے فلیٹ سے لاکھوں روپے کی فارن کرنسی بھی ہاتھ آئی ہے۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ آپ کے کدو خان صاحب ریڈ میں کیسے شریک ہو گئے؟“

”یہ میں تمہیں پھر کسی وقت تفصیل سے بتاؤں گا۔“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔ ”تم یہ بتاؤ کہ کیا یعقوب گاندھی بھی پکڑا گیا یا نہیں؟“

”بڑی مچھلیاں اتنی آسانی سے جال میں نہیں پھنستیں۔ فلیٹ سے جو شخص پکڑا گیا ہے، اس کا نام رب نواز خان ہے۔ اس نے اقرار بھی کر لیا ہے کہ وہ مال اسی کا ہے۔ اونچے معاملات میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب جب تک رب نواز سزا بھگتے گا، یعقوب گاندھی بڑی دریا دلی سے اس کے خاندان کی پرورش کرتا رہے گا اور رہا ہونے کے بعد انعام الگ دے گا۔“

”ریڈ کی کامیابی کی اطلاع تمہیں کیسے ملی؟“

”سلیم گھانچی کا فون آیا تھا۔“ اے دن نے جواب دیا۔ ”اسے ابھی پوری تفصیل نہیں معلوم ہوئی کہ رب نواز خان نے اپنے بیان میں اور کیا کیا کہا ہے۔ لیکن وہ یہ بتا رہا تھا کہ اگر انسپکٹر جمال الدین صاحب نے پھرئی نہ دکھائی ہوتی تو ایک دو جیکبلیں اور کم ہو جاتیں۔ انہوں نے اوپر سے سگنل ملتے ہی سب سے زیادہ تیزی دکھائی اور وقت ضائع کئے بغیر فلیٹ میں بالکونی کے ذریعے داخل ہو گئے۔ اندازے کی ایک معمولی سی غلطی بھی اُن کی جان لے سکتی تھی۔ رب نواز انہیں گولی بھی مار سکتا تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ جمال الدین صاحب کے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی باقی پارٹی کے لوگوں نے بھی دھاوا بول دیا تھا، اس لئے رب نواز کو جو اس وقت فلیٹ میں تھا، کسی جوابی کارروائی کا موقع نہیں مل سکا۔“

”ٹھیک ہے..... تم مجھ سے شام کو دوبارہ بات کرنا۔ گھر کے نمبروں پر اس لئے کہ میں کسی مجبوری کی وجہ سے گھر سے باہر نہیں نکل سکتا۔“ میں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”اس وقت مجھے جعفری صاحب کے فون کا بھی انتظار ہے۔“

اے دن سے رابطہ منقطع کرنے کے بعد میں بڑی شدت سے جعفری صاحب کے فون کا

انتظار کر رہا تھا۔ کیس کی کامیابی کی خوشی کے ساتھ ساتھ مجھے اس کی تفصیل معلوم کرنے کی بھی جلدی ہو رہی تھی۔ میرے انتظار کی شدت طویل ہوتی گئی۔ صبح تقریباً نو بجے جعفری صاحب کا فون آیا۔ ان کی آواز ہی سے تھکاوٹ کا اندازہ ہو رہا تھا۔ انہوں نے مختصر الفاظ میں کہا۔

”کیس کامیاب رہا۔ چھ جیکٹ ہاتھ لگی ہیں۔ پانچ فلیٹ سے اور ایک رب نواز نامی شخص کی نشاندہی پر صفدر کے علاقے کے ایک فلیٹ سے، جہاں مقامی ہوٹل کی ایک کال گرل رہتی ہے۔ وہی خاتون جنہیں سپرنٹنڈنٹ نے اپنی ایک عزیزہ کی صاحبزادی کی حیثیت سے تم سے ملوایا تھا۔“

”اس خاتون نے کیا بیان دیا ہے؟“

”میں اس وقت جناح ہسپتال جا رہا ہوں۔ باقی تفصیلی باتیں بعد میں بتاؤں گا۔“

”ہسپتال؟“ میں چونکا۔ ”خیریت تو ہے؟“

”سراج الدین صاحب پر کسی نے گھر جاتے ہوئے قاتلانہ حملہ کیا ہے لیکن وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ گولی اچھٹی ہوئی ان کے بائیں پاؤں کی پنڈلی پر لگی ہے۔ مجھے تو ابھی ابھی اطلاع ملی ہے۔ میں نے رحمان صاحب کو بھی اطلاع کر دی ہے، وہ بھی ہسپتال پہنچ رہے ہیں۔“



اس کیس کے کوئی دو ماہ بعد ہم سارے اٹلی جنس افسران کانفرنس روم میں بیٹھے تھے اور رحمان صاحب حسب معمول ایک ایک کر کے سب کی کارکردگی کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہ ان کا ہفتہ واری معمول تھا۔

”مسٹر فیصل!“ رحمان صاحب نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ”ان دو مہینوں میں تو آپ کی کارکردگی صفر ہی رہی ہے۔“

”مجھے احساس ہے سر! لیکن میں چھٹی پر تھا۔ کچھ گھریلو پریشانیاں بھی لاحق تھیں۔“

”اوکے..... اب کیا ارادہ ہے؟“ رحمان صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”اس

طرح بیکار بیٹھے رہنے سے تو آپ کے کمیز کا گراف گرتا ہی جائے گا۔“

”میں کوشش میں لگا ہوا ہوں سر! امید ہے کہ ایک دو ہفتے میں کامیابی کی کوئی صورت ضرور نکل آئے گی۔“ میں نے مصلحتاً شرمندگی کا اظہار کیا۔

”مسٹر جمال الدین!“ رحمان صاحب نے جمال الدین کو تعریفی نگاہوں سے دیکھتے

ہوئے کہا۔ ”ویل ڈن۔ میں آپ کی کارکردگی سے بہت خوش ہوں۔ خاص طور پر یعقوب

گاندھی والے کیس میں تو آپ نے کمال ہی کر دیا۔

”شکریہ سر!“

”لیکن ذرا اپنی جان کا بھی خیال رکھا کریں۔“ رحمان صاحب نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر جعفری مجھے بتا رہے تھے کہ آپ نے سیڑھیوں والی جس دیوار پر چڑھ کر فلیٹ کی بالکونی میں چھلانگ لگائی تھی، اس کا فاصلہ اچھا خاصا تھا۔“

”ایسے موقعوں پر رسک تو بہر حال لینا پڑتا ہے سر!“ جمال الدین نے جواب دیا۔

رحمان صاحب ایک ایک کر کے تمام افسران سے ان کی مصروفیات کے بارے میں ڈسکس کرتے رہے۔ پھر یلکھت بڑی سنجیدگی سے جعفری صاحب کو گھورتے ہوئے بولے۔ ”مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ہماری انٹیلی جنس برانچ کے کچھ افسران ہمارے ساتھ ڈبل گیم کھیلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک طرف یہ اسمگلر سے ملے ہوئے ہیں اور دوسری طرف یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ حکومت کے سب سے زیادہ وفادار ہیں۔ میری لسٹ پر ایک دو نام ایسے ہیں، جو اس قسم کی حرکتوں میں ملوث ہیں۔ میں ذاتی طور پر ان افسران کے بارے میں تحقیق کر رہا ہوں، اس لئے فی الحال ان کے نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔“

پھر وہ دیگر تمام افسران کی جانب مخاطب ہو کر بولے۔

”آپ حضرات یہ خیال ذہن سے نکال دیں کہ بات صرف تبادلے پر ٹل جائے گی۔ ٹرانسفر ایز نو پنشمنٹ (Transfer is no Punishment)۔ ایسی کالی بھیڑوں کو اس محکمے ہی سے نکلوا دوں گا۔ اس لئے آپ حضرات خود کو سدھارنے کی کوشش کریں، ایمانداری سے اور محنت سے کام کریں اور اپنے عہدوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت کے ساتھ ڈبل گیم پلے کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ میں کوئی رعایت نہیں کروں گا۔ دیٹ ازل۔“

رحمان صاحب اپنا جملہ مکمل کرنے کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔ لیکن ایک بات ہم سب ہی محسوس کر رہے تھے کہ سپرنٹنڈنٹ اسلام الدین خاص طور پر بہت ڈسٹرب نظر آرہے تھے۔ شاید وہ رحمان صاحب کی وارننگ کا اشارہ سمجھ گئے تھے۔



## ٹرمپ کارڈ

جمیکا دولن اینڈ کائن ملز لمیٹڈ کا جنرل منیجر نعمان کریبی اس وقت اپنے ایئر کنڈیشنڈ آفس میں بیٹھا کام میں مصروف تھا، جب اس کے چراسی نے ندیم اکبر کا کارڈ لا کر اس کے سامنے رکھا، پھر جواب کے لئے باادب کھڑا رہا۔

”ندیم اکبر.....“ نعمان کریبی نے جوتل مالک رزاق کریبی کا چھوٹا بھائی تھا، وزیٹنگ کارڈ دیکھ کر خود کلامی کے انداز میں کہا۔ پھر اسے یاد آ گیا کہ جس بلیئر ڈکلب کا وہ لائف ممبر تھا، ندیم اکبر کی ملاقات اس سے وہیں ہوئی تھی۔ ندیم اکبر کو کلب جوائن کئے محض تین ماہ ہوئے تھے لیکن اس مختصر عرصے میں نعمان کریبی کے خاصا قریب آ گیا تھا جس کی وجہ شاید وہ حسین و جمیل لڑکیاں تھیں جو اکثر ندیم اکبر کے ساتھ آیا کرتی تھیں۔ نعمان کریبی حسین چہروں کا دلدادہ تھا، اس لئے خود اسی نے ندیم اکبر سے دوستی کرنے میں پہل کی تھی۔ پھر ان کے مراسم خاصے گہرے ہو گئے تھے، نعمان کریبی اپنے حلقہ احباب میں ”لیڈی بکھر“ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ندیم اکبر کے ساتھ آنے والی لڑکیوں میں سے کسی ایک پر بھی ہاتھ صاف نہیں کر سکا تھا۔ اس کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ہر چھ ماہ بعد گاڑی تبدیل کرنا اس کی عادت تھی۔ لڑکیوں کے اوپر وہ بے دریغ دولت لٹانے کا عادی تھا۔ کلب میں آنے والی پیشتر لڑکیوں اس کے قریب آنے کی کوشش میں اس کے ارد گرد خوب صورت تیلیوں کی طرح منڈلایا کرتی تھیں۔ مگر ندیم اکبر کی گرل فرینڈز میں سے ابھی تک کسی نے بھی اسے گھاس ڈالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

نعمان کریبی دولت کے بل بوتے پر ہر نایاب شے خریدنے کا عادی تھا۔ اس نے بچپن سے کبھی ہارنا نہیں سیکھا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی، جو اس نے ندیم اکبر کے ساتھ نظر آنے والی لڑکیوں کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا تھا۔ ایک بار نعمان کریبی کے ایک جگری اور بے تکلف دوست نے اس کی دھتکتی رگ کو چھیڑ بھی دیا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ ندیم سے تمہاری دوستی کچھ زیادہ سودمند ثابت نہیں ہوئی۔“

”کیا مطلب.....؟“ نعمان کریمی نے ایرن مور کا دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے پوچھا۔

”مطلب صاف ظاہر ہے۔“ دوست نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو شاید تم اب تک ندیم کی کسی گرل فرینڈ کو بھی ششے میں نہیں اتار سکے۔ میں نے کم از کم یہی محسوس کیا ہے کہ وہ لڑکیاں ان ہوشیار مچھلیوں کی طرح ہیں، جو کانے میں لگا چارہ نگل جانے کے بجائے کتر کتر کر کھانے کی عادی ہیں، جو ابھی تک تمہیں ڈور کھینچنے کا موقع نہیں ملا۔“

”خوب صورت مچھلیوں کو کانے سے نہیں، جال میں پھانس کر شکار کیا جاتا ہے۔“

”پھر مجھے یہ کہنے کی اجازت دو کہ تمہارے جال اب پرانے ہو چکے ہیں۔“  
”نان سیس!“ نعمان کریمی نے خفت مٹانے کی کوشش کی۔ ”ابھی تک میں نے سنجیدگی سے ان کی طرف غور نہیں کیا۔ ہم بزنس میں ہیں، میری جان! جو پرانے مال کو ٹھکانے لگانے کے بعد ہی نیا مال مارکیٹ لاتا ہے۔“

”لیکن اشاک میں نئے مال کی موجودگی بھی بہر حال لازم ہے۔“ دوست نے معنی خیز انداز اختیار کیا۔ ”ون ان ہینڈ از بیٹر دیں ٹو ان ہش (One in hand is better than two in bush)۔ میرا مطلب ہے کہ تمہیں کم از کم ندیم کو نیچا دکھانے کی خاطر.....“

”ڈونٹ وری مائی ڈیز! تم اب دیکھنا کہ بہت جلد ان حسین لڑکیوں میں سے دو ایک کس طرح میرے عشق میں دیوانی ہوتی ہیں۔ دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے، ان سے ایمان بھی خریدے جاسکتے ہیں، تم خوب صورت تیلیوں کی بات کر رہے ہو۔“ نعمان کریمی نے جھینپ مٹانے کی خاطر بڑے اعتماد سے کہا۔ پھر اٹھ کر کھیل میں شامل ہو گیا۔ مگر وہ دل ہی دل میں جھنجھلا کر رہ گیا تھا۔

”میرے لئے کیا حکم ہے صاحب؟“ چراسی نے دبی زبان میں پوچھا تو نعمان کریمی نے چونک کر اس کی موجودگی کو محسوس کیا، پھر بولا۔  
”ان صاحب کو اندر بھیج دو۔“

”وہ صاحب نہیں، صاحبہ ہیں سر!“

”کیا مطلب؟“ اس نے چراسی کو وضاحت طلب نظروں سے گھورا۔ ”یہ وزینگ کارڈ تمہیں کس نے دیا ہے؟“

”ایک خاتون نے صاحب!“

”خاتون.....“ نعمان کریمی کے چہرے کا تناؤ یکلخت چھٹ گیا۔ اس کے جسم کے اندر

گرمی کی ایک لہری دوڑ گئی۔ اس نے چراسی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے، تم خاتون کو اندر بھیج دو۔“  
چراسی کے جانے کے بعد وہ اپنی ریوالونگ چیئر پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں دروازے کی جانب تھیں۔ پھر اس وقت وہ خوشی سے اُچھل پڑا، جب اس نے ندیم اکبر کے گروپ کی سب سے حسین لڑکی عاشی کو اپنے ڈیکورٹڈ آفس میں داخل ہوتے دیکھا۔ غیر اختیاری طور پر وہ عاشی کے استقبال کی خاطر اٹھتا ہوا بولا۔

”ویلم مس عاشی!“

عاشی نے مسکرا کر ”جھینکس“ ادا کیا، پھر لہراتی، بل کھاتی نعمان کریمی کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔

”کیا پینا پسند کریں گی آپ؟“ نعمان کریمی نے دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔  
”کوئلہ، سافٹ یا ہارڈ ریک؟“

”شکریہ۔“ عاشی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں دراصل آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آئی ہوں۔“

”آپ حکم کریں۔ بھلا ایسا بھی کیا کام ہے جو آپ چاہیں اور پورا نہ ہو؟“  
”وہ..... دراصل، ندیم اکبر صاحب.....“ وہ رک رک کر بولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”کیا ہوا ندیم صاحب کو؟“

”انہوں نے مجھے ملازمت سے نکال دیا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ ”میں نے بحالت مجبوری ان کا وزینگ کارڈ استعمال کیا ہے۔“

”آئی سی۔“ نعمان کریمی نے کسی ماہر شکاری کے مانند اپنی زد میں آئے ہوئے شکار کو دیکھا۔ ”میں نے پھر غلط اندازہ لگایا تھا۔“

”میں بھی نہیں؟“ اس نے بڑی سنجیدگی سے اپنی گھنیری پلکیں اٹھا کر نعمان کریمی کو دیکھا۔ ”آپ نے کیا اندازہ لگایا تھا؟“

”میرا خیال تھا، آپ ندیم کی گرل فرینڈ ہوں گی۔“ نعمان کریمی نے اس بار قدرے بے باکی سے کہا۔

”غلط رائے قائم کی ہے آپ نے میرے بارے میں۔“ وہ بدستور سنجیدگی سے بولی۔  
”میں ایک مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ ایم

اے فرسٹ ایئر میں تھی کہ والد صاحب فالج کا شکار ہو گئے۔ بہت دوا علاج کیا لیکن فائدہ نہیں ہوا..... پھر انہیں ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا اور مجھے اپنی پڑھائی ختم کر کے گھر کا

بوجھ اٹھانا پڑا۔“

کر رک گیا۔

”مسٹر غفار!“ نعمان کریمی نے عاشی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”میں مس عاشی کو کوئی مناسب ملازمت دینا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے..... لیکن فی الحال ہمارے پاس.....“

”غفار صاحب!“ نعمان کریمی نے تیزی سے جملہ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”آپ مس عاشی کا اپائنٹمنٹ لیٹر تیار کر کے لائیں۔ میں انہیں اپنی سیکرٹری مقرر کر رہا ہوں۔ مس عائشہ کا تبادلہ آپ کہیں اور کر دیں۔“

”بہتر ہے۔“ غفار بھائی نے دوبارہ کن اکھیوں سے عاشی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تنخواہ کیا رکھی جائے گی؟“

”اوہ..... آپ ایسا کریں کہ فی الحال وہی تنخواہ رکھیں جو مس عائشہ کو ملتی ہے۔“

غفار بھائی کمرے سے چلے گئے تو عاشی نے بڑی معصومیت سے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ زبردستی میرے لئے جگہ نکال رہے ہیں۔ ورنہ شاید فی الحال آپ کے ہاں کوئی دیکھی نہیں ہے۔“

کافی آگئی تو خود نعمان کریمی نے اپنے ہاتھ سے تیار کر کے عاشی کی سمت بڑھاتے ہوئے کہا، عاشی کے جملے کو وہ یکسر نظر انداز کر گیا تھا۔

”کیا میں ایک ذاتی سا سوال کر سکتا ہوں؟“

”میں کوشش کروں گی جواب دینے کی۔“

”آپ کے گھریلو ماہانہ اخراجات کیا ہیں؟“

”سوری مسٹر نعمان!“ عاشی نے جواب دیا۔ ”میں وہی تنخواہ قبول کروں گی، جو مس عائشہ کو ملتی ہے۔“

”آپ شاید تکلف سے کام لے رہی ہیں۔“

”جی ہاں۔ اس لئے کہ میں ہر کس و نا کس سے زیادہ بے تکلف ہونے کی عادی نہیں ہوں۔“

”اچھی بات ہے۔“ نعمان کریمی مسکرا کر بولا۔ ”ہر شخص سے بے تکلف ہونا اچھی بات بھی نہیں ہوتی۔ میں خود بھی اس بات کا قائل ہوں کہ ایک وقت میں.....“

”کیا میں کل سے جوائن کر سکتی ہوں؟“ عاشی نے دخل اندازی کرتے ہوئے سوال کیا۔

”آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔“ نعمان کریمی مسکرا دیا۔ ”چاہیں تو ابھی سے ڈیوٹی رپورٹ کر سکتی ہیں۔“

”شکریہ!“ وہ کافی ختم کر کے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں کل حاضر ہو جاؤں گی۔“

”ندیم نے آپ کو ملازمت سے کیوں نکال دیا؟“

”میں اس ٹاپک کو چھیڑنا نہیں چاہتی۔“ اس نے نظریں جھکا کر ایسے انداز میں جواب دیا کہ نعمان کریمی کے ہونٹوں پر معنی خیز ہنسم پھیل گیا۔

”آپ چاہیں تو گھر کے اخراجات کے ساتھ ساتھ میں آپ کی پڑھائی کے اخراجات بھی اٹھانے کو تیار ہوں۔“

”سوری۔“ وہ بڑی خود داری سے بولی۔ ”میں کسی کا احسان لینے کی عادی نہیں ہوں۔ اگر آپ مجھے کوئی ملازمت دے سکیں تو میں آپ کا یہ احسان.....“

”اوہ، کم آن عاشی! ڈونٹ وری فار اے جاب۔“ نعمان کریمی نے بے تکلفی سے پوچھا۔ ”یہ بتائیے کہ آپ کو اس ناچز کی بل میں کون سی ملازمت چاہئے؟“

”وہ جو آپ آسانی سے دے سکیں۔“

”میری سیکرٹری بننا پسند کریں گی آپ؟“ نعمان نے اس کی خوب صورت جھیل سی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”یہ میری خوش قسمتی ہوگی..... لیکن.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”لیکن کیا؟“

”میں کسی دوسری خاتون کی سیٹ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی۔“

”یہ سوچنا میرا کام ہے، آپ کا نہیں۔“

”میں ایک درخواست اور کروں گی۔“

”وہ کیا؟“

”آپ ندیم اکبر کو میری ملازمت کے سلسلے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔“

”یہی بات میں آپ سے کہنا چاہتا تھا کہ آپ ندیم سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کیجئے، ورنہ وہ اس سے کچھ اور مطلب بھی نکال سکتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ میرے اور آپ کے بارے میں کہیں کوئی غلط رائے نہ قائم کر لے۔“

”میں کسی بھی قسم کے اسکینڈل کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ.....“

”میں تمہاری پوزیشن کو سمجھ رہا ہوں۔“ نعمان کریمی نے بے تکلفی کی طرف ایک قدم اور بڑھاتے ہوئے اسے آپ کے بجائے تم کہہ کر مخاطب کیا۔ ”یہاں تمہیں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

پھر اس کے بعد نعمان کریمی نے چپراسی کو بلا کر کافی کا آرڈر دیا اور ایڈمنسٹریٹو انچارج کو طلب کیا، جو ایک پرانا، بوڑھا اور بے حد تجربہ کار شخص تھا۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے اپنی تجربہ کار نظروں سے عاشی کے سراپا کا جائزہ لیا، پھر خاموشی سے میز کے قریب جا



”ایزو وٹ۔“ نعمان کریمی نے شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔  
پھر عاشی کے جانے کے بعد بڑے معنی خیز انداز میں کمرے میں رکھے ہوئے اکیورم کی سمت متوجہ ہو گیا، جس میں کئی خوب صورت مچھلیاں موجود تھیں۔



ایکسائز انسپکٹر سرور خان اپنے دفتر میں بیٹھا اخبار پڑھنے میں مصروف تھا لیکن اس کی نظریں بار بار باہر کی جانب اٹھ رہی تھیں، جہاں دولان کے درمیان ایک پختہ سی سڑک نصف دائرے کی صورت میں گھومتی ہوئی جنرل نیجر کے آفس تک جاتی تھی۔

سرور خان عام طور سے گیارہ بجے سے پہلے دفتر پہنچنے کا عادی نہیں تھا۔ اگر کبھی ملو کو اس کی ضرورت درپیش آتی تو وہ اسے فون کر کے گاڑی بھیج کر بلوایا کرتے تھے۔ لیکن ادھر تقریباً ایک ہفتہ سے وہ ٹھیک پونے نو بجے پہنچ رہا تھا۔ پابندی کی یہ تبدیلی اس کی فرض شناسی کا کوئی حصہ نہیں تھی بلکہ وہ نیا حسین چہرہ تھا، جسے وہ آٹھ دس دن سے دیکھ رہا تھا۔ ٹھیک نو بجے ملو کی گاڑی درکنگ اسٹاف کو لے کر اس کے کمرے کے سامنے رکتی تھی اور وہ دمکتا ہوا تازہ گلاب جیسا حسین چہرہ گاڑی سے اتر کر لہراتا، بل کھاتا جنرل نیجر کے دفتر کی جانب چلا جاتا تھا۔

شروع شروع میں سرور خان کا خیال تھا کہ وہ کوئی ملاقاتی ہوگی۔ نعمان کریمی کی عادتوں سے وہ اچھی طرح واقف تھا، شاید یہی وجہ تھی کہ اس کے اور جنرل نیجر کے درمیان جو فاصلہ تھا، وہ تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نعمان کریمی حسین لڑکیوں کا رسیا ہے اور ان پر بے دریغ دولت خرچ کرنے کا عادی ہے۔ اسی وجہ سے اکثر پیشتر لڑکیاں رنگ، روپ اور چہرے بدل بدل کر اس کے گرد حسین تیلیوں کی طرح منڈلاتی رہتی تھیں۔

سرور خان، بذات خود بھی خاصا ہنرمند کھلاڑی تھا۔ پیننگ ڈیپارٹمنٹ کی پیشتر لڑکیاں اس کے مصرف میں آچکی تھیں۔ دیگر اسٹاف میں کام کرنے والی لڑکیاں بھی اسے اس لئے کڑوی گولی سمجھ کر ہضم کرنے پر تیار ہو جاتی تھیں کہ انہیں اس کے اور جنرل نیجر کے تعلقات کا علم تھا۔ صرف ایک عائنہ تھی، جس نے ابھی تک سرور خان سے ملاقات ہونے کے بعد بھی اسے ایک خاص حد سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ڈیوٹی کے درمیان سرور خان کے اخراجات ملز کے اکاؤنٹ میں جاتے تھے اس لئے وہ کسی نئے شکار کو چھانسنے کی خاطر کبھی مالی مشکلات سے بھی دوچار نہیں ہوتا تھا۔ اکثر ملز کی گاڑی اور ساحل سمندر پر واقع دو کمروں کا خوب صورت ہٹ (HUT) بھی اس کے کام آچکا تھا۔ سرور خان نہ جانے کتنی مجبور اور ملازمت حاصل کرنے والی لڑکیوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا چکا تھا۔ لیکن وہ نئی لڑکی اس کے معیار پر کچھ زیادہ ہی پوری اُتری تھی، اس لئے وہ خلاف معمول جلدی دفتر آنے لگا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کے سپاہی کرامت حسین کو بھی جلدی آنا پڑتا تھا۔ دنیا کا دستور ہے کہ جب

افسر عیاش اور بددیانت ہو تو پھر نچلا عملہ بھی اسی کی راہ پر چل نکلتا ہے۔  
کرامت حسین بڑا چلتا پڑھ واقع ہوا تھا۔ اُڑتی چڑیا کے پُر گننے میں اسے خاصی مہارت تھی۔ دو تین دن بعد ہی اس نے تاڑ لیا تھا کہ سرور خان کے جلد دفتر آنے کی اصل وجہ کیا تھی۔ چنانچہ اس نے ایک روز موقع پا کر سرور خان سے کہا۔  
”صاحب! اس نئی لڑکی نے آتے ہی اپنے جنرل نیجر کو بھی وقت پر دفتر پہنچنے کا عادی بنا دیا ہے۔“

”کون ہے.....؟“ سرور خان نے بے تکلفی سے دریافت کیا۔  
”جنرل نیجر کی نئی سیکرٹری..... عاشی نام ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ سرور خان نے حیرت سے کہا۔ ”کیا عائنہ کو تبدیل کر دیا گیا ہے؟“

”جی ہاں..... اس کا تبادلہ ایڈمنسٹریشن آفس میں کر دیا گیا ہے۔“  
سرور خان نے اسی وقت کرامت حسین کے ذریعے عائنہ کو بلوایا۔  
”سنائے، آپ کو تبدیل کر دیا گیا ہے؟“

”آپ کو اب خبر ہوئی ہے.....“ عائنہ نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”لیکن نعمان کریمی تو آپ کے بہت زیادہ.....“  
”وہ پرانی بات تھی۔ آج کل تو ہر طرف بس مس عاشی کے بارے میں کھسک پھسک رہی ہے۔“

”آپ کہیں تو میں آپ کے سلسلے میں.....“

”بے کار ہے۔“ عائنہ نے پہلو بدل کر کہا۔ ”ابھی تو نشہ چڑھنا شروع ہوا ہے، شراب اچھی بھی ہے اور قیمتی بھی۔ اس لئے نشہ چڑھنے اور اترنے میں خاصا وقت لگے گا۔“

”کیا آپ کو مس عاشی کے حدود اربعہ کے بارے میں بھی کچھ علم ہے؟“

”فی الحال اتنا بتا سکتی ہوں کہ وہ آپ کے جال میں پھنسنے والی نہیں ہے۔“ عائنہ نے بے تکلفی سے کہا۔

”تم شاید مجھے چیلنج کر رہی ہو۔“ سرور خان نے بے تکلفی سے کہا۔

”ہاتھ نکھن کو آرسی کیا ہے؟“ عائنہ نے بڑی ادا سے جواب دیا۔ ”قسمت آزما کر دیکھ لیں۔ لیکن مجھے یقین ہے، آپ کی دال عاشی کی ہانڈی میں گھنی مشکل ہی ہے۔“

”ابھی میرے پاس ایک ٹرمپ کارڈ ایسا ہے کہ شاید نعمان کریمی از خود مجھے عاشی سے متعارف کرانے پر مجبور ہو جائے۔“

”ٹرانسپورٹ پر مٹ۔“  
 ”تمہیں اس بات کا علم کس طرح ہوا؟“ سرور خان نے حیرت کا اظہار کیا۔  
 ”آپ اتنی جلدی بھول گئے کہ میں نعمان کریمی کی سیکرٹری رہ چکی ہوں؟“  
 ”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن.....“

”پریشان نہ ہوں۔ میری وجہ سے آپ کو نقصان نہیں ہو گا۔“ عائشہ نے پھر اس کو اکسانے کی خاطر کہا۔ ”فی الحال تو آپ صرف عائشہ کے بارے میں غور کریں، جس کی وجہ سے آپ آج کل وقت سے پہلے دفتر آنے لگے ہیں۔“  
 ”کچھ شرط لگتی ہے؟“ سرور خان نے معنی خیز لہجہ اختیار کیا۔  
 ”مجھے ہر شرط منظور ہے۔“ عائشہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔  
 ”بہت زیادہ رقابت محسوس کر رہی ہو، مس عائشہ؟“

”ہاں..... میں انکار نہیں کروں گی۔“ عائشہ کا لہجہ کچھ اور سخت ہو گیا۔ ”نعمان کریمی نے مجھے دھوکا دیا ہے اور میں اس کا ذمہ دار عائشہ کے سوا کسی اور کو نہیں سمجھتی۔“  
 ”میں عائشہ کو فتح کرنے کی خاطر بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ لیکن سوچ لو، میری کامیابی کی صورت میں تمہیں میری ہر شرط ماننی پڑے گی۔“

”اس کا وعدہ میں کر چکی ہوں۔“ عائشہ نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ”شیشہ اگر ٹوٹ جائے تو اسے اٹھا کر کوڑے دان میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کوئی بھی اسے استعمال کر سکتا ہے۔“

”آئی سی..... گویا بات یہاں تک پہنچ چکی تھی۔“ سرور خان نے عائشہ کے دلکش نقوش اور اس کے سراپا کے زیر و بم کو لچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم شاید یقین نہ کرو۔“ عائشہ نے دوستوں جیسے انداز میں کہا۔ ”اس کہنے نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا اور میں..... میں اس کے فریب میں آ کر اپنا سب کچھ لٹا بیٹھی۔“  
 ”آج شام کو آپ کا کیا پروگرام ہے.....؟“ سرور خان نے کسی مشاق کھلاڑی کی طرح سوال کیا۔

”سوری مسٹر سرور! پہلے آپ شرط پوری کریں، اس کے بعد ہی شام کے پروگرام کے بارے میں بات ہوگی۔ خدا حافظ!“ عائشہ نے سنجیدگی سے کہا، پھر اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ سرور خان اس کے جانے کے بعد بدلتے حالات سے فائدہ اٹھانے کے سلسلے میں منصوبے بنانے لگا۔ اب وہ اس پوزیشن میں آ گیا تھا کہ ایک تیر سے دو شکار کر سکتا تھا۔ لیکن دوسرا شکار حاصل کرنے سے پیشتر اسے پہلا شکار کرنا لازم تھا۔  
 چنانچہ وہ آج بھی دفتر میں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ کرامت حسین جو سیاہ و سفید میں مکمل

طور پر اس کا شریک کار تھا، باہر ٹہل رہا تھا۔ ٹھیک نو بجے شٹل سروس دفتر کے سامنے آ کر رکی تو سرور خان نے اخبار ایک طرف رکھا اور کیل کانٹے سے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی قسمت شاید اچھی ہی تھی کہ آج نعمان کریمی کی گاڑی بھی ریزرو پارکنگ لاٹ میں نظر نہیں آ رہی تھی جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ ابھی تک دفتر نہیں پہنچا تھا۔

سرور خان کی نگاہیں بس سروس سے اترنے والوں پر جمی تھیں۔ پھر اس نے عائشہ کو بس سے اترتا دیکھا، اس کے ساتھ ہی کرامت حسین قدم بڑھاتا ہوا آگے بڑھا تھا۔ پھر اس نے عائشہ سے کچھ کہا تھا۔ عائشہ ایک لمحے تک کچھ سوچتی رہی، پھر سرور خان کے کمرے کی جانب قدم اٹھانے لگی۔

”آپ نے شاید مجھے بلایا ہے؟“ اس نے دفتر میں قدم رکھنے کے بعد سرور خان کو بڑی سادگی سے مخاطب کیا۔  
 ”تشریف رکھئے۔“

”میں ذرا جلدی میں ہوں۔“ عائشہ نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”باس وقت کا بہت پابند ہے اور شاید وہ اس بات کو بھی پسند نہ کرے کہ میں اس کی اجازت کے بغیر.....“

”آپ نعمان صاحب کی فکر نہ کریں۔ ان سے میری خاصی گہری ملاقات ہے۔“  
 ”یقیناً ہوگی۔ لیکن میں نہیں چاہتی کہ وہ کسی بات پر مجھ سے ناراض ہوں۔“ عائشہ نے کہا، پھر بولی۔ ”آپ نے مجھے کس کام کے لئے یاد کیا ہے؟“

”آپ کا تعارف حاصل کرنے کی خاطر۔“  
 ”مجھے عائشہ کہتے ہیں اور اس بل میں آج میرا دسواں دن ہے۔“  
 ”اور آپ نے آتے ہی مس عائشہ کے نشین کو جلا کر رکھ کر دیا۔“

”میں سمجھی نہیں؟“ اس نے بڑی مصومیت سے کہا۔  
 ”کیا یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ آپ سے پہلے مس عائشہ، نعمان کریمی کی سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہی تھیں؟“

”اس میں میرا نہیں، باس کا اپنا ذاتی فیصلہ ہے۔“  
 ”کیا بیٹا پسند کریں گی آپ؟“  
 ”فی الحال کچھ بھی نہیں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”میرا نام سرور خان ہے۔“ اس نے اٹھتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ ”میرا تعلق مرکزی محکمہ ایکسٹرنل اینڈ لینڈ کسٹم سے ہے۔ یہاں میں انسپکٹر انچارج کی حیثیت سے تعینات ہوں۔“  
 ”اوہ..... پھر تو آپ کو بہت سارے اختیارات حاصل ہوں گے۔“ عائشہ بدستور سنجیدہ تھی۔

”جی ہاں..... آپ کی دعا ہے۔“  
 ”خوشی ہوئی، آپ سے مل کر۔“

”دوبارہ کب ملاقات ہوگی؟“ سرور خان نے اس کو شوق بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میرا مقصد یہ ہے، آپ کی خاطر مدارات میرے اوپر قرض ہو چکی ہیں اور میں قرض اُتارنے کے سلسلے میں کبھی زیادہ دیر نہیں لگاتا۔“

”دلچسپ آدمی ہیں آپ۔“ عاشی نے پہلی بار مسکرا کر قدرے بے تکلفی سے کہا۔ پھر کسی جواب کا انتظار کئے بغیر اُلٹے قدموں واپس چلی گئی۔  
 سرور خان کی ہوس ناک نگاہیں جنرل منجر کے آفس کے دروازے تک عاشی کا تعاقب کرتی رہیں۔

❖.....❖.....❖

نعمان کریمی اس وقت کسی ضروری فائل کے مطالعے میں مصروف تھا، جب شعبہ انتظامیہ کے انچارج غفار بھائی نے آفس میں قدم رکھا۔ غفار بھائی، ملز کے سب سے پرانے اور محنتی شخص تھے، اس لئے نعمان کریمی کو فائل بند کر کے ان سے مخاطب ہونا پڑا۔  
 ”تشریف رکھئے۔“

”میں آپ سے کمپنی کے مفاد میں کچھ ضروری باتیں کرنے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔“

”جی فرمائیے؟“

”مس عائشہ نے درخواست کی ہے کہ اسے کسی فوری ضرورت کے تحت دو لاکھ روپے درکار ہیں۔“

”ضرورت کی نوعیت کیا ہے؟“

”یہی سوال میں نے بھی کیا تھا، لیکن مس عائشہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔“ غفار بھائی بولے۔ ”اس نے تین روز کے اندر مطلوبہ رقم کی ادائیگی کا مطالبہ کیا ہے اور ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ وہ کسی لون واؤچر پر دستخط نہیں کرے گی۔“

”کیا مطلب؟“ نعمان کریمی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”دو لاکھ کی رقم اتنی معمولی نہیں ہوتی کہ کسی اسٹاف ممبر کو بغیر لکھا پڑھی کے دے دی جائے۔“

”میں کسی اسٹاف ممبر کی نہیں، مس عائشہ کی بات کر رہا ہوں۔“ غفار بھائی نے دبی زبان میں جواب دیا۔

”میں سمجھا نہیں؟ کیا مس عائشہ میں سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں؟“

”میرا خیال ہے کہ ملز کے کچھ بزنس سیکرٹ اس کے علم میں ہیں، اس لئے وہ.....“  
 ”ہمیں بلیک میل کرنا چاہتی ہے۔“ نعمان کریمی نے غصے سے جملہ مکمل کیا۔

”آپ کے پاس سے ٹرانسفر ہونے کے بعد اس کی اور ایکسٹرنل سیکرٹ سرور خان کی ملاقاتوں کا سلسلہ کچھ زیادہ بڑھ گیا ہے۔ میں نے ایک دوبارہ اسے دبی زبان میں تنبیہ بھی کی تھی کہ وہ دفتری اوقات میں صرف اپنے کام پر توجہ دے، لیکن اس کے باوجود کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔“

”پھر..... ایسی صورت میں آپ کا کیا مشورہ ہے؟“ نعمان کریمی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے غفار بھائی سے پوچھا۔

”میرا مشورہ ہے کہ اگر آپ اس سلسلے میں بات کر لیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی بہتر صورت نکل آئے۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ لُنج کے بعد اسے میرے پاس بھیج دیں۔ میں اس سے براہ راست بات کر لوں گا..... اور کچھ؟“

”جی ہاں۔“ غفار بھائی کچھ توقف سے بولے۔ ”ادھر کچھ دنوں سے میں دیکھ رہا ہوں کہ مس عائشہ بھی سرور خان کے دفتر آنے جانے لگی ہیں۔ ممکن ہے کہ اس میں بھی مس عائشہ کے کسی مشورے کو دخل ہو۔“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ میں پچویشن ہینڈل کرنے کے طریقوں سے واقف ہوں۔ اچھا ہوا جو آپ نے بروقت مجھے حالات سے آگاہ کر دیا۔“

غفار بھائی کے جانے کے بعد نعمان کریمی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر حالات پر غور کرنے لگا۔ مس عائشہ جس راز سے واقف ہو گئی تھی، اس میں خود نعمان کریمی کی غلطی تھی۔ نشے کی حالت میں اس کی زبان سے ملز کا ایک اہم راز پھسل کر عائشہ کے کانوں تک پہنچ گیا تھا، جس کی بنیاد پر وہ اسے بلیک میل کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا حل ان گنت قابل اعتراض تصاویر کی صورت میں نعمان کریمی کے پاس موجود تھا، جس کا علم ابھی تک عائشہ کے فرشتوں کو بھی نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اسے عائشہ کی جانب سے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ وہ ان تصاویر کو منظر عام پر لانے کی دھمکی دے کر اس کی زبان پر قفل لگا سکتا تھا۔ لیکن عاشی اور سرور خان کی ملاقاتوں کی کہانی اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ ابھی تک وہ عاشی کو اپنے دام فریب میں پھنسانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ وہ بڑی حد تک اس سے بے تکلف ہو گئی تھی، لیکن ابھی تک اس نے نعمان کریمی کو کھل کھیلنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

عاشی کے حصول کی اس ریس میں وہ سرور خان سے شکست کھانے کو تیار نہیں تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ سرور خان کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خاصی دیر تک وہ عاشی کے مسئلے

پر غور کرتا رہا، پھر اس نے انٹرکام اٹھا کر اسے اندر بلایا اور چند ایک کاروباری باتوں کے بعد سرسری طور پر پوچھا۔

”کیا آپ ایکسائز انسپکٹر سرور خان سے مل چکی ہیں؟“

”جی ہاں۔“ عاشی نے چوکتے ہوئے جواب دیا۔

”جب آپ یہاں تشریف لائی تھیں اس وقت آپ نے ہی کہا تھا، اپنے بارے میں کسی اسکینڈل کو ان فورڈ نہیں کر سکتیں۔“ نعمان کریمی کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”میں اب بھی اسی رائے پر قائم ہوں۔“

”ایسی صورت میں میرا مشورہ ہے کہ آپ سرور خان سے ملنا جملنا کم کر دیں۔“

”لیکن وہ تو آپ کے بھی بہت گہرے دوست ہیں۔“

”میں انکار نہیں کروں گا۔“ نعمان کریمی نے اس کی غزالی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے

کہا۔ ”میری اور سرور کی دوستی صرف اور صرف کاروباری نوعیت کی ہے۔ بزنس میں اس قسم کے تعلقات رکھنے پڑتے ہیں۔ لیکن آپ کو شاید اس بات کا علم نہیں ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی میں کس قماش کا آدمی ہے۔“

”آئی سی۔“ عاشی نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ ”میں آئندہ احتیاط رکھوں گی

سر!..... دیے کیا یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ آپ اسے کسی وقت سمجھا دیں کہ وہ مجھے بار بار اپنے آفس بلانے سے گریز کرے۔“

”میں آپ کا ہمدرد ہوں، مس عاشی! اس لئے آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں، ورنہ

مجھے آپ کی کسی بات پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

”آپ میرے محسن ہیں سر!..... مجھے یقین ہے کہ آپ میرا ہمیشہ خیال رکھیں گے اور اگر نادانستگی میں کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو مجھے ٹوک دیں گے۔“

”گویا آپ اپنے جملہ حقوق بحق نعمان کریمی محفوظ کر رہی ہیں؟“

”جی ہاں.....“ عاشی قدرے جھجکتے ہوئے بولی۔ ”مجھے آپ پر مکمل اعتماد ہے۔“

”غلط۔“ اس نے عاشی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو اگر مجھ پر مکمل اعتماد ہوتا تو

آپ میرے ساتھ ڈنر پر جانے سے انکار کبھی نہ کرتیں، جس کی دعوت میں آپ کو کوئی بار دے چکا ہوں۔“

”میں شکر گزار ہوں سر! لیکن.....“

”تم مجھے نعمان صاحب کہہ کر بھی مخاطب کر سکتی ہو۔“ نعمان کریمی نے بے تکلفی سے

اس کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ سرسر کہنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ کیا ہم ایک دوسرے سے اچھے اور بے تکلف دوستوں کی طرح نہیں مل سکتے؟“

عاشی نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش بیٹھی رہی۔

”پھر کب چل رہی ہو میرے ساتھ ڈنر پر؟“

”مجھے انکار نہیں نعمان صاحب! لیکن دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پینے کا عادی

ہو جاتا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں؟“

”دراصل ندیم اکبر نے میرے اعتبار کو متزلزل کر کے محتاط رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔“ وہ

دبی زبان میں بولی۔ ”اسی وجہ سے اب میں نے سورج غروب ہونے کے بعد کسی کے ساتھ

باہر جانا ختم کر دیا ہے۔“

”ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟“

”پوچھئے۔“

”کیا ندیم اکبر نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی..... میرا مطلب یہ ہے کہ کچھ زیادہ بے

تکلف ہونے کی کوشش کی تھی؟“

”اتفاق ہی تھا جو میں اس کینے کی درندگی کا شکار ہوتے ہوتے بال بال بچ گئی،

ورنہ.....“ عاشی بولتے بولتے رک گئی۔ پھر نظریں چرا کر کہا۔ ”میں آپ کو اپنا سمجھ کر یہ بات

بتا رہی ہوں کہ وہ انسان کے بھیس میں ایک ایسا خطرناک کدھ ہے جو بھوک مٹانے کی خاطر

مردار کھانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔“

”تم اگر چاہو تو ندیم اکبر کو اس کی غلطی کی سزا بھی مل سکتی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”میں بلیر ڈکلب میں اسے ممبران کے درمیان ننگا کرنے کی بھی طاقت رکھتا ہوں۔“

نعمان کریمی نے عاشی کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ ”میرے لئے یہ کچھ زیادہ مشکل نہیں ہو

گا۔ کوئی بھی حسین لڑکی چند سکوں کے عوض میرے اشارے پر اس کے منہ پر تھوکنے سے دریغ

نہیں کرے گی۔“

”کچھ میں پتھر مارنے سے گند اپنے اوپر ہی آتا ہے۔“ عاشی نے کہا۔ ”آپ ندیم اکبر

کے سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ ورنہ اس میں میری بدنامی بھی ہو سکتی ہے، جسے میں پسند

نہیں کرتی۔“

”تمہاری مرضی۔“ نعمان کریمی دوبارہ اصل مقصد کی جانب پلٹا۔ ”اب یہ بتاؤ کہ تم

میرے ساتھ ڈنر پر کب چل رہی ہو؟“

”نعمان صاحب! میں.....“

”سمجھ گیا.....“ نعمان نے کسی شکاری کی طرح اس پر جال پھینکا۔ تمہیں غالباً میرے

اد پر بھی اعتبار نہیں ہے۔“

”یہ بات نہیں ہے۔“

”یہی بات ہے، مس عاشی!“ نعمان کریمی نے مصنوعی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ شاید ندیم اکبر کی ذلالیت کا انتقام مجھ سے بھی لینا چاہتی ہیں۔ ورنہ اگر رات گئے تک تم اس کے ساتھ بلیئر ڈکلب میں رہ سکتی تھیں تو میرے ساتھ ڈنر پر چلنے میں تمہیں کوئی انکار نہیں ہونا چاہئے تھا۔“

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں، نعمان صاحب!“

”تو پھر تم کل میرے ساتھ چل رہی ہو۔ ناؤ نوایکسیکوز۔ میں تمہیں کل شام سات بجے گھر سے پک کر لوں گا۔“

”کیا آپ کو میرے گھر کا ایڈریس معلوم ہے؟“

”کسی نہ کسی طرح ڈھونڈ ہی لوں گا۔“

”ایک طریقہ اور بھی ممکن ہے۔“

”وہ کیا.....؟“

”میں آپ کو ٹھیک سات بجے نشاط سینما کے شوروم میں مل جاؤں گی۔“

”اگر تم اتنی آسانی سے مجھے مل جاؤ تو پھر میری خوشی دو چند ہو جائے گی۔“ نعمان نے ذومعنی انداز میں کچھ اس طرح کہا کہ عاشی شرماتی ہوئی اٹھی اور گردن جھکائے تیزی سے آفس سے باہر چلی گئی۔



کلکٹر کے ذاتی دفتر میں اس وقت اٹیلی جنس کے سپرنٹنڈنٹ، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے علاوہ دو انسپکٹر بھی موجود تھے۔ یہ میٹنگ پہلے سے طے شدہ نہیں تھی، بس اچانک ہی کلکٹر کے پی اے نے فون پر متعلقہ افسروں سے رابطہ قائم کر کے انہیں کلکٹر آفس پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ کسی افسر کو اس میٹنگ کے ایجنڈے کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ ہنگامی طور پر بلائی جانے والی اس میٹنگ سے تمام افسر بے حد سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ سب جانتے تھے کہ کلکٹر کس قدر ایمان دار، اصول کا پختہ اور سخت گیر طبیعت کا مالک تھا۔ بظاہر وہ سب کے ساتھ انتہائی خوش اخلاقی سے پیش آتا تھا، کسی ماتحت عملے کے خلاف افسران کی شکایت پر بھی وہ اس وقت تک کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا، جب تک کسی اور کے ذریعے اس کی تحقیق نہ کرا لے، شکایت درست ثابت ہونے کی صورت میں ہمیشہ سخت ایکشن لینے کا قائل تھا۔ کسی کے ساتھ کوئی رعایت کرنا اس کے اصول کے خلاف تھا۔ اگر کوئی اوپر سے سفارش کرانے کی کوشش کرتا تو اس کے خلاف زیادہ ایکشن لیا جاتا تھا۔

اٹیلی جنس برانچ میں صرف ایسے ہی افسران اور ماتحت عملے کی پوسٹنگ کی جاتی تھی، جن کی ریپوٹیشن دوسروں کے مقابلے میں بہتر تصور کی جاتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ افراد آٹے میں نمک اور کچھ نمک میں آٹا ملانے کے عادی تھے۔ سوائے چند ایک گئے چنے افراد کے، باقی سارے کے سارے ہی ”ایک حمام میں سب ننگے“ کی مثال پر صادق آتے تھے۔ اٹیلی جنس برانچ میں بھی ایسے افراد کی کمی نہیں تھی۔ چنانچہ اس اچانک بلائی جانے والی میٹنگ سے ہر شخص کے دل میں ہلچل مچی تھی۔

ٹھیک دس بجے میٹنگ کا آغاز ہوا۔ بیرونی دروازے کی سرخ لائٹ روشن کر دی گئی تاکہ کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ دی جائے۔ کلکٹر نے ایک سرسری نظر تمام افسران کے چہروں پر ڈالی، پھر کہنا شروع کیا۔

”مجھے یقین ہے کہ آپ تمام حضرات اپنے کام انتہائی چابک دستی اور رازداری سے انجام دے رہے ہوں گے۔ خفیہ برانچ میں آپ حضرات کی تقرری میرے اعتماد کی دلیل ہے اور میں اس بات کو قطعی پسند نہیں کرتا کہ کوئی میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائے۔ ایسے افراد کے لئے میری لغت میں رعایت کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ خفیہ برانچ کی پوسٹنگ میں کسی کو کوئی پریشانی لاحق ہے تو وہ مجھے اپنا نام بتا دے، تاکہ میں اس کا تبادلہ کہیں اور کر دوں۔“

تمام افسران اپنی جگہ کسمسا کر رہ گئے لیکن انسپکٹر جمال الدین اس وقت بھی قطعی بے پروا نظر آ رہا تھا۔

”آپ حضرات اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ میں آؤٹ اسپون ہوں اور صاف گوئی کو پسند کرتا ہوں۔ کوئی غلطی کر کے اس کا اعتراف کر لے تو یہ بڑی بات ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ ہمارے کچھ افسران نے اپنے چہروں پر دیانت داری کا طبع چڑھا رکھا ہے، لیکن اندر سے اس کے بالکل برعکس واقع ہوئے ہیں۔ ایسے افراد کو کھپایا تو جاسکتا ہے، لیکن زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ میرا خیال ہے آپ سب میری بات سمجھ رہے ہوں گے۔“

”جی سر!“ دو تین لمبی آوازیں ابھریں۔ باقی افراد نے صرف اثبات میں گردن کو جنبش دینے پر اکتفا کیا۔

آج کی یہ ایمر جنسی میٹنگ میں نے خاص مقصد کے تحت کال کی ہے۔“ کلکٹر نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ”اٹیلی جنس برانچ کے عملے کی کارکردگی کا جائزہ میں ہفتہ وار لیتا ہوں اور جب تک آپ اس برانچ سے منسلک ہیں، اس وقت تک آپ کو پوری طرح چوکس اور محتاط رہنا ہوگا۔ حکومت کے ٹیکس، محصولات اور ڈیوٹی میں کسی قسم کی کوئی خوردبیر اور اسے بروقت وصول نہ کیا جائے تو اس کی ذمہ داری بھی آپ حضرات پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اس لئے کہ

میں نے آپ کو وسیع اختیارات اور تمام ضروری سہولتیں مہیا کر رکھی ہیں، اس کے باوجود اگر کوئی ہیرا پھیری ہو تو اسے بھی میں آپ کی کوتاہی کہوں گا..... مثیلی جنس برانچ ہر محکمے کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے، جو ایک بار ٹوٹ جائے تو پھر انسان ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

”سرا“ سپرنٹنڈنٹ نے مدہم آواز میں کہا۔ ”کیا آپ کو میری برانچ کی کارکردگی سے کسی قسم کی کوئی شکایت ہے؟“

”نو..... ناٹ ایٹ آل۔“ کلکٹر نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”مجھے خاص طور پر آپ کی برانچ کی کارکردگی سے کوئی شکایت نہیں ہے، البتہ مجھے اپنے ذاتی ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ آپ کے اسی شہر کی حدود کے اندر کچھ افسران حکومت کو دونوں ہاتھوں سے نقصان پہنچا رہے ہیں، ان کو چیک کرنا اور ان کی بددیانتی کو میرے علم میں لانا آپ کے فرائض میں شامل ہے۔ لیکن مکمل طور پر ایسا نہیں ہو رہا ہے، جس کے دو مطلب لئے جاسکتے ہیں۔ یا تو آپ سرے سے اس بددیانتی سے قطعی لاعلم ہیں یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ذاتی دوستی یا کسی اور اسباب کی بنا پر ان حضرات کو چن پوائنٹ کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔“

”ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کرتے ہیں سرا! کہ آپ کو ہم سے کسی قسم کی کوئی شکایت کا موقع نہ ملے۔ لیکن اس کے باوجود اگر نادانستگی میں ہم سے کوئی بھول چوک ہو گئی ہے تو ہم اس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔“

”مائی ڈیر سپرنٹنڈنٹ!“ کلکٹر نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں مجموعی طور پر آپ کی برانچ سے مطمئن ہوں۔ لیکن انفرادی طور پر میرے پاس کچھ ایسے ثبوت موجود ہیں جس کی بنا پر میں دیدہ و دانستہ کی جانے والی غلطی پر نادانستگی یا درگزر کی مہر نہیں لگا سکتا۔“

جواب میں سپرنٹنڈنٹ کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ باقی افراد بھی اپنی اپنی جگہ مختاپ ہو گئے۔

”مسٹر جعفری!“ کلکٹر نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو مخاطب کیا۔ ”کیا آپ مجھے اس بات کا سرٹیفکیٹ دے سکتے ہیں کہ آپ کا تمام عملہ ایمانداری اور دیانت داری کے خطوط پر گامزن ہے؟“

”مجھے افسوس ہے سرا! کہ میں آپ کو ایسا کوئی حلف نامہ پیش کرنے سے قاصر ہوں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”میرا خیال ہے سرا! کہ ابھی تک کوئی ایسا ڈی ٹیکٹر ایجاد نہیں ہوا، جو کسی کے دل کا بھید ریکارڈ کر سکے۔“ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے بدستور سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ایسی صورت میں

پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کسی کے باطن کے بارے میں حتمی رائے دینے سے قاصر ہوں۔“

”دوسرے لفظوں میں آپ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مثیلی جنس برانچ میں بھی کچھ کالی بھٹریں موجود ہیں؟“

”ہو سکتا ہے سرا!“

”گڈ۔“ کلکٹر نے تعریفی انداز میں کہا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ آپ نے میری ذاتی معلومات کو نگیٹو (Negative) کرنے کی کوشش نہیں کی۔“

”میں دخل اندازی کی معافی چاہتا ہوں۔“ انسپٹر جمال الدین نے اپنا فلسفہ پیش کیا۔ ”ہر شخص مثبت اور منفی پہلوؤں کا مجموعہ ہوتا ہے، کسی ایک پہلو کو اجاگر کرنا ایک اختیاری عمل ہے، کچھ افراد بے انتہا ایماندار ہوتے ہیں، لیکن اکثر وہ بھی بے ایمانی کرنے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں۔ یہی کیفیت بددیانت شخص کے ساتھ بھی لاحق ہے۔ کوئی اچانک حادثہ اسے برائیوں سے توبہ کرنے پر اکساتا ہے اور وہ اسی راستے پر چل پڑتا ہے۔ فرشتوں کی بات اور ہے، سرا! لیکن انسان کا گراف حالات کے ساتھ ساتھ اترتا چڑھتا رہتا ہے۔“

”آپ کے گراف کی آج کل کیا پوزیشن ہے؟“ کلکٹر کے لہجے میں اس بار مزاح اور بے تکلفی کا ہلکا سا عکس بھی شامل تھا۔

”خدا کا شکر ہے سرا! کہ میں ابھی تک کسی بھنور میں پھنس کر مد و جزر کا شکار نہیں ہوا۔“

”ویل سیڈ (Wel said)“ کلکٹر نے مسکرا کر کہا، پھر فوڈائی سنجیدہ ہو گیا۔ ”اگر میں یہ کہوں کہ میری ذاتی معلومات کے دائرہ غیر ذمہ داری میں آپ بھی آتے ہیں تو آپ کیا کہیں گے؟“

”میں آپ کی معلومات پر شبہ نہیں کر سکتا، سرا! لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ میں بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی ایسے کام میں ملوث نہیں ہوں جس کے لئے مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔“

”آپ شاید جذباتی ہونے لگے۔“ کلکٹر نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا، پھر پوچھا۔ ”آج کل آپ کس کپڑے پر کام کر رہے ہیں؟“

”سوری سرا!“ جمال الدین نے بے باکی سے کہا۔ ”کچھ باتیں اتنی کان فیڈیشنل ہوتی ہیں جو سب کی موجودگی میں ڈسکس نہیں کی جاسکتیں۔“

”یو مسٹر آفاقی؟“ کلکٹر نے دوسرے انسپٹر کو مخاطب کیا۔

”میں ایک گولڈ کپڑے پر کام کر رہا ہوں، سرا!“ آفاقی نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”کامیابی کی صورت میں ہم ایک بڑے کنسائن منٹ کو ضبط کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے، میں اب میٹنگ برخاست کرتا ہوں۔ لیکن آپ حضرات ابھی جائیں گے

نہیں۔“ کلکٹر نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میرے پی اے کے کمرے میں تشریف رکھیں۔ مسٹر جمال الدین کے جواب کی بموجب اب میں آپ سے فردا فردا کچھ ضروری گفتگو کرنا پسند کروں گا۔“

سب لوگ خاموشی سے اٹھ کر باہر آگئے تو سپرنٹنڈنٹ نے جمال الدین سے کہا۔

”کبھی کبھی آپ بہت زیادہ اودر ہو جاتے ہیں۔“

”اب آپ کی وجہ سے ہم سب کی علیحدہ علیحدہ کھپائی ہوگی۔“ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے بھی ناراضگی کا اظہار کیا۔

”تمہیں بلاوجہ درمیان میں فلسفہ بگھارنے کی کیا ضرورت تھی؟“ آفاقی نے برا سامنہ بنا لیا۔

”یہ اطلاع تمہیں کس نے دی؟“ جمال الدین نے آفاقی کو حیرت سے گھورا، پھر سادگی سے بولا۔ ”میں تو ہمیشہ سے اُبابی دال کھانے کا قائل ہوں۔ بگھارنے یا تڑکے لگانے کا عادی نہیں ہوں۔“

”ایک بات سمجھ میں نہیں آئی، مسٹر جعفری!“ پی اے کے کمرے میں جا کر بیٹھنے کے بعد سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ ”ہماری برانچ کے صرف دو انسپکٹروں کو بلا لایا گیا، جب کہ کل انسپکٹروں کی تعداد آٹھ ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ کلکٹر صاحب کو باقی چھ میں سے کسی کے خلاف کوئی رپورٹ ملی ہو۔“

”اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دو میں سے کوئی اس اچانک بلائی جانے والی میٹنگ کا سبب ہو۔“ جمال الدین نے اپنی رائے پیش کی۔

”میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔“ سپرنٹنڈنٹ نے جمال الدین کو گھورا۔ ”اب اندر جانے کے بعد اپنی زبان کو بند ہی رکھئے گا۔“

”رائٹ سر!“ جمال الدین نے بڑی مصومیت سے جواب دیا۔ ”میں آپ کے حکم کی تعمیل کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔“

”آپ اتنے ذمے دار افسر نہیں ہیں، جتنا کلکٹر کے سامنے خود کو پوز کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔

”میں نے جو کچھ کہا، اس کا ذمے دار بھی خود ہی ہوں۔“ جمال الدین نے بھویں سیڑ کر جواب دیا۔ ”ویسے مجھے انٹیلی جنس برانچ میں جھک مارنے کا کوئی شوق بھی نہیں۔“

”کیا آپ اپنا تبادلہ چاہتے ہیں؟“ سپرنٹنڈنٹ نے سوال کیا۔

”کلکٹر صاحب کی مرضی پر منحصر ہے۔ میرے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟“

”بہر حال، آپ نے کلکٹر کے سامنے زیادہ بول کر اچھا نہیں کیا۔“ سپرنٹنڈنٹ کی پیشانی

شکلن آلود ہو گئی۔

”ایک مچھلی سارے تالاب کو گندا کر دیتی ہے۔“ آفاقی نے کھل کر کہا لیکن بات آگے نہیں بڑھ سکی اس لئے کہ اندر سے بلاوے آنے شروع ہو گئے تھے۔ اور سب سے پہلے جمال الدین ہی کو طلب کیا گیا تھا۔ انسپکٹر آفاقی جیب سے رومال نکال کر پیشانی کا پسینہ خشک کرنے لگا، سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بھی اپنے اپنے خیالات میں مستغرق نظر آ رہے تھے۔



نعمان کریمی اس وقت بڑی ترنگ میں تھا۔ گھر سے روانگی سے پہلے اس نے خاصی چڑھا رکھی تھی۔ لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ گاڑی چلانے کے قابل نہ ہو یا اس کے قدم لڑکھڑانے لگیں۔ عاشی حسب وعدہ ٹھیک سات بجے نشاط سینما کے شوروم میں اسے ملی، پھر نعمان کریمی نے اسے گاڑی میں بٹھانے کے بعد کہا تھا۔

”مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے انتظار کی زحمت سے بچا لیا۔“

”آپ نے اس وقت کون سا سینٹ لگا رکھا ہے؟“ عاشی نے سادگی سے پوچھا۔

”سینٹ۔“ نعمان کریمی معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”تمہیں پسند ہے اس کی خوشبو؟“

”اتنی بری بھی نہیں ہے کہ برداشت نہ کر سکوں۔“ وہ بھی مسکرا دی۔

”یو آر گرےٹ مائی ڈیر!“ نعمان کریمی نے اس کی جانب محمور نگاہوں سے دیکھا۔

تقریباً چالیس منٹ بعد وہ شہر کے سب سے اعلیٰ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں بیٹھے تھے۔ نعمان کریمی نے پیرے کو بلا کر دل کھول کر آرڈر دیا۔ پھر جب ڈنر سرد ہوا تو عاشی ڈھیر ساری ڈشز دیکھ کر حیرت سے بولی۔

”اتنا کھانا تو دس آدمی بھی با آسانی کھا سکتے ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ تم اب تکلف سے کام لے رہی ہو۔“

”جی نہیں..... ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ ہلکے سے مسکرا دی۔

”ایک بات کہوں، عاشی!“ نعمان کریمی نے لڑکیوں کی روایتی کمزوری کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ ”تم اس وقت غضب کی لگ رہی ہو۔ ہال پر ایک نظر ڈالو تو تمہیں میری بات کا یقین آجائے گا۔ یہاں جتنے حسین چہرے نظر آ رہے ہیں، وہ سارے کسی نہ کسی بیوٹی پارلر کی مہارت کا نتیجہ ہیں۔ اور تم..... بغیر میک اپ کے بھی کسی تازہ گلاب کی طرح نظر آ رہی ہو۔“

”کھانا کھائیے، ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو اصل ذائقہ جاتا رہے گا۔“ وہ قدرے شرما کر بولی۔

”تم ٹھیک کہتی ہو۔ ورنہ میں ہمیشہ ٹھنڈا کر کے کھانے کا عادی ہوں۔“ نعمان کریمی کا

لجہ معنی خیز تھا۔

بڑی دیر تک ان کے درمیان اسی قسم کی بات چیت ہوتی رہی۔ نعمان کریمی کا نشہ عاشی کے قرب کے باعث دو آہستہ ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ کسی ماہر شکاری کی طرح اسے ششے میں اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بے تکلفی بڑھاتا جا رہا تھا۔ پھر باتوں باتوں میں اس نے عاشی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو عاشی نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا، سب سے ہوائے انداز میں اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

”پلیز مسٹر نعمان! یہاں اور بہت سارے لوگ بھی موجود ہیں۔ کسی نے دیکھ لیا تو کیا سوچے گا؟“

”یو آر اناٹ.....“ نعمان کریمی نے آہستہ سے جال پھینکا۔ ”اگلی بار ہم سی بیچ (Sea Beach) پر تفریح کرنے چلیں گے۔ وہاں میرا ذاتی ہٹ ہے۔“

”کیا وہاں قرب و جوار میں اور کوئی ہٹ نہیں ہے؟“

”بے شمار ہٹس ہیں۔ لیکن وہاں کوئی دوسرے پر توجہ نہیں دیتا۔“ اس نے بڑی رازداری سے سرگوشی کی۔ ”سب اپنے اپنے کام میں مست ہوتے ہیں۔“

”ایک بات پوچھوں؟“ عاشی نے آہستہ سے کہا۔ ”کیا آپ کبھی مس عانثہ کو بھی ساحل سمندر کی تفریح کرانے لے گئے تھے؟“

”نہی بار۔ لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟“ نعمان کریمی کے دل میں چور تھا، اس لئے وہ عانثہ کا نام سن کر گڑبڑا سا گیا۔ ”کیا عانثہ نے تم سے کچھ کہا تھا؟“

”جی نہیں۔ لیکن جب سے آپ نے مس عانثہ کو ہٹا کر مجھے اس کی سیٹ دی ہے، لوگوں میں طرح طرح کی چہ گونیاں ہو رہی ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ تمہیں میری طرف سے بدگمان کرنے کی خاطر بکواس کر رہی ہے۔“ نعمان کریمی جھلکا گیا۔ ”اگر تم نہ آتیں جب بھی میں اس کی جگہ کسی اور کو دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔“

”ہو سکتا ہے، آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ لیکن فی الحال میں آپ کے ساتھ بیچ کا پروگرام نہیں بنا سکتی۔“

”اس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“

”میں اتنی ایڈوائس نہیں ہوں، جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”ندیم اکبر کا تلخ تجربہ ابھی تک میں اپنے دل و دماغ سے نہیں مٹا سکی۔“

”پلیز ڈونٹ کوٹ دیٹ باسٹرڈ۔“ وہ تلملا کر بولا۔ ”ہو سکتا ہے کہ اس ذلیل نے تمہارے ساتھ کوئی اخلاق سے گری ہوئی حرکت کرنے کی کوشش کی ہو۔ مگر تم اس کے قصور کی

سزا مجھے کیوں دے رہی ہو؟“

”سزا نہیں، یہ مصلحت کا تقاضا ہے۔“ اس نے نظریں جھکا کر کہا۔ ”آپ کو شاید علم نہیں کہ اسے اس بات کی خبر مل چکی ہے کہ میں نے آپ کی مٹلو میں ملازمت اختیار کر لی ہے۔“

”سو دھاٹ؟“

”آج کل وہ سائے کی طرح میرے تعاقب میں لگا رہتا ہے۔“ اس نے نظریں اٹھا کر نعمان کریمی کو دیکھا۔ ”اس کی حالت اس زخمی شیر کے مانند ہے، جو خون چاٹنے کے بعد آدم

خور بن جاتا ہے۔“

”اور ایسے دردے کو انسانیت کی خاطر گولی مار کر ہلاک کر دینا عین ثواب ہے۔ تم کہو تو اس کا بندوبست بھی کر سکتا ہوں۔“

”پلیز نعمان صاحب!“ وہ بڑی لجاجت سے بولی۔ ”ایسا کوئی کام نہ کریں، جس میں میری رسوائی کا اندیشہ ہو۔“

”ایک شرط پر۔“ نعمان کریمی نے پھر حالات کے دھارے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں میرے ساتھ بیچ (Beach) پر چلنے کا پروگرام طے کرنا ہوگا، ورنہ میں یہی سمجھوں گا کہ تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔“

”مجھے آپ کی یہ شرط بھی منظور ہے۔ لیکن ابھی نہیں۔“ اس نے نیم رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے گھر سے غائب رہنے کا کوئی جواز بھی تلاش کرنا ہوگا۔ اس لئے.....“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ نعمان کریمی نے مسرور لہجے میں کہا۔ ”ہم آفس کے اوقات میں بھی پروگرام مرتب کر سکتے ہیں۔ کسی کو ذرہ برابر شبہ بھی نہیں ہوگا۔ اور مجھے اس بات کا یقین بھی ہو جائے گا کہ تمہیں مجھ پر اعتماد ہے۔“

”ٹھیک ہے..... لیکن ایک دو ہفتے بعد.....“ اس نے کچھ توقف کے بعد دبی زبان میں کہا۔

”دو ہفتے کیا ہے..... تم کہو تو میں تمہاری خاطر تمام زندگی انتظار کر سکتا ہوں۔“ نعمان کریمی کے قدم ڈگمگانے لگے۔

عاشی شرما کر رہ گئی۔ پھر اس کی نظر اچانک ہال میں داخل ہونے والے دروازے کی جانب اٹھی تو یکنخت گھبرا کر بولی۔

”مسٹر نعمان! میں اب اجازت چاہتی ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے عاشی کے تغیر کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ اچانک واپسی کا خیال کیسے آگیا؟ ابھی تو تم نے ذرا بھی ختم نہیں کیا۔“



ابھی تک نہیں دیا۔“

”صرف اس لئے کہ آپ نے اس سے شادی کا وعدہ کیا تھا اور وہ امانت میں خیانت کرنے سے گریز کر رہی تھی۔“

”شادی..... ہا ہا..... ہا ہا..... ہا ہا۔“ نعمان کریمی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔  
”شادی ایک پاک جذبے کا نام ہے، میری جان! رہا شادی کا وعدہ تو اس کی قیمت میں دو لاکھ کی صورت میں ادا کر چکا ہوں۔“

”میں سمجھا نہیں؟“ سرور خان نے کہا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ کچھ کمزوریاں میرے ہاتھ میں ہیں، جس کی وجہ سے مس عائشہ زبان نہیں کھول سکتی اور میری ایک کمزوری اس کے کان تک پہنچ گئی تھی جس کی وجہ سے مجھے اس کے ساتھ سودا کرنا پڑا۔ لیکن کاروبار میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ رقم جو وہ مجھ سے لے چکی ہے، اسے بہت مہنگی پڑے۔“

”لیکن دو لاکھ بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔“

”آپ اسے وقتی طور پر ایک انویسٹ منٹ سمجھ لیں۔“ نعمان کریمی گلاس خالی کرتے ہوئے بولا۔ ”اصل کو سود سمیت واپس لینا میرا کام ہے، البتہ اس میں کچھ وقت ضرور لگ سکتا ہے۔“

”اور میرا بھاء ابھی تک وہی پرانا ہے۔“ سرور خان نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”جبکہ میں چھٹیوں میں بھی آپ کے کام اتار ہوں گا۔“  
”اوکے..... میں آپ کو بھی فی ٹرک ایک ہزار کی رقم زیادہ دوں گا۔ اب تو آپ خوش ہیں؟“

”آپ نے ابھی کہا تھا کہ مس عائشہ کی کچھ کمزوریاں آپ کے پاس ہیں۔“

”ہاں..... میں نے غلط نہیں کہا تھا۔“

”کیا میں ان کمزوریوں سے مستفید نہیں ہو سکتا؟“ سرور خان کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”آئی سی۔“ نعمان کریمی نے فراخ دلی سے کہا۔ ”ڈونٹ وری مائی ڈیز! آپ کا کام

بھی ہو جائے گا۔ میں آپ کو ایک ایسا ٹرمپ کارڈ دے دوں گا، جس کے بعد آپ کو اس کی چوٹی سر کرنے میں زیادہ دشواری کا سامنا نہیں ہوگا۔“

اسی وقت سپاہی کرامت حسین نے اندر داخل ہو کر سرور خان سے کہا۔ ”گاڑیاں تیار کھڑی ہیں۔ بس ٹرانسپورٹ پر مٹ کا انتظار ہے۔“

جواب میں سرور خان نے پر مٹ کی خانہ پُری کر کے اسے کرامت حسین کے حوالے کر دیا۔ پھر اس کے جاتے ہی نعمان کریمی سے بولا۔

”ندیم اکبر!“ وہ آہستہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”وہ یہاں بھی آ پہنچا۔ پلیز آپ یہیں بیٹھے رہیں، میں ٹیکسی پکڑ کر واپس چلی جاؤں گی۔ اس لئے کہ اگر اس نے مجھے آپ کے ساتھ یہاں دیکھ لیا تو اس کی اطلاع میرے گھر والوں کو بھی دے سکتا ہے، جس کے بعد شاید مجھے ملازمت چھوڑنی پڑے..... باقی باتیں کل دفتر میں ہوں گی۔ بالی!“

نعمان کریمی کا جواب سننے بغیر ہی وہ تیزی سے میزوں کے درمیانی راستوں سے گزر کر ہال سے باہر نکل گئی۔ نعمان کریمی کی کیفیت بالکل ایسی ہی تھی، جیسے شیر کے پنجے میں آ کر کوئی شکار نکل گیا ہو۔ اس نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا، ندیم اکبر اس وقت بھی ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ ہال کے مغربی گوشے کی ٹیبل پر بیٹھ رہا تھا۔ نعمان کریمی کی نگاہوں میں خون اتر آیا۔ اگر اسے عاشق کو اپنے جال میں پھانسنے کا خیال لاحق نہ ہوتا تو شاید اس وقت وہ ندیم اکبر کو کچا چبا جانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔

❖.....❖.....❖

سرور خان اس وقت نعمان کریمی کے دفتر میں بیٹھا پینے پلانے میں مصروف تھا۔ اس روز تعطیل تھی۔ لیکن طے شدہ پروگرام کے تحت وہ ٹھیک دس بجے جنرل نیجر کے آفس پہنچ گیا۔ پھر دونوں نے پینا پلانا شروع کر دیا۔

”مائی ڈیز مسٹر نعمان!“ سرور خان نے ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”عاشق کے سلسلے میں آپ کس منزل تک پہنچ چکے ہیں؟“

”ابھی سفر کا آغاز ہوا ہے، میری جان! منزل بھی ایک نہ ایک دن مل جائے گی۔“ نعمان کریمی نے لہراتے ہوئے کہا۔ پھر مسکرا کر بولا۔ ”آپ نے بھی تو اس میں دلچسپی لینے کی کوشش کی تھی۔ آپ کا کیا رہا؟“

”میں آپ کے حق میں فی الحال دستبردار ہو گیا ہوں۔“ سرور خان نے جواب دیا۔  
”آپ اس جنگل کے شیر ہیں، اس لئے پہلا حق آپ کا ہے۔ اس کے بعد میرا نمبر بھی آ جائے گا۔ مگر یہ بات طے ہو جانی چاہئے کہ منزل سر کر لینے کے بعد آپ مجھے اپنی کامیابی سے مطلع کر دیں گے۔“

”کیوں نہیں، کیوں نہیں؟..... ہم یاروں کے یار ہیں اور پھر آپ سے تو ہمارا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہم بھلا آپ کو کس طرح ناراض کر سکتے ہیں؟“ نعمان کریمی نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ”ویسے بھی مل بانٹ کر کھانا میری عادت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دوسرا فریق اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔“

”کیا مطلب؟“ سرور خان نے چونکتے ہوئے وضاحت چاہی۔

”میرا اشارہ مس عائشہ کی سمت تھا۔ سنا ہے کہ اس نے آپ کو تمام حدود پھلانگنے کا موقع

”میرا خیال ہے کہ حسب معمول میرا لفافہ تیار ہوگا؟“

”میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید آپ کی بے صبری کو ضرور محسوس کرتا، لیکن میں اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے کا قائل ہوں۔“ نعمان کریمی نے اپنا جملہ مکمل کرتے ہوئے بادامی رنگ کا ایک لفافہ دراز سے نکال کر سرد خان کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ ”گن لیجئے، کہیں مجھ سے کوئی بھول چوک نہ ہو گئی ہو۔“

سرد خان نے لفافہ اٹھا کر جیب میں رکھا، پھر ایک گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ ”کیا آپ نے آج مس عاشی کو آنے کو نہیں کہا تھا؟“

”نہیں۔“ نعمان کریمی نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”مس عائشہ کا جلال اب مس عاشی کو پھونک پھونک کر پیٹنے کا عادی ہو گیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ سرد خان بری طرح چونکا۔ ”کیا مس عائشہ کو ہمارے سلسلے میں کوئی بھٹک مل گئی ہے؟“

”ہوں۔ اسی لئے میں نے اس کی زبان بندی کی قیمت ادا کی ہے، جسے وقت آنے پر میں ایک کے دو کر کے وصول کروں گا۔“

تقریباً ایک گھنٹے تک وہ آپس میں بے تکلفی سے بات چیت کرتے رہے، پھر سرد خان اور نعمان کریمی دونوں ہی اس طرح چونک کر اٹھے تھے، جیسے انہیں چھت گردنے کا اندیشہ لاحق ہو۔ کلکٹر اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو مع مسلح عملے کے اندر داخل ہوتا دیکھ کر دونوں ہی بری طرح بوکھلا گئے تھے۔ کلکٹر کی نگاہیں سرد خان کو گھور رہی تھیں۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”جی..... سر!..... وہ میں ایک ضروری کنسائنمنٹ تھا، جس کے لئے مسٹر نعمان نے فون کیا تھا اور میں.....“

”اگر مال آج روانہ کرنے میں دیر ہو جاتی تو ہمیں بھاری نقصان ہو سکتا تھا۔“ نعمان کریمی نے سرد خان کو بوکھلاتا دیکھ کر کہا۔

”شٹ اپ۔“ کلکٹر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، پھر وہ سرد خان کو خونخوار نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔ ”تینوں ٹرک پکڑے جا چکے ہیں اور وہ جعلی ٹرانسپورٹ پر مٹ بھی، جس سے تم ایک معمولی رقم کے عوض حکومت کو بھاری نقصان پہنچا رہے تھے۔“

پھر کلکٹر کے حکم پر تلاشی لی گئی تو سرد خان کی جیب سے وہ بادامی رنگ کا لفافہ بھی برآمد ہو گیا، جو بوگس پر مٹ جاری کرنے کے بدلے اس نے نعمان کریمی سے وصول کیا تھا۔

”اریسٹ ہم۔“ کلکٹر نے کرخت لہجے میں کہا۔ جس کے بعد ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر سرد خان کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔

”یو مسٹر نعمان کریمی!“ کلکٹر نے نعمان کریمی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو اپنی صفائی میں کیا کہنا ہے؟“

”میں نے انسپکٹر انچارج کو ٹرانسپورٹ پر مٹ کے لئے گاڑی بھیج کر ضرور بلوایا تھا، لیکن مجھے اس کا علم نہیں ہے کہ آپ کے انسپکٹر نے.....“

”مسٹر جعفری!“ کلکٹر نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے کہا۔ ”آپ دو گواہ بلا کر آؤٹ سرچ مشیر نامہ تیار کریں اور مسٹر نعمان کریمی کو بھی ساتھ لے چلیں۔ میں ان حضرات سے اس وقت سے تمام اگلی پچھلی ڈیوٹی وصول کروں گا، جو ہمارے بد دیانت اور راشی انسپکٹر کی وجہ سے خورد برد ہوئی ہے۔“

”میں اس کے لئے تیار ہوں۔ لیکن میری عزت آپ کے ہاتھ ہے۔“ نعمان کریمی کا سارا نشہ ہرن ہو گیا، بڑی لجاجت سے بولا۔ ”اگر میری ساکھ خراب ہو گئی تو بزنس سرکل میں میری برسوں کی بنائی ہوئی عزت خاک میں مل جائے گی۔“

”یہ آپ کو پہلے سوچنا چاہئے تھا۔“ کلکٹر نے نفرت سے کہا۔ ”اب وقت گزر چکا ہے۔“

”پھر ضروری قانونی دستاویز کی تیاری کے بعد نعمان کریمی کو بھی سرد خان کے ساتھ ہی جانا پڑا۔ البتہ کلکٹر کی رعایت پر اسے ہتھکڑی نہیں لگائی گئی تھی۔

سپاہی کرامت نے اپنے بیان میں سب کچھ صاف صاف اُگل دیا تھا۔ گاڑیوں کے ڈرائیور نے البتہ یہ بیان دیا تھا کہ انہیں کاغذات کے سلسلے میں کوئی علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ اصلی ہیں یا جعلی۔ حالات کی روشنی میں اور رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد سرد خان نے بھی اسی میں عافیت سمجھی تھی کہ سب کچھ صاف صاف بتا دے۔ نعمان کریمی نے خود کو بچانے کی خاطر کلکٹر کے فیصلے کے مطابق وہ جرمانہ مع ڈیوٹی کے فوری طور پر ادا کر دیا، جو اس پر عائد کیا گیا تھا۔ سرد خان اور سپاہی کرامت حسین کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا تھا۔



کیس پکڑے جانے کے تقریباً ایک ہفتے بعد انسپکٹر جمال الدین، عاشی کے ساتھ کلکٹر کی کوشی پر موجود تھا۔

”یو ہیو ڈن ایکسیلنٹ، مسٹر جمال!“ کلکٹر نے کہا۔ پھر عاشی کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”آپ نے خاص طور پر اس کیس میں جو کردار ادا کیا ہے، وہ قابل ستائش ہے۔ اس لئے میری رکنڈیشن پر آپ کو بطور انعام اچھی خاصی اور معقول رقم بہت جلد مل جائے گی۔“

”بہت بہت شکریہ سر!“ عاشی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے جو کردار ادا کیا تھا، وہ پیسوں کے لالچ یا کسی انعام کی خاطر نہیں کیا تھا، بلکہ ان بد کردار لوگوں کو بے نقاب کرنے کے لئے کیا تھا جو ملک کو بھاری نقصان پہنچا رہے تھے۔“

## قید بامشقت

سردار خان سے میری پہلی ملاقات ایک نائٹ کلب میں ہوئی تھی، جہاں وہ رند بدست کے بجائے کسی فلاسفر کی طرح بیٹھا گلاس کو تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہونٹوں سے لگا کر چسکیاں لے رہا تھا۔ ماحول کے ہنگاموں سے وہ قطعی بے نیاز نظر آ رہا تھا۔ درمیانی فلور کے اطراف میز پر بیٹھے افراد پوری توجہ سے امینہ کو دیکھ رہے تھے، جس کے جسم کی ایک ایک بوٹی ڈرم کی وحشیانہ تال پر تھرک رہی تھی۔ ڈرم بجانے والے دونوں نومند جشی سیاہ شلوار اور سیاہ واسکٹ میں لمبوس تھے۔ اُن کے چہروں کے میک اپ کچھ اس انداز میں کئے گئے تھے کہ آنکھیں سرخ انگاروں کے مانند دکھتی نظر آرہی تھیں۔

امینہ نے پہلے ڈاننگ میں خود کو پوری دنیا سے منوایا تھا۔ رقص کرتے وقت وہ خود اپنے فن میں اتنا ڈوب جاتی تھی کہ اسے ہوش نہیں رہتا تھا۔ اس کی جنون خیزی، ڈرم بیٹ کے ساتھ ساتھ بڑھتی تھی، پھر ڈرم بجانے والے دونوں جشی پروگرام ختم ہونے کے بعد امینہ کو زبردستی پکڑ کر اسٹیج سے لے جاتے تھے۔ اس کی مدہوشی کا وہ منظر قابل دید ہوتا تھا۔ اسے اپنے رقص پر پورا عبور حاصل تھا۔ وہ اکثر ایک جگہ رک کر کھڑی ہو جاتی، اس کا اوپری جسم بالکل ساکت نظر آتا، لیکن نچلے دھڑکا ایک ایک عضو مچھلی کے مانند پھڑپھڑاتا تھا۔ پھر جب وہ اپنے اوپری جسم کی حرکت کا مظاہرہ کرتی تو نچلا دھڑک جاتا تھا۔ اسی رقص کی جنون خیزیوں نے اسے عارضہ قلب میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایک سال تک وہ ڈاکٹروں کے مشورے پر احتیاط برتی رہی، پھر ان کے منع کرنے کے باوجود وہ فلور کی طرف واپس آ گئی۔ اس کی واپسی نے اس کی بین الاقوامی شہرت میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ اس کے شائقین اس قدر بڑی تعداد میں تھے کہ پروگرام شروع ہونے سے ہفتہ دس دن پہلے ہی تمام شوز کی نشستیں فروخت ہو جاتی تھیں۔

ڈاکٹروں کے مشورے کے بعد بھی جب وہ اسٹیج کی طرف واپس آئی تو ان کا خیال تھا، امینہ کی مدہوشی کسی روز رقص کے دوران ہی اسے رویح و جسم کی قید و بند سے آزاد کر دے گی۔ چنانچہ انہوں نے بحالت مجبوری اسے صرف دس منٹ رقص کرنے کی اجازت دے دی تھی اور

”آپ مسٹر جمال کو کب سے جانتی ہیں؟“ کلکٹر نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا۔ پھر جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارے جمال الدین صاحب خاصے زندہ دل ہیں۔ لیکن مجھے کے لوگ انہیں زاہد خشک کے نام سے یاد کرتے ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے سر!“ جواب میں عاشری نے بھی مسکرا کر جمال الدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرے شوہر ندیم اکبر کے بہت پرانے دوستوں میں سے ہیں۔“

”بہر حال، میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اور آپ کے شوہر نے حکومت کی مدد کی۔“

”یہ میرا فرض تھا، سر!“ عاشری نے انکسار سے جواب دیا۔ ”آئندہ بھی اگر کبھی کسی نیک کام کی ضرورت پڑی تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گی۔“

پھر چائے کا دور چلا تو زیادہ تر باتیں اسی کیس کے بارے میں ہوتی رہیں۔ پھر کلکٹر نے جمال الدین سے دریافت کیا۔

”کیا سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر کو علم ہو گیا ہے کہ یہ سب کچھ آپ کی صلاحیتوں کی وجہ سے ہوا ہے؟“

”جی نہیں۔ انہیں ابھی تک دن رات اسی بات کی کھوج لگی ہوئی ہے کہ اس کیس میں اصل ہاتھ کس کا ہے۔“

”آپ کی ان سے آج کل کیسی بن رہی ہے؟“

”وہ ہمیشہ مجھ سے ٹالاں ہی رہتے ہیں۔“ جمال الدین نے سنجیدگی سے کہا۔ ”شاید اس لئے کہ میں ان کے معیار پر پورا نہیں اُترتا۔“

”بہر حال، آئی ایم پراؤڈ آف یو۔“ کلکٹر نے جمال الدین کو سراہتے ہوئے کہا۔ ”انٹیلی جنس براؤچ کو آپ جیسے ہی انسپکٹروں کی ضرورت ہے۔“

”تھینک یو سر!“ جمال الدین نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر کلکٹر کو زوردار سیلوٹ کرتا ہوا عاشری کے ساتھ باہر آ گیا، جہاں ندیم اکبر کٹھی کے باہر گاڑی میں بیٹھا ان کا منتظر تھا۔



ڈرم بجانے والے حبشیوں کو سختی سے تاکید کر دی تھی کہ ٹھیک دس منٹ بعد وہ اسے زبردستی فلور سے گھسیٹ کر لے جائیں۔

اس روز بھی حسب معمول وہ رقص کے اندر ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کا خوب صورت اور حسین جسم رفتہ رفتہ پسینے میں اتنا اثر اور ہوتا جا رہا تھا کہ دیکھنے والوں کے دلوں کی دھڑکنیں بھی تیز ہو گئی تھیں۔ اس کے جسم پر دیا ہی مختصر لباس تھا، جیسا بیلے ڈاننگ کرنے والیاں خاص طور پر استعمال کرتی تھیں۔ اس کے جسم کے زیر و بم اور سرخ و سفید رنگت پر پسینے کے قطرے جھللاتے تو یوں لگتا، جیسے قدرت کسی سنگ مرمر کے بنے مجسمے پر اس کے قطرے انمول ہیروں کی طرح نچھاور کر رہی ہو۔ وہ ایک رقاصہ تھی، لیکن اس کا حسین چہرہ، اس کے خوب صورت خدوخال اور چہرے پر نظر آنے والی بھولی بھالی معصومیت اس کے پیشے کی نفی کرتے نظر آتے تھے۔

میں چونکہ علاقے کا انسپکٹر انچارج تھا، اس لئے میرے لئے ایک علیحدہ نشست ہمیشہ محفوظ رہتی تھی۔ میں ایندھن کا رقص متعدد بار دیکھ چکا تھا، لیکن ہر بار یہی محسوس ہوتا تھا جیسے پہلی بار اس کے رقص اور جسمانی حرکتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ لیکن اس روز اس فرد واحد کو دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی، جو ایسے جیسی بیلے ڈانسر کو اس طرح نظر انداز کئے بیٹھا تھا، جیسے وہ محض وہاں سے نوشی کی غرض سے آیا ہو۔

میرا تجسس بے جا نہیں تھا۔ میرے فرائض منصبی میں ایسے اشخاص پر کڑی نظر رکھنا بھی شامل تھا، جو کسی طور یا کسی زاویے سے مشکوک معلوم ہوں۔ وہ شخص بھی مجھے مشکوک ہی لگا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک دیڑھ کے ذریعے کلب کے منشی کو بلا بھیجا، جو نہ جانے کیوں مجھ سے الگ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ میں ہفتے میں کم از کم دو بار اس کے اسٹاک کو چیک کرتا تھا۔ مجھے میرے ساتھیوں نے جو مجھ سے پہلے کلب کی ڈیوٹی پر تعینات تھے، یہی بتایا تھا کہ منشی چینگنہ نہ کرنے کے سلسلے میں لگے بندھے حساب کے علاوہ ایک معقول نذرانہ علیحدہ سے پیش کرتا تھا۔

میں اپنی پارسائی کا دعویٰ نہیں کرتا، لیکن میں نے بہر حال روزِ اوّل ہی یہ بات کلب کے مالک اور منشی پر واضح کر دی تھی کہ انہیں کلب میں ناجائز اور اسمگل شدہ شراب چلانے کی اجازت کسی طور پر نہیں دی جائے گی۔ میرے اس کڑے حکم کے سلسلے میں منشی نے جو میرے افسر کا خاصا منہ چڑھا تھا، اس سے ملاقات کی اور اس علاقے سے میرے تدارک کی خاطر ”خدمت کرنے“ کی پیشکش کی۔ لیکن مجھے چونکہ اعلیٰ افسروں کی حمایت حاصل تھی، اس لئے تمام تر ممکنہ کوششوں کے باوجود میرا تاولہ اس علاقے سے نہیں ہوا، جس میں وہ نائٹ کلب واقع تھا۔ چنانچہ کلب کے مالک اور منشی کو مجھے مجبوراً برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ جو رقم وہ ماہانہ ادا

کرتے تھے، اس کے عوض شروع سے ہی بات زبانی طور پر طے تھی کہ علاقہ انچارج لائسنس کی کچھ پابندیوں کو نظر انداز کرتا رہے گا، جس میں سرفہرست ایک کنڈیشن یہ بھی تھی کہ کلب کی حدود کے اندر کسی ایسی ڈانسر یا ان کال گرلز کو داخلے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، جو اپنی پیشہ ورانہ شرارتوں کے سلسلے میں عدالت سے مجرم یا سزا یافتہ قرار دی گئی ہوں۔ خلاف درزی کی صورت میں انسپکٹر کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ ٹھوس حقائق کی روشنی میں کلب کے بار کو جو اس کاروبار میں ریڑھ کی ہڈی جیسی اہمیت رکھتا ہے، سیل کر دے۔ دوسرے افسروں کی طرح میں نے بھی اس کنڈیشن سے چشم پوشی اختیار کر رکھی تھی، جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس ہدایت پر عمل کرنے کی صورت میں تمام کلب سیل ہو جاتے اور حکومت کا دیا ہوا وہ ہدف پورا نہیں ہو سکتا تھا، جو ہر سال مقرر کیا جاتا تھا۔ ایسی صورت میں علاقے کے انچارج سے نہ صرف جواب طلب کیا جاتا تھا بلکہ اسے فیلڈ ڈیوٹی سے ہٹا کر محض دفتری میز تک محدود کر دیا جاتا تھا۔

بہر حال میں نے منشی کو طلب کیا تو بظاہر وہ مسکراتا ہوا آ گیا لیکن اُس کے چہرے کے تاثرات یہی ظاہر کر رہے تھے کہ وہ مجھ سے خوش نہیں تھا۔ مجھے اس کی ناراضگی کی کوئی پروا بھی نہیں تھی۔

”کیسے یاد کیا جناب نے؟“ اس نے کاروباری لہجے میں اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے بڑی سعادت مندی سے دریافت کیا۔

”وہ شخص کون ہے؟“ میں نے اس شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”یہ بات آپ کی دیر سے بھی معلوم کر سکتے تھے۔“ اس نے دبی زبان میں کہا۔  
”کر سکتا تھا۔ لیکن آپ کو اس لئے زحمت دی کہ آپ بہر حال ویٹروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔“

”ذرا نوازی ہے جناب کی۔“ اس نے میرے طنز کو محسوس کرنے کے باوجود مسکرانے کی کوشش کی، پھر میرے مطلوبہ شخص کی سمت کچھ دیر تک دیکھنے کے بعد جواب دیا۔ ”میں نے آج اسے دوسری بار دیکھا ہے۔ کیوں؟ کیا اب کسی نئے آنے والے پر بھی حکومت کی جانب سے پابندی عائد کر دی گئی ہے؟“

”منشی جی!“ میں یک لخت بے حد سنجیدہ ہو گیا۔ ”آپ میری طبیعت سے بخوبی واقف ہیں، اس لئے میں یہی کہوں گا کہ دوبارہ آپ میرے اوپر طنز کرنے سے گریز کریں، ورنہ۔“  
”میں نے تو یوں ہی برسبیل تذکرہ ایک بات دریافت کی تھی۔“ اس نے جلدی سے معذرت کی۔ ”اگر آپ کو میری بات ناگوار گزری ہو تو.....“

”میں اس شخص کے بارے میں یہ جاننا پسند کروں گا کہ اس نے نشست کب بک کرائی تھی اور کس نام سے بک کرائی تھی۔“ میں نے منشی کی بات کاٹ دی۔

”بہتر ہے۔ میں ابھی ریزرویشن چارٹ دیکھ کر آپ کو مطلع کرتا ہوں۔“ منشی اٹھ کر چلا گیا۔ پھر اسی کے ذریعے مجھے معلوم ہوا تھا، اس شخص کا نام سردار خان ہے۔“

”کیا آپ اس شخص میں..... میرا مطلب ہے کہ سردار خان میں کوئی سرکاری دلچسپی لے رہے ہیں؟“

”مجھے خوشی ہے کہ موجودہ پیشے سے منسلک ہونے کے باوجود آپ اچھی اُردو بولنے کی کوشش کر لیتے ہیں۔“ میں نے رکھائی سے کہا۔ ”آپ کی فراہم کردہ معلومات کا شکریہ۔“

منشی اٹھ کر چلا گیا تو میں نے پھر سردار خان کی جانب دیکھا، جواب بھی کسی خیال میں مستغرق نظر آ رہا تھا۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا، پھر امینہ کا بیجانی رقص ختم ہونے کے بعد ایک ویٹر کو بلا کر میں نے سردار خان کو اپنی میز پر آنے کی دعوت بھجوا دی۔ ویٹر سے گفتگو کرنے کے بعد سردار خان نے مجھے غور سے دیکھا، پھر وہ اٹھ کر میری میز پر آ گیا۔ میں نے اس کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور بیٹھنے کی پیش کش کی، جسے اس نے قبول کر لیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کے اندر کوئی غبار تھا، جس سے وہ چھٹکارا پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ میں سردار خان سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتا، شکلیہ نامی ایک دراز قد ڈانسر جو مجھ سے کچھ بے تکلف تھی، میرے قریب آ کر بائیں آنکھ کو قدرے جھپکاتی ہوئی بولی۔

”آج کیا پروگرام ہے حضور کا؟“

”میں آج مصروف ہوں۔“

”شکریہ۔“ اس نے پیشے کے اعتبار سے بازاری لہجے میں جواب دیا۔ ”اچھا ہوا جو آپ مصروف ہیں، اب میں فی الحال اپنا میٹر ڈاؤن نہیں کروں گی۔“

وہ دو چار اسی قسم کی نامعقول باتیں کر کے چلی گئی تو گفتگو کا آغاز سردار خان کی جانب سے ہوا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ یہاں بڑی پابندی سے آتے ہیں۔ ورنہ ڈانسر اور کال گرلز تو ہر کس و ناکس کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے پیش نہیں آتیں۔“

”آپ کا اندازہ درست ہے۔“ میں مسکرایا۔ ”مگر صرف اس حد تک کہ میں ہفتے میں تین بار یہاں ضرور آتا ہوں۔ رہا ان بے جان تیلیوں کا مسئلہ تو یہ میرے ساتھ دل پشادری کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔“

”اوہ..... گویا آپ کا تعلق کسی سرکاری محکمے سے ہے۔“

”یہ اندازہ کیسے لگایا آپ نے؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل اسی طرح جس طرح آپ نے منشی سے میرے بارے میں دریافت کیا تھا۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”مگر میری معلومات کا ذریعہ کچھ اور تھا۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”آپ کا تعلق محکمہ آبکاری سے ہے اور یہ کلب آپ ہی کے علاقے میں آتا ہے۔“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ”اس کے علاوہ بھی آپ کے بارے میں بہت ساری باتیں معلوم کرنے کے بعد آج میں یہاں دوسری بار آیا ہوں۔ پہلی بار آیا تھا تو آپ نظر نہیں آئے تھے۔“

”لیکن جس انداز میں آپ نے نوشی میں مصروف تھے، اسے دیکھ کر کوئی شخص بھی آپ کو اناڑی نہیں کہہ سکتا۔“ میں نے جان بوجھ کر اس کی بات کی تصدیق کرنے سے گریز کیا۔

”میں نے یہ کب کہا کہ میں نے شراب آج پہلی بار پی ہے۔“

”گویا آپ پرانے کھلاڑی ہیں۔“ میں معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”مگر ایک بات حیرت انگیز ضرور ہے، شراب اور شباب کا تو چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن آپ تو بیلی ڈاننگ میں بھی دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ کوئی خاص وجہ؟“

”ایک وقت میں اگر انسان کئی برائیوں کا روگ پال لے تو گاڑی زیادہ دنوں نہیں چل پاتی۔“

”کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدل لینے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔“ میں نے بے تکلفی سے کہا۔

”آپ نے ابھی تک اپنے بارے میں میری معلومات کی تصدیق نہیں کی۔“ وہ میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

”جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ میں محکمہ آبکاری سے وابستہ ہوں تو میں اس کی تردید نہیں کروں گا۔ رہا سوال دیگر کوائف کا تو اس کے بارے میں آپ نے تفصیل سے کچھ نہیں بتایا۔ ایسی صورت میں بھلا آنکھ بند کر کے تصدیق کس طرح کر سکتا ہوں؟“

وہ ایک لمحے کچھ سوچتا رہا، پھر ایک ہی ٹھونٹ میں بقیہ شراب حلق کے نیچے اُتارتے ہوئے بولا۔

”میں نے سنا ہے کہ آپ اپنے مخبروں کا نام دوسرے انسپکٹروں کے مقابلے میں زیادہ صیغہ راز میں رکھتے ہیں اور جس کیس کے پیچھے لگ جاتے ہیں، اس میں کسی قسم کی خورد برد یا نذرانے کو دخل انداز نہیں ہونے دیتے۔“

”آپ مجھ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے تھے؟“ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”اس کا ذکر میں آپ کے جواب کے بعد ہی کر سکتا ہوں۔“ اس نے ساٹ لہجے میں جواب دیا۔ پھر عجیب نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”انسان اگر ایک بار کسی غلطی کے سبب اندھے کنوئیں میں گر جائے تو دوبارہ محتاط ہو کر کوئی قدم اٹھاتا ہے۔“

”مخبروں کو تحفظ دینا میرا پہلا اصول ہے، جسے میں کسی قیمت پر فروخت کرنے کا عادی

نہیں ہوں۔ رہا خورد برد کا معاملہ تو اس میں بھی آئے میں نمک ملانے کا قائل ہوں۔ نمک میں آنا ملانا پسند نہیں کرتا۔“

”مجھے اس کا علم بھی ہو چکا ہے۔“ اس نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر جواب دیا۔ ”ذاتی جیب کے اخراجات اور خبروں کو خوش رکھنے کی خاطر آپ حضرات کو ایک حد تک چھوٹ ملی ہوئی ہے۔“

”بہت خوب۔“ میں نے اپنے اور اس کے لئے گلاس بناتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو اندر کی باتوں کا بھی علم ہے۔“

”کیا میں آپ پر بھروسہ اور اعتماد کر سکتا ہوں؟“ اس نے حلق تر کرنے کے بعد مجھے غور سے دیکھا۔

”جب آپ میرے بارے میں ڈھیر ساری معلومات جمع کر چکے ہیں تو آپ کو اس بات کا بھی علم ہو گا کہ دریا میں رہ کر مگر چھوٹ سے بیر لینے کا قائل نہیں ہوں۔ لیکن ان مگر چھوٹوں کو بہت زیادہ قریب آنے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ میرا خیال ہے کہ آپ میرے جملے کا مفہوم سمجھ گئے ہوں گے۔ جہاں تک اعتماد اور بھروسہ کا تعلق ہے تو میں فی الحال وہی گھسا پٹا محاورہ استعمال کروں گا کہ آزمائش صداقت کی کسوٹی ہے۔“

”مجھے آپ کی صاف گوئی پسند آئی۔ ان ہی وجوہ کے سبب میں نے آپ سے ملنے کا فیصلہ کیا تھا۔“

”آپ نے ابھی تک ملاقات کی وجہ نہیں بیان کی۔“ میں سنجیدگی سے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ جب آپ نے مجھ سے ملاقات کر لی ہے اور میرے بارے میں ذاتی طور پر معلومات بھی حاصل کر لی ہیں تو پھر ہمیں تمہید میں وقت برباد نہیں کرنا چاہئے۔“

اس نے جواب دینے کے بجائے کچھ سوچا، ایک لمبا گھونٹ لیا، پھر کچھ توقف کے بعد دبی زبان میں بولا۔

”سب سے پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میں کیریئر ہوں جو ایک مخصوص معاملے کے عوض ناجائز مال کو ادھر سے ادھر کرنے کا کام کر رہا ہوں۔“

”میرا ذاتی تجربہ بھی یہی ہے کہ جو شخص بذاتِ خود کیریئر ہو، وہی ایک اچھا خبر بھی ثابت ہوتا ہے۔“

”اور آپ کو یہ تجربہ بھی ہو گا کہ خبر حکومت سے انعام لینے کا حق دار اسی وقت ہوتا ہے جب عدالت اپنا آخری فیصلہ کر دیتی ہے۔ اس فیصلے میں اکثر دو سال یا اس سے زیادہ کا بھی عرصہ گزر جاتا ہے۔ لہذا اسی کے پیش نظر آپ حضرات خبروں سے فوری ادائیگی کی بات کر لیتے ہیں جو یا تو ایک مقررہ رقم ہوتی ہے یا پھر پڑے جانے والے کا کچھ حصہ ہوتی ہے، جسے

درمیان سے نکالنے کے بعد ہی اصلی کاغذات تیار کئے جاتے ہیں۔“

”آپ اپنا معاملہ کس صورت میں لینا پسند کریں گے؟“

”میری جو کنڈیشن ہوگی، وہ نہ صرف آپ کے لئے فائدہ مند ہوگی بلکہ کیس کو بھی زیادہ مضبوط کر دے گی۔“ اس نے دو گھونٹ لینے کے بعد سپاٹ لیچے میں جواب دیا۔ ”میرا معاملہ یہ ہو گا کہ آپ کو مجھے اور اس لڑکی کو گرفتار کر کے سزا دلوانی ہوگی، جو میرے ہمراہ پکڑی جائے گی۔“

”کیا آپ جذباتی تو نہیں ہو رہے؟“ میں نے اسے حیرت سے مخاطب کیا۔

”سوچ لیں۔ اگر آپ کو میری شرط منظور ہے تو بات آگے بڑھائی جائے۔ بصورت دیگر مجھے کسی اور اجنبی سے رابطہ قائم کرنا ہو گا۔“

”مال کی نوعیت کیا ہوگی؟“

”قیمتی ہیرے اور جواہرات۔ اس کے علاوہ ہیر و دکن بھی ہو سکتی ہے۔“

”آپ اپنے ساتھ اس لڑکی کو کیوں گرفتار کرنا چاہتے ہیں جو آپ کی شریک کار ہے؟“

”اس لئے کہ پہلے اس نے مجھے گرفتار کر کے جرم کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اب میں اس کا وہ قرض چکانا چاہتا ہوں۔“

”آئی سی۔“ میں نے اس کے جملے کی ساخت پر غور کرتے ہوئے کہا۔ ”گویا آپ کو کیریئر کا کام مجبوراً کرنا پڑ رہا ہے۔“

”یہی بات ہے۔“

”میں کیس میں سے آپ کو نکال کر صرف اس لڑکی کو.....“

”نہیں۔“ وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو ابھی اس بات کا علم نہیں ہے کہ میں جس گروہ کے لئے کام کر رہا ہوں، اس کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ صرف لڑکی کی گرفتاری ان کی نگاہوں میں میری پوزیشن کو مشکوک بنا دے گی۔ ایسی صورت میں وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”اگر آپ کی یہی ضد ہے تو پھر میں وہی کروں گا، جو آپ چاہتے ہیں۔ لیکن اس صورت میں بھی میں اپنے محکمے کے سربراہ کو اعتماد میں لے کر آپ کے ساتھ کچھ رعایت کرانے کی بھرپور کوشش کروں گا۔“

”یہ بعد کی بات ہے۔“ اس نے گلاس اٹھا کر دوبارہ ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بنیادی طور پر اس راستے کا مسافر نہیں تھا، جس پر چلنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

”پارٹی کا کیا نام ہے.....؟“ میں نے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی خاطر

دریافت کیا۔

”یہ وقت مناسب نہیں ہے۔“ اس نے دبی زبان میں کہا۔ پھر کن انکیوں سے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ”میری آپ سے دوسری ملاقات ایک ہفتے بعد ہوگی، اس وقت میں آپ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھوں گا۔“

”لیکن اس دوران اگر پارٹی کی کوئی کھیپ روانہ ہوئی تو اس کی اطلاع مجھے کس طرح ہو گی؟“

”آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میرے پاس آپ کے دفتر اور گھر دونوں کے فون نمبر موجود ہیں۔ اگر کوئی فوری ضرورت پیش آئی تو آپ کو قبل از وقت اس سے آگاہ کر دوں گا۔“ اس نے مدہم لہجے میں کہا۔ ”میرا اصل نام بھی وہ نہیں ہے، جو میں نے اختیار کر رکھا ہے، آپ بہر حال فل مون کا کوڈ یاد رکھئے۔ میں اسی حوالے سے آپ سے فون پر رابطہ کروں گا۔“

پھر وہ اپنا جملہ مکمل کر کے اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس دروازے کی جانب چلا گیا جس پر ٹوائلٹ کی تختی موجود تھی۔ مجھے علم تھا کہ ٹوائلٹ کے اندر بھی ایک راستہ تھا، جو کلب کے عقبی حصے کی سمت نکلتا تھا۔

سردار خان کے جانے کے بعد بھی میں بڑی دیر تک اپنے ذاتی مشاہدوں کی روشنی میں اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا، میرے اندازے کے مطابق وہ ایک صاف گو اور بہادر نوجوان تھا جو کسی لڑکی کی حسین سازش کا شکار ہو کر ناجائز تجارت کے مذموم کاروبار میں ملوث ہو گیا تھا۔ ایک بار میں بھی کچھ ایسے ہی حالات سے بال بال بچ گیا تھا۔ اُس روز نئے سال کے موقع پر میں اپنے جگری دوست کے ساتھ ساحل سمندر پر واقع ایک فور اسٹار ہوٹل میں رنگ و روپ، جام و مینا اور ادھم چوکڑی میں اس قدر مدہوش تھا کہ مجھے خود اپنی خبر نہیں تھی۔ جو تھوڑا بہت ہوش تھا، وہ اس حسین ڈانسر کے قرب کی نذر ہو گیا تھا، جو اپنی جسمانی زبان میں مجھے خوشہ گندم کھانے پر اکسارہی تھی۔ لیکن میرا دوست جو ہر موقع پر محتاط رہنے کے سلسلے میں خاصا مشہور تھا، اس وقت بھی چاق و چوبند تھا۔ اچانک اس نے ہاتھ تھام کر مجھے اٹھایا اور میری ساتھی سے کچھ دیر کی مہلت حاصل کر کے باہر سبزے پر آیا، جہاں سمندر کی بھیگی ہوئیں نشے کو دوا آتھہ کر رہی تھیں۔ میں ابھی اپنے دوست سے کچھ پوچھتا چاہتا تھا کہ وہ قریب ہی کھڑے ہوئے فوٹو گرافر کو گریان سے تھام کر میرے قریب لے آیا۔ پھر اس نے فوٹو گرافر کے کمرے سے فلم نکال کر ہوا میں لہرا دیا اور جو رول ایکسپوز کئے جا چکے تھے انہیں بھی اس کی تحویل سے لے کر خراب کر ڈالا۔ پھر ایک ذرا سی سختی کے بعد فوٹو گرافر نے سب کچھ اگل دیا۔ دوسرے ڈے دار افسروں کی رنگ رلیوں میں مصروف تصاویر اُتارنے کے ساتھ ساتھ اسے مجھے بھی کلب ڈانسر اور جام و ساغر کے ساتھ ایکسپوز کرنے کی ہدایت دی گئی

تھی، جس کے عوض اسے اچھی خاصی رقم ایڈوانس ملی تھی۔ ان مخصوص حالات میں کھینچی گئی تصاویر کے ذریعے بعد میں بلیک میل کرنے کا پروگرام مرتب کیا گیا تھا۔

بہر حال، سردار خان نے جس انداز میں اپنی اور لڑکی کی گرفتاری کا معاملہ طے کیا تھا، اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس لڑکی کی کسی گہری سازش کا شکار ہونے کے بعد اس کے اشاروں پر ناپنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ لیکن ایک بات مجھے اُبھمن میں ڈال رہی تھی، وہ اپنی گرفتاری کی شرط عائد کئے بغیر بھی صرف لڑکی کو رنگے ہاتھوں گرفتار کر سکتا تھا۔ سردار خان نے مجھ سے ایک ہفتے بعد ملنے کو کہا تھا، لیکن چوتھے روز ہی جب میں سونے کے ارادے سے اپنے نرم و گرم بستر پر اپنی شریک حیات کے برابر لیٹا ہوا تھا، فون کی کھنٹی نے میرے سارے خواب منتشر کر دیئے۔

”اس وقت کون ہو سکتا ہے؟“ میری بیوی نے کہا۔

”جو کوئی بھی ہو، کہہ دو کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔“ میں نے اُکتائے ہوئے لہجے میں ہدایت کی۔ چنانچہ میری بیوی نے ریسپورڈ اٹھایا اور ابھی صرف اس نے پہلو کہا تھا کہ اس کے چہرے پر جھلاہٹ طاری ہو گئی۔ دوسری جانب سے یقیناً کوئی ایسی بات کہی گئی تھی جس نے اس کے خون کی گردش کو تیز کر دیا تھا۔

”صاحب اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ تمہاری اطلاع غلط ہے۔ تم چاہے فل مون بول رہے ہو یا ہاف سن، مجھے اس سے کوئی غرض.....“

اس سے پہلے کہ میری بیوی اپنا جملہ مکمل کرتی، میں نے ریسپورڈ ان کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

”میں فیصل بول رہا ہوں۔“ میں نے ماؤ تھ پیس میں کہا۔

”مجھے معلوم تھا کہ آپ اس وقت گھر پر ہی ہیں، ورنہ میں بلاوجہ فون نہ کرتا۔“ اس نے گویا اپنی معلومات پر فخر کرنے والے لہجے میں کہا۔

”کوئی خاص بات؟“

”ہاں۔“ دوسری جانب سے بے حد سنجیدگی سے جواب ملا۔ ”کیا آپ مجھ جیسی بڑی مچھلی اور کسی جل پر ی کا شکار کھیلنے کے بجائے کوئی چھوٹا موٹا شکار کھیلنا پسند کریں گے؟ میں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی رات کالی نہیں ہوگی۔“

”مجھے یقین ہے کہ آپ غلط بیانی سے کام نہیں لیں گے۔“

”قبل از وقت آنکھ بند کر کے کسی پر بھروسہ کرنا ٹھیک بھی نہیں ہے۔“ اس نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ ”کبھی کبھی زیادہ اعتماد بھی انسان کو خطرات کے دلدل میں گرا دیتا ہے۔“

”میں خطرات سے کھیلنے کا عادی ہوں۔“

تھا۔ میں نے ویٹر کی موجودگی ہی میں لفافہ چاک کر کے اندر سے کاغذ کا ٹکڑا نکال کر پڑھا جس پر ایک ٹائپ شدہ پیغام درج تھا۔ ”ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ تمہاری لاش کا بھی کوئی پتہ نشان نہیں ملے گا۔“ پیغام پر کسی کا نام درج نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جس شخص نے وہ لفافہ ویٹر کو دیا ہوگا، اس کا حلیہ سردار خان سے ملتا ہوگا۔ لیکن وہ خود سردار خان نہیں ہو سکتا۔ ورنہ وہ سونے کا کیس میرے حوالے بھی نہ کرتا۔

”سنو.....“ میں نے ترکیب نمبر گیارہ کے تحت دس کا ایک نوٹ نکال کر ویٹر کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”بہت بہت شکریہ۔“

”اس میں شکریے کی کیا بات ہے سر؟“ اس نے نوٹ جیب میں اڑنے کے بعد دانستہ نکال کر جواب دیا۔ ”آپ لوگوں کی خدمت کرنا تو ہمارا فرض ہے۔“

”کیا جس شخص نے تم کو یہ لفافہ دیا تھا، تم نے اسے پہلے بھی کبھی کلب میں دیکھا ہے؟“

”جی نہیں۔“

”اُس کے جسم پر کس قسم کا لباس تھا؟“

”میں یہ بھی نہیں دیکھ سکا، جناب!“ ویٹر نے سادگی سے کہا۔ ”وہ شخص چونکہ اپنی گاڑی میں تھا اس لئے میں ٹھیک طرح سے اس کی شکل و صورت بھی نہیں دیکھ سکا۔“

”گاڑی کا نمبر کیا تھا؟“

”میں نے اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی، میں یہی سمجھا تھا کہ وہ صاحب آپ کے کوئی واقف کار ہوں گے۔“ ویٹر نے بڑی صاف گوئی سے جواب دیا۔ ”البتہ میرا خیال ہے کہ وہ سیاہ رنگ کی شیور لیٹ تھی۔“ پھر وہ میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”کیا کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں ہے؟“

”ہے ایک لڑکی کا چکر۔ جسے میں بہت دنوں سے دانہ ڈال رہا ہوں۔“ میں نے مسکرا کر ویٹر کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی خاطر کہا۔ ”دو چار روز میں کام بن جائے گا۔“

ویٹر مسکرا کر چلا گیا تو میں نے اس پیغام کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہوا میں اُتھال دیا۔ اس قسم کے دھمکی آمیز خطوط ہماری فیلڈ کے لوگوں کو اکثر موصول ہوتے رہتے تھے لیکن اس پر عمل نہیں ہوتا تھا۔ میں ذاتی تجربے اور مشاہدوں کی روشنی میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ خطرناک مجرم یا جرائم پیشہ افراد کبھی کسی کو لاکار کر مارنے کی حماقت نہیں کرتے۔ جو کرنا ہوتا ہے وہ خاموشی سے کر گزرتے ہیں۔

رات دس بجے میں گھر پہنچا، منہ ہاتھ دھو کر اور لباس تبدیل کر کے واش روم سے باہر نکل رہا تھا کہ فون کی گھنٹی نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

”فیصل اسپیکنگ۔“

”گڈ..... مجھے آپ سے اسی جواب کی امید تھی۔“ اس نے جواب دیا۔ پھر بولا۔

”مے پول ہوئے کے کمرہ نمبر گیارہ میں اس وقت آپ کو ایک غیر ملکی بہ آسانی مل جائے گا، جس کے بریف کیس میں نو سو ننانوے برائڈ کا کنٹرا بینڈ (CONTRA BAND) سونا موجود ہوگا۔ اس کا وزن بہر حال پانچ ہزار تو لے سے زیادہ ہوگا۔ بریف کیس آپ کو با آسانی مل جائے گا۔“

”کیا اس کیس کا تعلق بھی کسی نہ کسی طرح آپ ہی کی پارٹی سے ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”نہیں..... لیکن اس میں کیریئر کا کردار اسی لڑکی نے ادا کیا ہے، جسے آپ کو میرے ساتھ گرفتار کرنا ہے۔“

”آئی سی۔“ میں نے فوراً ہی نتیجہ اخذ کر لیا۔ ”گویا آپ اس کے کردار کو اپنی پارٹی کی نظروں میں مشکوک کرنا چاہتے ہیں۔“

”کمرہ نمبر گیارہ میں آپ کو ایک غیر ملکی ملے گا، جسے صبح تین بجے کی فلائٹ پکڑنی ہے۔“ اس نے میری بات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں آپ کو اس وقت بستر سے نکلنے پر کبھی مجبور نہ کرتا۔ خدا حافظ!“

دوسری جانب سے لائن کاٹ دی گئی۔ پانچ ہزار تو لے سونے کا کیس میرے لئے خاصا چارمٹنگ تھا چنانچہ میں نے اسی وقت اپنے سپرنٹنڈنٹ کو حالات سے آگاہ کیا اور ایک گھنٹے بعد ہی مجرم آبکاری پولیس تھانے میں میرے سامنے موجود تھا۔ کیس چھوڑنے کے عوض اس غیر ملکی باشندے نے ہمیں اچھی خاصی آفر بھی دی تھی، اس بات کے لئے بھی معقول رقم دینی چاہی تھی کہ ہم سونے کو پکڑنے کے بعد اسے اُن کلیمڈ (Un-Claimed) ظاہر کر دیں۔ لیکن ہم نے اس کی تمام پیشکش کو رد کر دیا۔ (کبھی کبھی اپنی ساکھ بنانے کی خاطر ہمیں خالص ایمانداری سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔) بعد میں اسے عدالت سے ایک سال قید محض اور پچاس ہزار روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی، جو ہر چند کہ بہت معمولی تھی لیکن اس کے پس پردہ بھی پیش کار کی کوششوں کا خاص دخل تھا۔

سونے کے کیس کے تقریباً دس روز بعد میں حسب معمول ایک نائٹ کلب کی چیکنگ کرنے کے بعد باہر نکل رہا تھا، جب ایک ویٹر نے داخلی دروازے پر ایک بند لفافہ میرے حوالے کرنا چاہا۔

”کیا ہے اس میں؟“ میں نے ویٹر کو تیز نظروں سے گھورا۔

”مجھے نہیں معلوم سر! ایک صاحب نے مجھے دیا تھا کہ اسے آپ کے حوالے کر دوں۔“

پھر میرے استفسار پر ویٹر نے جو حلیہ بیان کیا، وہ خاصی حد تک سردار خان سے ملتا جلتا



”فل مون۔“ دوسری جانب سے سردار خان کی آواز سنائی دی۔

”آپ اپنے وعدے کے خلاف پندرہ روز بعد مجھ سے ہم کلام ہو رہے ہیں۔“ میں نے شکوہ کیا۔

”مجھے احساس ہے۔ لیکن ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”اب کیا پوزیشن ہے؟“

”سونے کے کیس نے لڑکی کی پوزیشن کو پارٹی کی نظروں میں کچھ کچھ مشکوک بنا دیا ہے۔ اس لئے پارٹی کسی بڑی کھپ کے سلسلے میں فی الحال اس پر بھروسہ نہیں کر رہی ہے لیکن یہ صورت عارضی ہے۔ جلد یا بدیر انہیں لڑکی کی خدمات سے استفادہ کرنا ہوگا۔“

”کیا اس لڑکی کا تعلق بھی کسی ایسے گھرانے سے ہے، جس پر آسانی سے ہاتھ ڈالنا پارٹی کے لئے ناممکن ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ورنہ عام حالات میں تو ایسے ناپسندیدہ عناصر کو راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے، جو پارٹی کے لئے نقصان کا سبب ہوتے ہیں۔“

”تکرر برابر کی ہو اور منافع آدھا سا جھا ہو تو ایک دوسرے کو برداشت بھی کرنا پڑتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں چونکا۔

”فیصل صاحب!“ اس نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ”میں نے آپ کا انتخاب بہت سوچنے سمجھنے کے بعد کیا تھا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ میرے ذریعے سے کیس کرنے میں سو فیصد کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ایک بات جس از وقت بتا دوں..... ہو سکتا ہے کہ اس کیس کے بعد آپ کے محکمے کی بنیادیں بھی لرز اٹھیں..... یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کو ملازمت سے برطرف کر دیا جائے۔ میں یہ سب کچھ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ مجھے علم ہے کہ آپ کے محکمے کے موجودہ سربراہ کے ہاتھ ہر طرح سے بالکل اُبلے اور صاف ہیں۔ لیکن کبھی کبھی طوفان اتنی شدت اختیار کر جاتا ہے کہ بڑے سے بڑا ماہر پیراک بھی خود کو پھری ہوئی موجوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔“

”شاید آپ نے اسی خوف سے بچنے کی خاطر اپنی گرفتاری کی شرط رکھی ہے۔“

”مجھے آپ کی دانشمندی کی داد دینی پڑے گی۔“

”کیس کب تک میچور ہونے کی امید ہے؟“ میں نے اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے

پوچھا۔

”ہو سکتا ہے، دو روز بعد ہی مجرموں کی شررگ آپ کے ہاتھوں میں آجائے۔ لیکن آپ ایک بار سوچ لیں۔ میں آپ کو جان بوجھ کر کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔“

”آپ میری فکر نہ کریں۔“ میں نے تیزی سے کہا۔ ”اس سے پہلے بھی بے شمار ایسے کیسز پکڑے گئے ہیں جن کی پشت پر بڑے بڑے مضبوط ہاتھ موجود تھے لیکن صرف ایک فون کال نے ہمیں مجبور کر دیا تھا کہ ہم اصل مجرموں کی جگہ یا تو کسی اور بدنام شخص کی گردن ناپ دیں یا پھر پکڑے ہوئے مال کو اُن کلیڈ (Un-Claimed) دکھا کر گلو خلاصی حاصل کر لیں۔“

”اگر آپ آمادہ ہیں تو پھر ٹھیک ہے، کل رات ہماری ملاقات رات گیارہ بجے صدر میں واقع ایک سینما کے باکس میں ہوگی۔ میں نے دوسرے شو کے لئے چھ نشستوں پر مشتمل پورے باکس کو ریزرو کر لیا ہے۔ وہ جگہ ہماری گفتگو کے لئے زیادہ محفوظ ہوگی۔ شو ساڑھے نو بجے شروع ہو جاتا ہے، لیکن آپ گیارہ بجے سے پہلے وہاں آنے کی کوشش نہیں کریں گے۔“

”کیا اس میں بھی کوئی مصلحت درپیش ہے؟“

”باقی باتیں ملاقات پر ہوں گی۔ ویسے آپ کو ٹاپ شدہ جوڈھکی ملی تھی، وہ بھی میں نے خوبصورت ناگن کو مزید اعتماد میں لینے کے لئے روانہ کی تھی۔ اس کو ذہن سے نکال دیں۔“ سردار خان نے جملہ مکمل کرتے ہی لائن منقطع کر دی۔

میرا ذہن سردار خان کے بارے میں مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا، وہ جس انداز میں مجھ سے ملا تھا، جس انداز میں اس نے پانچ ہزار تو لے سونے کا کیس پکڑ دیا تھا اور کسی انعام کا لالچ ظاہر نہیں کیا تھا اور اب جس انداز میں مجھ سے ملنا چاہتا تھا، وہ میرے لئے بہر حال مشکوک بن گیا تھا۔ صرف دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں، یا تو وہ حقیقتاً مجھ سے مخلص تھا یا پھر بوٹی دے کر بکرا وصول کرنے والے محاورے پر عمل کر کے مجھے کسی مصیبت میں پھانسا چاہ رہا تھا۔ انتقامی جذبے کے تحت ایک دو واقعات اس قسم کے پہلے بھی رونما ہو چکے تھے، جس میں مکڑی کا جالابن کر کئی ایجنسیوں کے سرپھرے افسران کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ خود اعتمادی کی اپنی ایک اصلیت اور اہمیت ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی یہ انسان کو یا تو بام عروج پر پہنچا دیتی ہے یا پھر اس کا نام و نشان بھی صفحہ ہستی سے مٹا دیتی ہے۔ بہر حال جرائم کی بیخ کنی اور مجرموں کی سرکوبی میں رسک ضرور ہوتا ہے اور افسران کو ان کا مقابلہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ بڑے غور و خوض کے بعد میں نے سردار خان سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب اوٹلی میں سردے چکا تھا تو پھر موسلوں سے ڈرنا بے سود تھا۔

”کیا پروگرام ہے جناب کا؟“ بیوی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

”کیا ٹھنڈا کھانا تناول فرمائیں گے؟“

بیوی کی مسکراہٹ کا جواب میں نے مسکراہٹ ہی سے دیا، پھر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر ڈانٹنگ روم میں چلا گیا، جہاں کھانا بڑی نفاست سے میز پر چنا ہوا تھا۔

اگلے دن میں پروگرام کے مطابق ٹھیک گیارہ بجے سردار خان سے ملنے پہنچ گیا۔ حفظ باقاعدہ کے طور پر کچھ حفاظتی انتظامات پہلے سے کر لئے تھے تاکہ بوقت ضرورت کام آسکیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ سردار خان مجھے سینما کے باکس میں تنہا ہی ملا تھا۔ تاریکی کی وجہ سے میں فوری طور پر اس کے لباس یا چہرے کے تاثرات کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا، البتہ باکس میں قدم رکھتے ہی خوشبو کے تیز جھونکے نے میرا استقبال ضرور کیا تھا۔ سردار خان نے اپنے لباس پر سینٹ کی پوری بوتل الٹ رکھی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ آج آپ خوشبو میں غسل کر کے آئے ہیں۔“ میں نے کچھ توقف کر کے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ سردار خان نے، جواب واضح طور پر نظر آ رہا تھا معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ”سینٹ کی یہ مہک جو آپ کو تروتازگی بخش رہی ہے، اُس حسین خاتون کی چھوڑی ہوئی ہے، جو آدھے گھنٹے پیشتر میرے ساتھ اسی باکس میں موجود تھی۔“

”کیا وہی لڑکی، جس نے آپ کو.....“

”اب میں اتنا احمق بھی نہیں ہوں کہ اسے یہاں بلا کر پارٹی کو چوکنا کرنے کی کوشش کرتا۔“ وہ میری بات کاٹتے ہوئے بڑے سکون سے بولا۔ ”جو لڑکی میرے ساتھ تھی، وہ میری ایک پرانی شناسا ہے۔“

”اور آپ نے غالباً اسے انٹرول میں رخصت کر دیا۔“

”یہی سمجھ لیں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا، پھر سنجیدگی سے بولا۔ ”کیا میں اس بات پر یقین کر لوں کہ آپ یہاں تنہا آئے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ کہیں آپ نے کسی خطرے کے پیش نظر اپنے لئے کوئی حفاظتی انتظام تو نہیں کیا؟“

”میں انکار نہیں کروں گا۔“ میں نے اس کی چھٹی جس کی سرخ بتی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے دو سپاہی بھی ساتھ ہیں، لیکن اوّل تو وہ میرے اعتماد کے لوگ ہیں، اس کے علاوہ میں نے انہیں تاکید کر دی ہے کہ وہ کسی ہنگامی صورت کو محسوس کئے بغیر سینما کے اندر داخل ہونے کی کوشش نہ کریں۔“

”مجھے آپ کی صاف گوئی سے خوشی ہوئی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ میں نے آپ کا انتخاب کر کے کوئی غلطی نہیں کی۔ دیے آپ کی اطلاع کے لئے عرض کر دوں کہ میرا ایک ذاتی گارڈ بھی اس وقت میک اپ میں باہر موجود ہے، جسے میں یہاں بیٹھے بیٹھے ہی اس طرح خطرے کا سگنل دے سکتا ہوں کہ آپ کو کسی قسم کا شبہ بھی نہ ہو سکے گا۔“

”میں نے ابھی تک اپنی پارٹی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“ میں نے اصل موضوع کو چھیڑنے کی کوشش کی۔

”پہلے میں آپ کو اپنے بارے میں بتا دوں۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”میرا تعلق ایک بہت بڑے جاگیردار گھرانے سے ہے۔ میرا اصل نام سردار خان نہیں ہے۔ میرے خاندان کے کچھ لوگ ایسے کلیدی عہدوں پر فائز ہیں، جنہیں بے حد اہم اور حساس سمجھا جاتا ہے۔ میرا تعلق بھی اس شہر سے نہیں بلکہ اندرونی علاقے سے ہے۔ میں یہاں لا (LAW) کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ میرا نام اب بھی کالج کے طلباء کی فہرست میں شامل ہے لیکن شاید میں اب اپنے مستقبل کو ان خطوط پر نہ سنوار سکوں، جس کے میں نے خواب دیکھ رکھے تھے۔“

”اور اس کی وجہ وہی پراسرار لڑکی ہے، جس نے آپ کو ٹریپ کر کے اپنے مذموم کاروبار میں بحیثیت کیریئر کے کام کرنے پر مجبور کر دیا۔“ میں نے اپنے خیال کے مطابق اس کی کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اس کے پاس آپ کے خلاف کچھ ایسا مواد موجود ہے جو اگر منظر عام پر آ گیا تو آپ کی خاندانی ساکھ کو شدید نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

”میرے پکڑے جانے کی صورت میں بھی بہر حال میرے بزرگوں کی بدنامی ہوگی۔ لیکن اس صورت میں ہمارا خاندانی وکیل مجھے بے گناہ ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کرے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کے محکمے کو اس کیس کے اصل مجرموں کی پشت پناہی کے لئے مجبور کر دیا جائے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں میری یہی خواہش ہوگی کہ وہ خوب صورت ناگن.....“

وہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر نچلا ہونٹ کاٹنے لگا۔

”اس کا تعلق کس خاندان سے ہے؟“

”سوری۔ میں قبل از وقت اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔“

”کوئی خاص وجہ؟“

”اس وجہ کا علم آپ کو کیس پکڑنے کے بعد خود ہی ہو جائے گا۔“ وہ سپاٹ لہجے میں

بولا۔

”مجھے اس سلسلے میں کب تک انتظار کرنا ہوگا؟“ میں نے قدرے اکتائے ہوئے انداز میں دریافت کیا۔ اس کی کہانی مجھے کسی پراسرار جاسوسی ناول سے ملتی جلتی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن میں اس پر اعتماد کرنے پر مجبور تھا۔ اس لئے کہ اس نے بغیر کسی معاوضے کے پچاس ہزار تو لے سونے کا کیس مجھے دیا تھا، جس کی بدولت میری کارکردگی کا گراف اونچا ہو گیا تھا۔

”میں آپ کی بے چینی محسوس کر سکتا ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”لیکن اب

آپ کو صرف دو دن اور انتظار کرنا پڑے گا۔“

”مال کہاں ہوگا؟“ میں نے پہلو بدل کر پوچھا، پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اگر آپ کی اطلاع کے مطابق کیس کسی بنگلے یا رہائشی مکان سے پکڑے جانے کی صورت میں ہماری ٹیم کو سرچ وارنٹ کی کارروائی بھی کرنی پڑے گی۔ بصورت دیگر ہم کسی جگہ بھی ریڈ

کرنے کے لئے آزاد ہیں۔“

”میں آپ کو قبل از وقت تمام صورت حال سے آگاہ کر سکتا ہوں لیکن اس شرط پر کہ وہ معلومات صرف آپ کی ذات واحد تک محدود رہیں گی۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”کالی بھیڑیں ہر اس محکمے میں موجود ہیں جو انسداد جرم کے لئے سرگرم عمل ہے۔ آپ کے محکمے میں بھی ایسے ضمیر فروش موجود ہیں جو منہ مانگی رقم کے وصول ہو جانے کی صورت میں خود آپ کو تارکی میں مردانے پر آمادہ ہو جائیں گے۔“

”آپ کا خیال سو فیصد درست ہے۔ مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ کیس پر ہاتھ ڈالنے سے قبل آپ کی فراہم کردہ معلومات لیک آؤٹ نہیں ہوں گی۔“

”اس میں بھی آپ ہی کا فائدہ ہے۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ پھر تھوڑے توقف سے بولا۔ ”دو روز بعد میں اس صورت ناگن کے ساتھ دور دراز ساحلی علاقے کی ایک عالی شان ہٹ میں موجود ہوں گا۔ ہم دونوں وہاں اندھیرا ہونے کے بعد پہنچیں گے۔ لیکن اس وقت مال ہمارے ساتھ نہیں ہوگا۔ مال کی ڈیلیوری ہمیں رات نو بجے کے بعد ہٹ کے چوکیدار کے ذریعے ہوگی، جس کا حلیہ آپ کو بتا دیا جائے گا۔ مال پہنچ جانے کے بعد ہمیں اسے لے کر سمندر کے ساحل سے کچھ دور اس کشتی تک پانی میں سفر کرنا ہوگا، جو عام طور پر مچھیروں کے تصرف میں آتی ہیں۔ کشتی پر دو افراد پہلے سے موجود ہوں گے، جنہوں نے کوئٹہ گارڈ اور دوسری ایجنسیوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی خاطر سمندر میں جال ڈال رکھا ہوگا۔ ہمارے پہنچنے کے بعد کشتی والے جال کو دو ہیں چھوڑ کر گہرے سمندر کی جانب روانہ ہوں گے۔ عام طور پر ساحلی علاقوں پر ایسی کشتیاں مچھلیوں کے شکار کے لئے استعمال کی جاتی ہیں، جو گہرے سمندر کا سفر نہیں کر سکتیں لیکن ہماری کشتی میں خفیہ طور پر ایسا طاقتور انجن موجود ہے جو ہمیں اس موٹر بوٹ تک پہنچا دے گا، جو گہرے سمندر میں موجود ہوگی۔ پھر ہمیں اس موٹر بوٹ کے ذریعے کچھ مزید سفر کرنے کے بعد مال کی ڈیلیوری ایک چھوٹے جہاز کے کپتان کو کرنی ہوگی، جو کھلے سمندر میں پہلے سے لنگر انداز ہوگا۔ اس کے بعد ہماری ڈیوٹی ختم ہو جائے گی۔“

”پلان یقیناً شاندار ہے۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ساحلی علاقے کی نگرانی کرنے والی تیز رفتار بوٹ یا بحری پولیس آپ کے آڑے آجائے۔“

”میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ ہمارے انتہائی حساس اداروں میں بھی کالی بھیڑوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔“ اس نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”اول تو ایسا ممکن نہیں ہوگا کہ کوئی دوسری ایجنسی ہمارے راستے میں دخل انداز ہو۔ انہیں پہلے ہی خرید لیا جاتا ہے۔ اور اگر اس کے باوجود کسی نے رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو ہمیں مجبوراً انہیں سمندر برد کرنے کے اختیار

حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن آج تک اس کی نوبت کبھی نہیں آئی۔“

”کیا مال ہمیشہ سمندری راستے سے روانہ ہوتا ہے؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ”جی نہیں۔ اس کے علاوہ بھی ایسے راستے اور طریق کار اختیار کئے جاتے ہیں جو ہمیں قانونی گرفت سے محفوظ رکھتے ہیں۔ لیکن میں جو کیس آپ کو دینا چاہ رہا ہوں، اس میں ساحلی علاقہ ہی استعمال کیا جائے گا۔“

”ایسی صورت میں تو ہمیں آپ دونوں کو مال کی ڈیلیوری کے فوراً ہی یا کچھ دیر بعد ہٹ کر اندر ہی گرفتار کرنا ہوگا۔“

”یہ پلان کرنا آپ کا کام ہے۔ مگر اس بات کا خیال رہے کہ کروڑوں کا مال ادھر سے ادھر کرنے والوں کے لئے انسانی خون سے ہوئی کھیلنا ایک عام سی بات ہوتی ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جب تک ہم مال دوسری پارٹی کے حوالے نہ کر دیں، خفیہ اور مسلح آنکھیں ہر لمحہ ہماری نگرانی کرتی ہیں۔ انہیں شوٹ آن ڈاؤٹ (Shoot on Doubt) کی اجازت ہوتی ہے۔“

”یہ کیس میرے لئے ایک دلچسپ چیلنج ہوگا۔“ میں نے پوری تفصیل سننے کے بعد کہا۔ ”اور خطرناک بھی۔ ایک معمولی سی غلطی بھی آپ کی پوری ٹیم کو موت کی نیند سلا سکتی ہے۔“

”مال اسی قسم کا ہوگا، جس کا تذکرہ آپ پہلے کر چکے ہیں؟“ ”ضروری نہیں ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”کم از کم مجھے اس بات کا علم پہلے سے نہیں ہوتا کہ مال کس نوعیت کا ہے۔ میں نے کبھی معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں محسوس کی۔“ ”ایسی صورت میں تو یہ بھی ممکن ہے کہ پروگرام میں اچانک اور بروقت کوئی تبدیلی کر دی جائے۔“

”ایسا بھی ہو سکتا ہے، مگر عام طور پر ایک رات قبل مجھے اس کی اطلاع ضرور مل جاتی ہے۔“

”کیا آپ اس پروگرام کے کنفرم ہونے کی اطلاع دے سکتے ہیں؟“ ”میرا ذاتی خیال بھی یہی تھا کہ پرسوں رات کو میں آپ کو پروگرام سے مطلع کر دوں۔“ ”ایک طریق کار اور بھی اختیار کیا جاسکتا ہے، جو قدرے آسان بھی ہوگا۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”وہ کیا؟“ ”کیوں نہ ہم اس مال کو اس وقت پکڑ لیں، جب اسے چوکیدار کی تحویل میں دیا جائے۔“

اُس رات میں خاصی دیر تک ذہن میں مختلف پلاننگ کرتا رہا، پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے محکمے کے سربراہ کو قبل از وقت تمام حالات سے آگاہ کر دینا چاہئے۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ مجھے اس کا اعتماد حاصل ہو جاتا بلکہ تحفظ بھی مل سکتا تھا۔ یہ بات میرے علاوہ پورے محکمے کے افسران اور ماتحت عملے کو اچھی طرح معلوم تھی کہ اس وقت ہمارے محکمے کا جو سربراہ تھا، وہ نہایت دیانت دار ہونے کے علاوہ اپنے عملے کا ساتھ بھی دیتا تھا اور کسی بھی اونچی سفارش کا ڈٹ کر مقابلہ بھی کرتا تھا، چنانچہ طے شدہ پروگرام کے تحت میں نے اگلے ہی دن ایک دوسرے کیس کے بہانے سے اس سے ملاقات کی اور وہ تمام باتیں تفصیل سے دہرا دیں، جو اس وقت تک میرے علم میں آچکی تھیں۔

میری زبانی تمام تفصیل سننے کے بعد وہ کچھ دیر تک اٹھ کر اپنے دفتر میں کچھ دبیز قالین پر خیاں انداز میں ٹھلٹا رہا، پھر دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”آپ کا کیا اندازہ ہے، کیا سردار خان نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے؟“

”پانچ ہزار تو لے سونے کا کیس بھی اسی کی انفارمیشن پر پکڑا گیا تھا۔“ میں نے آگاہ کیا۔

”آئی سی۔“ افسر اعلیٰ نے تھوڑے وقفے سے جواب دیا۔ ”مجھے آپ کی اس بات سے اتفاق ہے کہ ہم کلی طور پر اپنے آدمیوں کو اعتماد میں نہیں لے سکتے۔ جب پارٹی اتنی سوریں فل ہے تو پھر اس کے ذرائع بھی لاحدود ہوں گے۔ ایسی شکل میں یہ ہو سکتا ہے کہ میں کچھ دوسری ایجنسیوں کے افسران بالا سے اپنے لیول پر بات کروں تاکہ ہمیں صرف دیانت دار افسران مل سکیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ دوسری ایجنسیاں بھی ہماری ذمہ داریوں میں شریک ہو جائیں گی۔“

”جیسا آپ مناسب خیال کریں سر! لیکن میری پلاننگ کچھ اور تھی۔“ میں نے دبی زبان میں کہا۔

”وہ کیا؟“

”میرا ذاتی خیال ہے کہ ہم کیس کے سلسلے میں صرف اپنے ہی معتبر اسٹاف کو شریک کریں۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”انہیں کیس کی نوعیت کچھ اور بتائی جائے اور پارٹی کی روانگی سے پیشتر یہ بات راز میں رکھی جائے کہ ہمیں کس کیس پر اور کس سمت جانا ہے۔ رہا دوسری ایجنسیوں کا معاملہ تو آپ اپنے اثر و رسوخ سے انہیں ریڈ الرٹ کے لئے آمادہ کر لیں تاکہ بروقت وہ ہماری مدد کر سکیں۔“

”ہم..... آپ کو کتنے ممبر درکار ہوں گے؟“

”زیادہ سے زیادہ دو افسران اور چار سپاہی۔ میں ان افسروں کا انتخاب بھی کر چکا ہوں۔“ میں نے اپنے ذہن میں تشکیل دی ہوئی ٹیم کے نام ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”صرف

”آپ کو اس طرح یقیناً کم خطرات کا سامنا ہوگا۔ لیکن یہ صورت مجھے منظور نہیں ہے۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔ ”اس خوب صورت ناگن کا سر چکنا بہر حال ضروری ہے۔ اسی کی خاطر میں نے آپ کو اعتماد میں لیا ہے۔ اب میری ایک شرط اور بھی ہے۔“

”کیا؟“ میں نے اس کے کھر درے انداز کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کو اپنے ساتھ ایک فوٹو گرافر بھی رکھنا ہوگا۔“ اس نے سر دلچے میں کہا۔ ”کیس کے لئے آپ کیا طریق کار اختیار کرتے ہیں یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے لیکن بہر صورت آپ کو مجھے اور ناگن کو چھڑی لگانی ہوگی جس کے بعد آپ کا فوٹو گرافر ہماری تصویر لے گا۔ مجھے اس تصویر کی ایک کاپی مع نگینوں کے درکار ہوگی۔“

”مجھے منظور ہے۔“ میں نے وعدہ کر لیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں آپ کو ایک رات قبل کیس کے سلسلے میں کفرم کر دوں گا۔ کوڈ ورڈ وہی ہوگا۔ فل مون۔“

”مجھے شدت سے آپ کی کال کا انتظار رہے گا۔“ میں نے رخصتی مصافحہ کے بعد اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں اب اجازت چاہوں گا۔ ہم دونوں کا یہاں سے ایک ساتھ باہر نکلنا مناسب بھی نہیں ہوگا۔“

اس کے بعد میں واپس گھر آ گیا۔ سردار خان نے (جو اس کا اصلی نام نہیں تھا) جو حالات بتائے تھے اس میں قدم قدم پر موت کا خطرہ لاحق تھا، اس کے باوجود میری چھٹی جس یہی بتا رہی تھی کہ میں اس کیس کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ لیکن بہر حال اصل مجرموں کے نام کی تشہیر ممکن نہیں ہوگی۔ ایسی صورت میں سردار خان کی فوٹو والی شرط میرے لئے مہنگی بھی پڑ سکتی ہے۔ اگر وہ خوب صورت ناگن جس کا سر چکنا مطلوب تھا، اتنی ہی با اثر تھی کہ اوپر سے ایک کال کرا کے محکمے کے اعلیٰ افسروں کی کرسی بھی ڈانواں ڈول کر اسکتی تھی تو تصویر اتارنے کی صورت میں اوپر سے فون کرنے والے کا ایک مطالبہ یہ بھی ہوگا کہ اس کا نگینو بغیر تشہیر کے واپس کر دیا جائے جب کہ سردار خان نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں تصویر کی ایک پرنٹ مع نگینوں کے اس کے حوالے کر دوں گا۔ کیس کے بارے میں اس نے اختیار کئے جانے والے جس طریق کار کا اظہار کیا تھا، وہ نہ صرف پیچیدہ تھا بلکہ ہمارے لئے بہت رکی بھی تھا۔ میرے لئے ضروری تھا کہ صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک پوری ٹیم تشکیل دیتا لیکن سردار خان کی ”کالی بیھڑوں“ والی بات بھی غلط نہیں تھی۔ میں چونکہ گھر کا بھیدی تھا، اس لئے ان افسران اور سپاہیوں سے بخوبی واقف تھا، جو ذاتی مفاد اور لالچ کی خاطر لٹکا ڈھانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ قابل اعتماد افراد کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی کہ کوئی ممکنہ خطرہ مول لینے کی کوشش کرتا۔

لیڈی سرچہ فیروزہ میرے ساتھ میک اپ میں ہوگی، تاکہ ہماری نقل و حرکت کو مشکوک نہ سمجھا جائے۔ فوٹو گرافر کارول بھی میں ہی ادا کروں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ افسر اعلیٰ نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے آپ کا مشورہ قبول ہے۔ لیکن ریڈارٹ کا سگنل دینے کے بجائے میں ایک دوسرے طریقے پر غور کر رہا ہوں جو میں قبل از وقت کسی پر ظاہر نہیں کروں گا۔“

”ایز یو وٹ سر!“

”کیا آپ نے اپنے ذرائع سے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اصل پارٹی کون ہے؟“

”میں نے اصرار کیا تھا سر! لیکن سردار خان نے قبل از وقت اس کا نام ظاہر کرنے سے انکار کر دیا۔“

”کیا کیس میچور ہو جانے کے بعد سردار خان پارٹی کے خلاف بیان دینے پر آمادہ ہو جائے گا؟“

”اس نے یہی وعدہ کیا ہے سر!“

”آل رائٹ۔ یو گواہیڈ۔“ افسر اعلیٰ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”سردار خان کا فون موصول ہونے کے بعد آپ فوری طور پر مجھے مطلع کریں گے۔ لیکن کسی پبلک پوتھ سے یا کسی اور فون سے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کی کال ٹریپ کر لی جائے۔ رہا کسی بھاری بھر کم سفارش کا مسئلہ تو آپ بے فکر ہیں۔ میں ہر قیمت پر آپ کو پروٹیکٹ کروں گا۔“

”تھینک یو سر!“ میں نے پُر جوش لہجے میں کہا، پھر اٹھ کر سیلیوٹ کیا اور باہر آ گیا۔

میں نے اپنے اعتماد کے دو افسران اور چار سپاہیوں کو تاکید کر دی تھی کہ وہ ہر وقت آسانی سے خود کو دستیاب رکھیں تاکہ بوقت ضرورت ہمیں کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ میں نے اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ان کو کیس کی پوزیشن توڑ مروڑ کر بیان کی تھی۔

دو روز تک سردار خان سے میرا کوئی رابطہ نہیں ہو سکا۔ ہماری فیلڈ میں چالاک قسم کے اہنگر یا مخبر جن کو اپنا کوئی بڑا مفاد مقصود ہوتا ہے، وہ بڑی چالاک اور عیاری سے ”بوٹی دے کر“ بکرا وصول کر لیتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ افسر کو اعتماد میں لینے کے بعد کوئی چھوٹا موٹا کیس کرا دیتے ہیں، پھر اس کی توجہ کسی طرف مبذول کرانے کے بعد دوسری جانب سے کوئی بڑی کھیپ نکلوانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ہو سکتا تھا کہ سردار خان نے بھی مجھے پانچ ہزار تو لے سونے کا کیس (جس کی مالیت ان دنوں کے اعتبار سے پانچ لاکھ پچاس ہزار پتی تھی) دے کر میرا اعتماد حاصل کیا ہو اور اب وہ کسی دوسرے راستے سے کروڑوں کا مال نکلوانے میں بہ آسانی کامیابی کے پلان پر عمل کر رہا ہو۔ بہر حال اس قسم کے رسک لینا ہماری مجبوری ہے۔

تیسرے روز بھی مجھے کوئی انفارمیشن نہیں ملی تو مجھے تشویش لاحق ہوئی۔ چونکہ میں محکمے کے سربراہ کو تمام معلومات کے بارے میں یقین دلا چکا تھا، اس لئے میری پوزیشن بھی خراب ہو سکتی تھی۔ لیکن میرے شبہات تیسرے روز رات کے تقریباً بارہ بجے ختم ہو گئے۔ سردار خان نے فل مون کا حوالہ دینے کے بعد کہا تھا۔ ”کل رات مسافر کی روانگی ہوگی۔ آپ نے جن حضرات کو دعوت نامے دے رکھے ہیں، انہیں اسٹیشن پہنچنے کی تاکید کر دیں۔ مہمان کا ایک بچہ ٹینس بال کا بہت شوقین ہے، اس کا خیال رکھئے گا۔“

”گاڑی کون سے پلیٹ فارم اور اسٹیشن سے روانہ ہوگی؟“ میں نے تیزی سے دریافت کیا۔

”اسٹیشن وہی ہوگا، جو میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں۔ رہا پلیٹ فارم تو میں نے اس کے بارے میں کوئی معلومات نہیں کی۔ البتہ فلی نمبر ایک سو نو کا خیال رکھیں۔ وہ آپ کو پلیٹ فارم تک چھوڑ دے گا۔“

”کیا ریلوے ٹائم ٹیبل میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے؟“

”میرا خیال ہے، پروگرام وہی ہوگا۔“ سردار خان نے جواب دیا۔ پھر سلسلہ منقطع کر دیا۔

مجھے فون پر جو اطلاع ملی، اسے ڈی کوڈ (De-Code) کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ایک سو نو نمبر کا حوالہ ہٹ کی جانب تھا، جب کہ فلی کا اشارہ ہٹ کے چوکیدار پر نظر رکھنے سے متعلق تھا۔ رہا ٹینس بال کا مسئلہ تو وہ میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ بہر حال اگلے روز میں کیل کانٹے سے لیس ہو کر اور اپنے اور لیڈی سرچہ فیروزہ کا میک اپ کرنے کے بعد ساحل سمندر کی ہٹ نمبر ایک سو نو کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے اپنے شانوں پر کیمرا لٹکا رکھا تھا اور فیروزہ کا ہاتھ انتہائی بے باکی سے تھامے اس طرح بھیگی ریت پر چہل قدمی کر رہا تھا کہ کوئی بھی دیکھنے والا ہمارے تعلقات پر شبہ کر سکتا تھا۔ (عام حالات میں فیروزہ میرے اس قدر قریب آنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتی تھی) میں نے روانگی سے قبل اپنے ایک قابل اعتماد افسر کو نوڈرہ ہٹ کے بارے میں بتا دیا تھا اور خاص طور پر ہدایت کر دی تھی کہ وہ نہ تو آفس کی کوئی گاڑی استعمال کریں نہ وردی پہننے کی حماقت کریں اور ہو سکے تو اپنے چہروں میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی کر لیں۔ رہا اسلحہ تو وہ اوڑھی جانے والی چادروں کے نیچے بھی چھپایا جاسکتا تھا۔ خود میرے پاس امریکن کولٹ (American Colt) تھا جسے میں نے لوڈ کر کے اس طرح جیکٹ کے بائیں جانب چٹلون میں اڑس رکھا تھا کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہو سکے۔ میں نے اپنے ساتھی افسروں اور سپاہیوں کو خاص تاکید کی تھی کہ وہ اس وقت تک نہ تو خود کو سامنے لائیں نہ فائر کرنے کی کوشش کریں، جب تک میری جانب سے کوئی سگنل نہ ملے۔ موصول

ہونے والی اطلاع کو میں نے پہلی فرصت میں جھکے کے سربراہ کو حسب حکم پاس آن کر دیا تھا۔ ساحل پر میرے علاوہ ادھر ادھر کچھ اور جوڑے بھی راز و نیاز میں مصروف تھے۔ میں نے اپنے چلنے میں کچھ ایسی لڑکھڑاہٹ پیدا کر لی تھی، جیسے نشے کی حالت میں بدست ہوں۔ فیروزہ کی کئی تصویریں بھی میں مختلف انداز میں کھینچ چکا تھا۔ اسے چونکہ ہٹ کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا، اس لئے اس نے قریب سے گزرتے ہوئے بھی اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ البتہ میں اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے نظر میں رکھے ہوئے تھا۔ میں جس گاڑی میں گیا تھا، وہ بھی ساحل سے کچھ فاصلے پر پارک تھی۔ وہ میرے ایک دوست کی ملکیت تھی۔ وقت جیسے جیسے گزرتا جا رہا تھا، میرے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ ہٹ نمبر ایک سو نو کے اندر سے آنے والی روشنی اس بات کی ترجمان تھی کہ سردار خان اور اس کی خوب صورت ناگن وہاں موجود تھے۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ قرب و جوار میں ان کی حفاظت کے لئے بے شمار خفیہ آنکھیں ہٹ اور ساحل پر چہل قدمی کرنے والوں پر جمی ہوں گی۔ اگر سردار خان نے پارٹی کے بارے میں غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا تو اس آپریشن کی نگرانی کرنے والے بھی جدید اسلحہ سے لیس ہوں گے۔ جب کہ میرے پاس صرف ایک پستول تھا، جس کا ایک فاضل میگزین بھی میری جیب میں موجود تھا۔ صورت حال کے پیش نظر میری ایک ذرا سی غلطی بھی میرے اور فیروزہ کے جسموں میں ان گنت خونی روشن دان بنا سکتی تھی اور اگر سائنس رگی ہوئی رانقلوں کا استعمال کیا گیا تو صبح تک ہماری لاش بھی کسی کی نظروں میں نہیں آ سکتی تھی۔ دور سے دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ ہم نے بہت زیادہ چڑھا کر شرافت کی حدود کو پھلانگنے والا کھیل شروع کر دیا ہے۔

بہر حال مجھے یقین تھا کہ نیلی چھتری والا جو چاہے گا، وہی ہوگا۔ اگر میری موت کا وقت لوہ محفوظ پر رقم کیا جا چکا تھا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں ٹال سکتی تھی۔ اور اگر کامیابی میرے نصیب میں درج کر دی گئی تھی تو دشمنوں کی پوری فوج بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ ٹھیک نوبے میں نے چوکیدار نما شخص کو دیکھا، جو گتے کے دو کارٹن سر پر اٹھائے مطلوبہ ہٹ کی سمت قدم اٹھا رہا تھا۔ بظاہر یہی محسوس ہوتا تھا، جیسے ان گتوں کے کارٹن کے اندر شراب کی بوتلیں بھری ہوں گی جو گھریلو راشن کی طرح عیاش قسم کے افراد کے لئے باقاعدہ اسٹاک میں موجود ہونی ضروری ہوتی تھیں۔ اس وقت میں اور فیروزہ ہٹ سے تقریباً آدھے فرلانگ کے فاصلے پر نرم ریت پر بیٹھے تھے۔ میں نے اپنی گاڑی ایسی جگہ پارک کی تھی، جس تک پہنچنے کی خاطر مجھے مطلوبہ ہٹ کے قریب سے ہو کر گزرنہ پڑتا تھا۔

”تم یہیں بیٹھی رہنا، تا وقت یہ کہ میں تمہیں آواز نہ دوں۔“ میں نے فیروزہ سے کہا، پھر خاموشی سے اٹھ کر لڑکھڑاتا ہوا اپنی کار کی سمت قدم اٹھانے لگا۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ چوکیدار بھی

اسی وقت ہٹ سے برآمد ہوا، جب میں ہٹ کے قریب سے گزر رہا تھا۔ میں نے فوری طور پر ایک اسکیم مرتب کی اور چوکیدار کے قریب جا کر سرگوشی سے بولا۔

”کیا تم دو آدمیوں کے لئے ایک رات کے لئے کسی خالی ہٹ کا بندوبست کر سکتے ہو؟“ جواب میں وہ مجھے عیاش سمجھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”بست و بند (بندوبست) تو ہو سکتا ہے، لیکن ایک رات کے پورے دو سو روپے ہوں گے۔“

”دو سو زیادہ ہیں۔“ میں نے اس کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی خاطر کہا۔ ”عام حالات میں تو سو پچاس میں بھی کام چل جاتا ہے اور آج سچرڈے ٹائٹ بھی نہیں ہے کہ تمہیں مالک کے آجانے کا اندیشہ ہو۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے صاحب! لیکن جہاں آپ لوگ ہزاروں روپے لڑکیوں کو حاصل کرنے پر خرچ کر دیتے ہیں، وہاں ہٹ کے کرائے میں ہجر پھر کیوں کرتے ہیں؟“ اس نے میری ضرورت کو مد نظر رکھ کر کہا۔ ”ڈیڑھ سو سے کم نہیں ہوں گے۔ آپ سوچ لیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سرد آہ بھر کر جواب دیا۔ ”ہٹ کہاں ہے؟“ ”قریب ہی ہے۔ ایک دم فٹ کلاس۔ آپ تھوڑی دیر انتظار کرو، میں چابیوں کا گچھا لے کر فائنٹ آتا ہوں۔“ اس نے خوشی کا اظہار کیا، پھر تیز تیز قدم اٹھاتا اس جانب چلا گیا، جدھر چوکیداروں کے کچے کچے مکان بنے ہوئے تھے۔

چوکیدار نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے بس ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا، پھر فیصلہ کن انداز میں قدم بڑھاتا ایک سو نو نمبر کی ہٹ پر جا کر آہستہ سے دستک دی۔ دوسری دستک پر اندر سے سردار خان کی آواز سنائی دی۔

”کون ہے؟“

”چوکیدار ہوں صاحب!“ میں نے چوکیدار کے لہجے کی نقل کی۔

”اب کیا لینے آئے ہو؟“ سردار خان نے سپاٹ اور خشک لہجے میں جواب دیا۔ اس کے قدموں کی آہٹ دروازے کی طرف آنے لگی تو میں نے بڑے محتاط انداز میں اپنا کولٹ نکال لیا۔ پھر جیسے ہی دروازہ کھلا، میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ سردار خان نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ میں نے برق رفتاری سے دروازہ اندر سے بولٹ کیا، پھر سردار خان کی کنپٹی پر پستول کی نال رکھے اسے دوسرے کمرے تک (جس کی نشاندہی بھی اسی نے اشارے سے کی تھی) لے گیا، جہاں ایک خوب صورت اور حسین لڑکی انتہائی فیشن ایبل لباس میں موجود تھی۔ پویشن کو دیکھ کر وہ اس طرح چونگی، جیسے اپنی نگاہوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ خود میری حیرت کی بھی کوئی انتہا نہیں تھی۔ اس لئے کہ میں اس لڑکی کو بارہا مغفلوں میں اور اخباروں میں

تصویر کی شکل میں دیکھ چکا تھا۔ وہ ایک اتنے بڑے آدمی کی بیٹی تھی، جس کے ماتھے کی ایک شکن بھی پورے صوبے کو ہلاکتی تھی۔ اس کا باپ صوبے کے ایک اونچے منصب پر فائز تھا اور انتہائی سخت گیر طبیعت کا مالک تھا۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدیدار بھی اس کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ مرکزی حکومت کی حمایت نے اسے اور بھی نڈر اور خود سر بنادیا تھا۔

”تت..... تم کون ہو؟“ سردار خان نے کسی خوف زدہ انسان کی اداکاری کرنے میں بڑی مہارت سے کام لیا۔ ”اگر تم ہمیں لوٹنے کی غرض سے آئے ہو تو تمہیں یہاں چار پانچ ہزار کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا۔“

”میں نے رقم کی غرض سے اتنا بڑا رسک نہیں لیا ہے۔“ میں نے لڑکی کی سمت دیکھتے ہوئے سردار خان کو جواب دیا۔

”تم نے اس ہٹ میں داخل ہونے کی جرأت کس طرح کی؟“ لڑکی نے پستول کی پروا کئے بغیر بگڑے تیور سے کہا۔ ”زندگی چاہتے ہو تو خاموشی سے یہاں سے چلے جاؤ ورنہ تمہاری لاش کا بھی کوئی سراغ نہیں ملے گا۔“

”زندگی سے زیادہ میں تمہیں چاہتا ہوں اور بڑے طویل انتظار کے بعد آج میں تمہارے قریب آسکا ہوں۔“ میں نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا، دونوں کارٹن جو چوکیدار وہاں لایا تھا، اسی کمرے میں ایک جانب نظر آ رہے تھے۔

”وہاٹ نان ٹینس۔“ وہ کسی ناگن ہی کی طرح پھنکاری تھی۔

”غصے میں تم زیادہ حسین معلوم ہو رہی ہو۔ لیکن.....“

میرے جملہ ادا کرنے سے پہلے سردار خان نے جھک کر اتنی زور سے میری پلی پر کہنی ماری تھی کہ میں کراہ کر رہ گیا۔ لیکن میں نے ان دونوں کو کسی جوانی کا رروائی کی مہلت نہیں دی، ایک قدم پیچھے ہٹ کر دونوں کو پستول کی زد میں لیتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔

”ان دونوں کارٹن کو میرے حوالے کر دو، ورنہ مجھے تمہاری موت پر کوئی افسوس نہیں ہو گا۔“

”آئی سی۔“ لڑکی حقارت سے مسکرائی۔ ”تم ان کارٹن کو لے جا سکتے ہو۔ دیے بائی دی دے، کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تمہارا تعلق کس ایجنسی سے ہے اور تم نے میک اپ کر کے اپنا حلیہ تبدیل کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی ہے؟“

”ایجنسی کا علم تمہیں بہر حال بعد میں ہو جائے گا۔ رہا میک اپ کا سوال تو ہمیں خوب صورت مچھلیوں کو جال میں گھیرنے کی خاطر مختلف سوانگ بھی بھرنے پڑتے ہیں۔“

”تم شاید اپنے ہوش میں نہیں ہو۔“ سردار خان غزایا۔ ”خاموشی سے دفع ہو جاؤ، ورنہ

تمہیں اپنی یہ احمقانہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔“

”بازار کا بھاؤ اترا تا چڑھتا رہتا ہے، لیکن زندگی کا کاروبار جاری رہتا ہے۔“ میں نے سرد آواز میں کہا۔ ”فی الحال تم دونوں میرے رحم و کرم پر ہو اور میں تم دونوں کو ہتھکڑی پہنا کر یہاں سے لے جاؤں گا۔“

”کس جرم میں؟“ سردار خان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

”ڈونٹ وری ڈارلنگ!“ لڑکی نے مسکراتے ہوئے سردار خان کو ٹھنڈا کرنے کی خاطر کہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بڑی سرد آواز میں بولی۔ ”تم اگر ہتھکڑی لگانا چاہتے ہو تو یہ شوق بھی پورا کر لو۔“

”ان گتے کے کارٹنوں میں کیا ہے؟“

”اب تم ہتھکڑی لگانے کے بعد خود ہی دیکھ لینا۔“ سردار خان نے لڑکی کی بات کا مفہوم بھانپ کر بدستور ناخوشگوار لہجے میں کہا، پھر اس نے اپنے ہاتھ آگے کر دیئے۔ میں نے محتاط انداز میں جیب سے ہتھکڑی نکال کر اس کا ایک سر اسرار کے ہاتھ میں پہنا دیا اور دوسرا سر لڑکی کے ہاتھ میں لیا۔ اب وہ پوری طرح میرے قبضے میں تھے لیکن مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ ان دونوں نے خود کو اتنی جلدی سرنڈر کیوں کر دیا تھا؟ کئی باتیں ممکن ہو سکتی تھیں۔ ہو سکتا تھا کہ کارٹن کھول کر مجھے مایوسی ہوتی۔ یہ بھی ایک چال ثابت ہو سکتی تھی۔ ہتھکڑی پہن کر باہر نکلنے میں خفیہ آنکھیں انہیں دیکھتے ہی حملہ آور ہو جاتیں۔ میرے پاس وقت محدود تھا۔ چوکیدار بھی واپس آ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر خفیہ نگاہوں نے مجھے ہٹ میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا تو وہ بھی صورت حال کا جائزہ لینے کی خاطر آ سکتے تھے۔

”کیا تم اس خوب صورت ماحول اور حسین انداز میں اپنی ایک تصویر اترانا پسند کرو گے؟“ میں نے باری باری دونوں کے چہروں کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کی۔

”تم اپنی یہ خواہش بھی پوری کر لو۔“ لڑکی نے زہر خند سے جواب دیا۔

میں نے سردار خان کی فرمائش کے مطابق ان دونوں کے چہروں کو اپنے ٹیسرے میں محفوظ کیا، پھر آگے بڑھ کر میں نے ایک کارٹن پر لگی پلاسٹک ٹیپ کو ادھیڑ کر ڈھٹا کھولا تو ایک لمبے کو میں بھی چکرا گیا۔ میں نے دوسرے کارٹن پر بھی قسم آزمائی کی لیکن دونوں میں ٹینس کی مختلف رنگوں کی گیندیں موجود تھیں۔ اچانک میرے ذہن میں سردار خان کا ایک جملہ ابھرا۔ اس نے کہا تھا مہمان کا ایک بچہ ٹینس بالز کا بہت شوقین ہے۔ اس جملے نے میری چھٹی جس کو بیدار کر دیا۔ میری جس گواہی دے رہی تھی کہ ٹینس کی وہ گیندیں خاص طور پر تیار کی گئی ہوں گی اور اس کے اندر ہیرنن یا اس قسم کا کوئی اور مال یقینی طور پر موجود ہوگا۔ ”اب تم یہ پوچھو گے کہ یہ اتنی ساری ٹینس بالز یہاں کیوں موجود ہیں۔“ سردار خان دانت کچکا کر بولا۔

”تمہارے پاس ایک آخری موقع ہے۔ ہتھکڑیاں کھولو، کمرے کا رول نکال کر ہمارے سامنے تلف کرو اور یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ۔“

”کیا تم دونوں یہاں محض آواز کی نیت سے آئے تھے؟“ میں نے سردار خان کو ٹٹولنے کی خاطر کہا۔ ”تصویر ضائع کرانے کی فکر تمہیں کس لئے ہے؟ سمجھا، بدنامی سے ڈرتے ہو۔ کیوں؟“

اسی لمحے باہر سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ میں نے لپک کر ایک دیوار کی آڑ لے لی لیکن وہ دونوں بدستور میرے پستول کی زد میں تھے۔ گولیوں کی ہولناک آوازوں نے لڑکی کے ہونٹوں پر ایک خاص مسکراہٹ پیدا کر دی۔ شاید اسے یقین ہو گیا تھا کہ بازی اُس کے حق میں پلٹ چکی ہے۔ میرے ذہن میں بھی کچھ اسی قسم کے خیالات ابھر رہے تھے۔ ”اب بھی وقت ہے۔“ لڑکی نے خود سر لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ ”ہماری ہتھکڑی کھول دو۔ میرے آدمی تمہیں معاف کر دیں گے۔“

”گھبراؤ مت۔ ہم سب ایک ساتھ ہی مریں گے۔“ میں نے دل کڑا کر کے جواب دیا۔ ”تمہارے آدمی اندر داخل ہوئے تو سب سے پہلے میں تم دونوں کو بھون کر رکھ دوں گا۔ اس کے بعد میرا کیا حشر ہوگا، اس کی مجھے پروا نہیں ہے۔“

لڑکی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اچانک دُڑے کے باہر مجھے فیروزہ کی آواز سنائی دی۔ وہ ہذیبانی انداز میں چیخ چیخ کر آوازیں دے رہی تھی۔ شاید وہ پناہ کی خاطر اندر آنا چاہتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ دوسری پارٹی نے اسے قابو کر لیا ہو اور اب وہ اس کے ذریعے دروازہ کھولا کر اندر داخل ہونا چاہتے ہوں۔ بہر حال، میں اس وقت غیر یقینی حالات سے دوچار تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں آہستہ آہستہ پیچھے گیا اور دروازہ کھول دیا۔ لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی۔ فیروزہ دروازہ کھلتے ہی اوندھے منہ زمین پر گر گئی تھی۔ وہ خون میں لت پت تھی، لیکن سانس نے ابھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے سرعت سے اسے اندر کھینچا اور دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔

”تمہارا انجام اس عورت سے بھی بدتر اور عبرت ناک ہوگا۔“ لڑکی فاتحانہ انداز میں غرائی۔ سردار خان کا چہرہ کسی قسم کے جذبات کی ترجمانی نہیں کر رہا تھا۔

باہر سے گولیوں کی خوف ناک آوازیں شدت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ ایک موہوم سی اُمید باقی تھی۔ شاید میرے دونوں افسران اور سپاہی موقع کی نزاکت دیکھ کر دشمنوں کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر مجھے ہیلی کاپٹرز کی گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ لڑکی ان آوازوں کو سن کر چونکی تھی۔ خود اعتمادی کی وہ چمک جو ایک لمحہ قبل اس کے چہرے پر موجود تھی، اب بجھتے ہوئے چراغ کی مانند کپکپانے لگی تھی۔ سردار خان مجھے گھورے جا رہا تھا۔ پھر باہر تین چار خوف ناک دھماکے ہوئے جو یا تو آنسو گیس کے تھے یا پھر معمولی پاور کے بم ہیلی

کاپٹرز کے ذریعے پھینکے جا رہے تھے۔ فائرنگ کی آوازوں میں بدترجیح کی ہونے لگی۔ اس کے بعد ہیلی کاپٹرز کی آوازیں قریب آنے لگی تھیں۔ پھر لاؤڈ اسپیکر سے جو اعلان کیا گیا وہ میرے لئے بہت حوصلہ افزا تھا۔

”بہتر ہے کہ تم لوگ اپنے ہتھیار ڈال دو۔ ہم تمہیں چاروں طرف سے گھیر چکے ہیں۔ مقابلے کی صورت میں تم میں سے ایک بھی نہیں بچے گا۔“

پندرہ بیس منٹ تک پوزیشن واضح نہیں ہو سکی، لیکن اس کے بعد میرا چہرہ خوشی کے احساس سے دمک اٹھا۔ ہمارے محکمے کا افسر اعلیٰ ایک فوجی عہدیدار کے ساتھ اندر داخل ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے افسر اعلیٰ کی آواز سننے کے بعد ہی دروازہ کھولا تھا۔

”تم.....“ میرے افسر اعلیٰ نے لڑکی پر نظر پڑتے ہی چونک کر کہا۔ فوجی عہدیدار بھی حیرت زدہ نظر آ رہا تھا۔ دونوں فیروزہ کو زخمی حالت میں بھی دیکھ چکے تھے۔

”جی ہاں۔ میں اور میرا دوست۔“ لڑکی نے بے خوف انداز میں جواب دیا۔ ”ہم یہاں ساحل سمندر سے لطف اندوز ہونے کی غرض سے آئے تھے لیکن آپ کے محکمے کے اس سرپھرے افسر نے ہمارے پیس (Peace) کو ڈسٹرب کرنے کی کوشش کی۔ یہ گتے کے دو کارٹن لے کر اندر آیا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ یہ کیا سازش تیار کر رہا تھا، لیکن اس نے ہم کو دھمکی دی تھی کہ اگر ہم نے اسے بیس لاکھ کی رقم فراہم نہ کی تو یہ ہمیں کسی پری پلانڈ کیس میں الجھا دے گا۔“

”اس لڑکی کو کس نے زخمی کیا؟“ فوجی افسر نے ہونٹ کاٹتے ہوئے نرم لہجے میں سوال کیا۔

”یہ اس کے ساتھ ہی اندر آئی تھی۔ اسے باہر سے کسی نے فائر کر کے زخمی کیا تھا۔“ لڑکی نے بڑے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ اس میں بھی اس افسر کی کوئی چال ہو۔“ اس کا اشارہ میری طرف تھا۔

”ان کارٹن میں کیا ہے؟“ میرے افسر نے میری طرف دیکھا۔

”مختلف رنگوں کی ٹینس بالز۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ابھی مجھے انہیں چیک کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ گیندیں خاص طور پر اسمگلنگ کی خاطر تیار کی گئی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ اس کے اندر کوئی نہ کوئی ناجائز تجارت کا سامان ضرور موجود ہوگا۔“

فوجی افسر نے ایک رنگروٹ کو اندر بلا لیا، اس کے حکم پر رنگروٹ نے راتقل سے بینٹ نکال کر ان گیندوں کو کاٹنا شروع کر دیا۔ تین چار گیندیں اندر سے خالی نکلیں تو میرا دل دھڑکنے لگا، لیکن سرخ رنگ کی ایک گیند کاٹی گئی تو اس میں سے ہیروئن برآمد ہو گئی۔ پھر سرخ اور پیلے رنگ کی گیندوں سے ہیروئن برآمد ہونے لگی۔ سفید، بنز اور دیگر رنگ کی گیندیں خالی



تھیں۔ انہیں اس طرح سے ترتیب دیا گیا تھا کہ سرخ یا سبز رنگ کی گیندیں نیچے رکھی گئی تھیں۔ فوجی افسر اور میرے افسر اعلیٰ کا چہرہ حیرت کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس گنگ کا وہ انوکھا طریقہ پہلی بار منظر عام پر آیا تھا۔ اس سے پہلے بھی جسم کے اندر سے اور مختلف ساز و سامان کے اندر سے ہیر و ن ہیر ہو چکی تھی، لیکن ٹینس بالز کے استعمال کا وہ پہلا طریقہ تھا۔ سردار خان کے چہرے پر اُن بھن کے تاثرات نظر آنے لگے۔ لیکن لڑکی ابھی تک سینہ تانے کھڑی تھی۔ پھر اس کی آواز ہٹ میں گونجی۔

”وہاں اٹ آل دس نان سنس؟ یہ سب کچھ مجھے پھانسنے کے لئے کیا گیا ہے۔ تم سب کر پٹ ہو، تم نے میرے والد کی پوزیشن کی آڑ لے کر اپنی گھناؤنی سازش کے ذریعے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہے۔ تمہارا تعلق یقیناً دوسرے گروپ سے ہے جو میرے والد کی ایمانداری کو برداشت نہیں کرتے۔ لیکن میں دیکھوں گی کہ تم ہمارا کیا بگاڑ سکو گے۔ تم میں سے کوئی بھی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ اسے یاد رکھنا۔ عدالت میں میرا وکیل تم سب کی دجیاں بکھیر کر رکھ دے گا۔“

اسی وقت فوجی افسر کی واکی ٹاکی پر سگنل موصول ہونے شروع ہو گئے۔ وہ تیزی سے ہٹ کر باہر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد ایک فوجی نے اندر داخل ہو کر میرے افسر اعلیٰ کے کانوں میں کچھ سرگوشی کی، جس کے بعد وہ بھی ہونٹ کاٹتے ہوئے باہر چلے گئے۔ لڑکی اب حقارت بھری نظروں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ مجھے بساط اُلٹنے کا شبہ ہوا تو میں نے تیزی سے باہر جا کر اپنا کیمرا اپنے ساتھی افسر کے حوالے کیا جو میرا اشارہ پاتے ہی وہاں سے کیمرے سمیت چلا گیا۔ وہی ایک آخری ثبوت تھا، جو میرے بچاؤ کے کام آ سکتا تھا۔ میں دوبارہ ہٹ میں داخل ہوا۔ اتنی دیر میں ایک گاڑی لیڈی سرچ فیروزہ کو لے کر قطعی امداد بہم پہنچانے کی غرض سے روانہ ہو چکی تھی۔ لڑکی کا چہرہ کسی خوف اور پریشانی کے بجائے غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے کیمرا میرے پاس نہ دیکھ کر ہونٹ چبانا شروع کر دیا تھا۔ شاید اسے احساس تھا کہ میں نے ٹینس بالز سے نکلنے والے سامان کو اس طرح کیمرے میں محفوظ کیا تھا، جس میں ان دونوں کے علاوہ رگروٹ بھی شامل تھا، جو بڑی مستعدی سے گیندوں کو درمیان سے دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کا عمل کر رہا تھا۔ لڑکی کے چہرے پر کیمرے کی عدم موجودگی کے سبب شدید غصے کے کچھ پریشانی کے تاثرات بھی نظر آ رہے تھے۔ لیکن سردار خان اب خاصا مطمئن نظر آ رہا تھا۔

تقریباً بیس منٹ بعد فوجی افسر ہمارے افسر اعلیٰ کے ساتھ دوبارہ ہٹ میں داخل ہوا۔ ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ واکی ٹاکی پر کس قسم کے آرڈر ہائی کمان کی سمت سے جاری کئے گئے ہوں گے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ فوجی

افسر کے اندر داخل ہونے کے بعد دو لاشیں بھی اندر لا کر گتے کے کارٹن کے قریب ہی ڈال دی گئیں۔ پھر میرے اعلیٰ افسر نے مجھے جو حکم دیا، اس میں غصے اور مجبوری کے طے جملے تاثرات شامل تھے۔

”مسٹر فیصل! ان دونوں کی جھکڑی کھول دو۔“

لڑکی کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ سردار خان بھی بظاہر خوش نظر آ رہا تھا۔ ”مسٹر فیصل!“ جھکڑی کی بندش سے آزاد ہونے کے بعد لڑکی نے مجھے حقارت سے تحکمانہ انداز میں مخاطب کیا۔ ”وہ کیمرا جو ابھی کچھ دیر پہلے تمہارے ہاتھ میں تھا اور جسے تم بڑی چالاکي سے باہر لے جا کر اپنے کسی ساتھی کے حوالے کر آئے ہو، مجھے واپس کر دو۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔“

”میرے پاس کیمرے کے قسم کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔“ میں نے ہمت سے کام لے کر انکار کیا۔

”کیا یہ تمہارا آخری جواب ہے؟“ وہ آدم خور شیرنی کی طرح تڑپ کر بولی۔ ”سوچ لو، میرا حکم نہ ماننے کی صورت میں.....“

”تمہاری گاڑی باہر موجود ہے۔“ میرے افسر اعلیٰ نے اس کا جملہ کاٹتے ہوئے ناخوشگوار انداز میں کہا۔ ”تم اپنے ساتھی کے ہمراہ جاسکتی ہو۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے، وہ ہم بہتر سمجھتے ہیں۔“

”مائی فٹ۔“ وہ زخمی ناگن کی طرح دونوں افسران کو حقارت بھری نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔ ”آئی ول سی آل آف یو۔“

پھر ان دونوں کے چلے جانے کے بعد میں نے افسر اعلیٰ کے حکم پر جو مشیر نامہ، سیزر رپورٹ (Seizure Report) اور گواہوں کے بیانات تیار کئے اس میں لڑکی اور سردار خان کا نام نہیں تھا۔ جائے وقوعہ کے سلسلے میں بھی اس ہٹ کو درمیان میں نہیں لایا گیا۔ تیار ہونے والے کاغذات کی روشنی میں ہم نے جو کہانی بنائی تھی، وہ کچھ اس قسم کی تھی کہ ساحلی گشت کے دوران ہم نے ساحل پر دو مشکوک آدمیوں کو دیکھا، جو گتے کے کارٹن سر پر اٹھائے ہوئے مشکوک حالت میں کسی کی راہ دیکھ رہے تھے۔ ہماری پولیس پارٹی کے لٹاکارنے پر انہوں نے ریت پر لیٹ کر فائرنگ شروع کر دی۔ نتیجتاً ہماری جوابی فائرنگ سے دونوں ہلاک ہو گئے اور ہم نے گواہوں کی موجودگی میں جب ان گتے کے کارٹن سے برآمد ہونے والی ٹینس کی گیندوں کو خشک کی بنیاد پر کاٹا تو اندر سے اعلیٰ قسم کی ہیر و ن کی خاصی مقدار برآمد ہوئی۔ دوسرے دن شام کو شائع ہونے والے اخباروں میں بھی یہی ظاہر کیا گیا کہ ہمارا ریڈ اگرچہ کامیاب ثابت ہوا، لیکن مقتولین کے بارے میں کچھ معلومات نہ ہو سکیں۔

اس کیس کے ایک ہفتے بعد پہلے میرے افسر اعلیٰ کو ایک دور دراز علاقے میں تعینات کر دیا گیا۔ اس کے تین چار روز بعد انٹیلی کرپشن نے مجھے رشوت پلٹے ہوئے ایک ہوٹل سے رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا۔ یہ سب جوابی اور فرضی کہانیاں تھیں اس جھوٹے کیس کے جھوٹے گواہوں اور پولیس کی رپورٹ کی وجہ سے مجھے دو سال قید با مشقت سزا سنائی گئی۔

ڈیڑھ سال تک میں قید کی صعوبتیں برداشت کرتا رہا، پھر انقلاب نے بساط کے مہرے تبدیل کئے اور چہرے بدلے تو میرے افسر اعلیٰ کی کوششوں نے اور تصاویر کی روشنی میں مجھے باعزت طور پر رہا کر دیا گیا۔ جو لو کی کیس میں ملوث تھی، اس کے باپ نے سیاسی تبدیلیوں کو قبل از وقت محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ براہ وقت آنے سے پہلے ہی اپنے خاندان کے ساتھ بیرون ملک جا کر آباد ہو گیا۔ میرے اعلیٰ افسر کو دوبارہ تبدیل کر کے واپس بلا لیا گیا۔ ان کی اور اس فوجی افسر کی جو کیس کے وقت جائے وقوعہ پر موجود تھا، مشترکہ کوششوں ہی کا نتیجہ تھا کہ نہ صرف مجھے قید با مشقت سے رہائی ملی بلکہ میری ملازمت بھی بحال ہو گئی اور تمام بقایا جات بھی مل گئے۔

سردار خان سے میری ایک ملاقات بعد میں ہوئی اس نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا، لیکن یہ درخواست کی کہ اس کا اور اس کے خاندان کا نام درمیان میں نہ آنے پائے۔ اس نے مجھ سے تصویر کا کوئی مطالبہ بھی نہیں کیا۔ شاید اسے ان تصاویر کی حوادث باقی نہیں رہ گئی تھی۔ میری معلومات کے مطابق اس کا خاندان شریف اور با اصول لوگوں پر مشتمل تھا۔

قید با مشقت کے دوران مجھے جیل میں جن ناقابل بیان حالات سے گزرنا پڑا، اس کی ایک الگ روداد ہے۔ مجھے اس بات کا غم آج بھی ہے کہ لیڈی سرج فیروزہ نے طبی امداد ملنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا تھا۔ اس کیس کو ہوئے ایک عرصہ بیت گیا، لیکن اس کا ایک ایک لمحہ میرے ذہن میں آج بھی روزِ اوّل کی طرح محفوظ ہے!!



## کھوٹا سکہ

کلکٹر نے کانفرنس ہال میں قدم رکھا تو وہاں بیٹھے ہوئے تمام سینئر اور جونیئر افسران کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ سب ہی جانتے تھے کہ کلکٹر ڈسپلن کے بارے میں کسی کو معاف کرنے کا عادی نہیں تھا۔ وہ ایک دیانت دار اور اصول پسند آدمی تھا۔ اس کا تعلق ایسے اونچے گھرانے سے تھا، جس کا ذکر اردو جامع انسائیکلو پیڈیا میں آج بھی موجود ہے۔ باپ عالمگیر پٹانے پر ایک منصف رہ چکا تھا، جس کی شخصیت پر ”ناقابلِ فروخت“ کی تختی قدرت کی جانب سے رقم کردی گئی تھی۔

کلکٹر ظاہری شان و شوکت اور رہن سہن کے سلسلے میں بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ غیر ملکی وفد بھی اس سے ملتے تھے تو اس کی صاف گوئی اور دیانت داری پر عیش کر اٹھتے تھے۔ وہ دفتری کاموں اور کارکردگی کے معاملے میں انتہائی سخت گیر طبیعت کا مالک تھا لیکن اپنے تمام ماتحتوں کے لئے اپنے کشادہ سینے میں ایک نرم گوشہ بھی رکھتا تھا۔ اگر اس کے کسی ماتحت کو کسی غلط الزام کی سزا ملتی تو وہ اس کے اور قانون کی باریکیوں کے درمیان ایک آہنی چٹان بن جاتا تھا۔ داسے درے رخے ہر طور سے اس کی مدد کرتا تھا۔

سخت گیر طبیعت اور اصول پسند ہونے کے باوجود وہ بڑی اسپورٹنگ طبیعت کا مالک تھا۔ بذلہ بنجی بھی اس کی شخصیت کا ایک خاصہ تھی، لیکن اس کا اظہار وہ ہمیشہ خاص خاص موقعوں پر کرتا تھا۔ میں پہلے بھی ایک واقعے میں اس بات کا ذکر کر چکا ہوں کہ اٹلی جنس برانچ میں اسی کے حکم سے کسی کی تعیناتی عمل میں آتی تھی اور جب تک وہ افسر خفیہ برانچ سے منسلک رہتا تھا، اسے کلکٹر کا مکمل اعتماد حاصل ہوتا تھا۔ خفیہ برانچ میں کام کرنے والوں کے سلسلے میں اس نے ایک خاص سرکلر پورے حکمے میں جاری کیا تھا جس کی رو سے بڑے سے بڑا افسر بھی کسی انسپکٹر انٹیلی جنس کی درخواست پر بغیر کسی چون و چرا کے عمل کرنے پر مجبور تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بیشتر تنگ دل اور تنگ نظر افسران خفیہ برانچ میں کام کرنے والے انسپکٹر ان سے حسد کرتے تھے اور ان سے دور دور ہی رہتے تھے۔

بہر حال، اس وقت بھی جب کلکٹر نے کانفرنس روم میں قدم رکھا تو تمام افسران اس طرح ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے تھے، جیسے وہ کسی برقی نظام سے منسلک رہے ہوں۔ کلکٹر نے حسب عادت مسکراتی نظروں سے تمام افسروں پر نظر ڈالی، پھر فلیٹ ہیٹ اتار کر میز پر رکھی اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گیا۔ دیگر افسران نے بھی اپنی اپنی نشست سنبھال لی۔

مینٹنگ کا آغاز پچھلی کارکردگی سے شروع ہوا۔ خفیہ برانچ کا سپرنٹنڈنٹ کلکٹر کو فردا فردا ہر انسپکٹر کی کارکردگی اور پکڑے جانے والے کیسز کی تفصیل سے آگاہ کرتا رہا۔ پھر اس نے فائل بند کر کے جمال الدین کی سمت گن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے عرض کیا۔

”خلاف توقع پچھلے دو ہفتوں میں مسٹر جمال الدین نے کوئی کیس نہیں پکڑا۔“

یہاں یہ بات عرض کرنی ضروری ہے کہ جمال الدین ایک فرض شناس افسر تھا، سپرنٹنڈنٹ نے شروع شروع میں متعدد موقعوں پر اسے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی اور دبی زبان میں یہ بھی کہا۔ ”اگر گھوڑا گھاس سے دوستی کر لے گا تو اس کا پیٹ کیونکر بھرے گا۔“

جمال الدین جو باصلاحیت، ایماندار اور سختی افسر ہونے کے ساتھ کسی زمانے میں بہترین اسپورٹس مین بھی رہ چکا تھا، عام زندگی میں اسے لوگ ہمیشہ غیر سنجیدہ ہی پاتے تھے، مگر معاملہ فہم تھا۔ چنانچہ وہ سپرنٹنڈنٹ کے گھوڑے اور گھاس والی بات کو تازہ کیا پھر مسکرا کر اپنا مانی الضمیر بیان کرتے ہوئے کہا۔

”سر! اگر صرف گھوڑے ہی باقی رہ گئے تو پھر گدھوں کو کون پوچھے گا جو قصر تہذیب و تمدن کے معمار سمجھے جاتے ہیں۔“ جواب واضح ہونے کے ساتھ ادبی اعتبار سے ذرا تلخ بھی تھا لیکن سپرنٹنڈنٹ کو چونکہ اس بات کا علم تھا کہ انسپکٹر جمال الدین کلکٹر کا منظور نظر تھا اس لئے وہ اس کے جواب کو تو ہنس کر پی گیا لیکن اس کے بعد سے وہ جمال الدین کو اپنے راستے کا اسپینڈ بریکر سمجھنے لگا تھا۔ کئی موقعوں پر اس نے بڑے خوب صورت اور شاطرانہ خیال سے اس بات کی کوشش بھی کی تھی کہ انسپکٹر جمال الدین کو ڈسٹرکٹ آفیسر بنا کر اندرون سندھ کسی مقام پر تعینات کر دیا جائے۔ لیکن کلکٹر کو چونکہ ”اندرونی حالات“ کی تھوڑی بہت بھنک مل چکی تھی، اس لئے اس نے سپرنٹنڈنٹ کے مشورے کو ہر بار خوب صورتی سے ٹال دیا۔ اس وقت بھی جب سپرنٹنڈنٹ نے انسپکٹر جمال الدین کی صفر کارکردگی کے بارے میں بظاہر مسکرا کر کہا تو کلکٹر کی نگاہیں جمال الدین کی جانب انھیں جو نہایت سنجیدگی سے اپنی جگہ بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے یہی عیاں ہو رہا تھا کہ یا تو اس نے سپرنٹنڈنٹ کے ریمارکس کو سرے سے سنا ہی نہیں اور اگر سنا بھی تو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا گیا تھا۔

”مسٹر جمال الدین!“ کلکٹر کی گہیر آواز کانفرنس ہال میں گونجی۔ ”کیا کوئی خاص پریشانی یا ذاتی وجہ ہے جس میں بنا پر اس بار آپ کے نام کوئی کیس درج نہیں ہوا؟“

”ایسی کوئی بات نہیں سر!“ جمال الدین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”داصل میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں محض اپنے ہفتہ واری ریکارڈ کے گراف کو چھوٹے موٹے کیس پکڑ کر برقرار رکھوں۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ کلکٹر نے تیزی سے سوال کیا۔

”میں آج کل ایک ایسے کیس پر ورک کر رہا ہوں جو اگر میچور ہو گیا تو شاید دور دور تک اس کا تہلکہ مچ جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری زندگی خطرے میں پڑ جائے یا پھر مجھے کسی جھوٹے کیس میں ملوث کر کے ایک طویل عرصے کے لئے آہنی سلاخوں کے پیچھے بیچ دیا جائے تاکہ میں اپنی زبان بند رکھ سکوں۔“

”لیکن آپ نے مجھ سے اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔“ سپرنٹنڈنٹ نے دبی زبان میں کہا۔

”مجھے خدشہ ہے جناب! کہ اگر اس کیس کے بارے میں کسی کو ہوا بھی مل گئی تو شاید وہ لوگ مجھے قبل از وقت ہی اپنے راستے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہٹا دیں۔“ انسپکٹر جمال الدین نے سپرنٹنڈنٹ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا، پھر پہلو بدل کر بڑے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”اس کے علاوہ محترم کلکٹر صاحب کا حکم بھی ہے کہ حساس قسم کے معاملات میں اتنی رازداری سے کام لیا جائے کہ کسی کو کان و کان خبر نہ ہونے پائے۔ اس لئے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“

کانفرنس روم میں بیٹھے ہوئے ماتحت عملے کے تمام افسران مسکرا دیئے۔ سپرنٹنڈنٹ کو اتنے کھرے جواب کی توقع نہیں تھی۔ چنانچہ وہ شپٹا کر بولا۔ ”اگر آپ میرے اوپر اعتماد کرتے تو شاید میں آپ کو کوئی قیمتی مشورہ دے سکتا تھا۔“

”مجھے افسوس ہے جناب! کہ میں نے ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“ جمال الدین بدستور سنجیدہ تھا۔

سپرنٹنڈنٹ نے ان ریمارکس کو محسوس کرتے ہوئے کلکٹر کی طرف احتجاجی نظروں سے دیکھا، لیکن کلکٹر کی نگاہیں جمال الدین کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”مسٹر جمال!“ کلکٹر نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”کیا آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں؟“

”سر!“ جمال الدین نے بدستور سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”آپ ہی کے اعتماد نے مجھے یہ حوصلہ دیا ہے کہ اتنے بڑے کام میں ہاتھ ڈالنے کی جسارت کر بیٹھا۔ مجھے امید ہے کامیابی کی صورت میں بھی آپ کی واحد شخصیت ہی مجھے اس عتاب سے نجات دلائے گی، جس کے بارے میں، میں ابھی سے غور و فکر کر رہا ہوں۔“

”آئی سی۔“ کلکٹر نے ہونٹ پر زبان پھیرتے ہوئے کہا پھر بولا۔ ”اگر کیس اپنی جگہ

سالڈ (Solid) ہوا تو میں ہر قیمت پر آپ کا ساتھ دوں گا۔“

”شکریہ سر!“ جمال الدین نے بڑی عقیدت سے جواب دیا۔ ”اسی توقع پر میں اس مرتبہ بارود سے کھیلنے کی کوشش کر رہا ہوں، جو اگر میری کس معمولی غلطی سے بھی پھٹا تو اس کے دھماکے کافی عرصے تک دروازے کے علاقوں تک گونجتے رہیں گے۔“

”ڈونٹ دری۔“ کلکٹر نے سامنے رکھے ہوئے پیڑ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”میرے ہوتے ہوئے کوئی آپ کو پریشان نہ کر سکے گا۔“

”میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔“

کانفرنس تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہی، پھر اس کا اختتام اس وقت ہوا جب کلکٹر کے پی اے نے اسے بتایا کہ اسے ممبر بورڈ آف ریونیو کی میٹنگ بھی اینڈ کرنی ہے۔

”مائی بیسٹ ویشز ٹو آل آف یو۔“ کلکٹر نے اپنا فلیٹ بیٹ اٹھا کر سر پر رکھا، پھر اٹھا اور ایک شان بے نیازی سے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ بھی اپنی فائل بغل میں دبا کر کلکٹر کے ساتھ ساتھ کمرے سے باہر نکلا تھا۔

کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ کے جاتے ہی ایک بار پھر کانفرنس روم میں زندگی کے آثار واپس لوٹ آئے۔

”مسٹر جمال!“ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جعفری جو انپکٹروں کا ہر لحیزہ اور دوست واقع ہوا تھا، نے کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ کے جانے کے بعد کہا۔ ”آپ نے اس وقت جس حماقت اور گھماڑ پن کا ثبوت دیا ہے، مجھے آپ سے اس کی امید نہیں تھی۔“

”گھماڑ اور سر پھرا آدمی جب بولے گا، بغیر سوچے سمجھے ہی بولے گا۔“ اکبر خان نے جس کی جمال الدین سے بڑی گہری پھنتی تھی، مسکرا کر کہا۔

”کیوں؟ میں نے کیا غلطی کی؟“ جمال نے اکبر خان کو مسکراتی نظروں سے گھورا۔

”تمہیں بلا وجہ سپرنٹنڈنٹ کو تلخ جواب دینے کی کیا ضرورت تھی۔ تم کلکٹر صاحب سے یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ تم بعد میں انہیں اپنی مصروفیات سے آگاہ کرو گے۔“ اکبر خان نے بخیدگی سے جواب دیا۔ ”تم جانتے ہو کہ سپرنٹنڈنٹ نے کتنے لوٹے اور چھپے پال رکھے ہیں، وہ کسی کو بھی تمہاری ذم میں نہیں کر سکتا ہے۔“

”مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔“

”سچ کہا ہے کسی نے کہہ سکتے کی ذم بھی سیدی نہیں ہرتی۔“ اکبر خان ہلکا گیا۔ ”بارہ برس بعد بھی تمکلی سے نکالو تو ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔“

”آپ کچھ کہہ رہے تھے۔“ جمال الدین نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی جانب دیکھا۔

”میں بھی یہی کہنا چاہ رہا تھا کہ آپ کو بلا وجہ بولنے کی ضرورت ہی کیا تھی، بعد میں مل کر

بھی آپ کلکٹر سے سب کچھ کہہ سکتے تھے۔“

”بارود کی گرمی چڑھ گئی ہوگی، دماغ پر۔“ اکبر خان سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بولا۔

”میں پوچھتا ہوں کہ جب آپ کو کسی کیس میں جان کا خطرہ لاحق ہے تو تمہا اس کے پیچھے دوڑنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں آپ۔“ جعفری صاحب نے بے تکلفی سے کہا۔

”پورے اٹلی جنس آفس میں کیا آپ کو کسی ایک پر بھی بھروسہ نہیں ہے؟“

”جی نہیں۔“ اکبر خان نے پھر جمال الدین کو بڑی اپنائیت مگر غصے بھری نگاہوں سے گھورا۔ ”یہ اکیلے طوطے کی طرح توپ چلانے کی کوشش کریں گے، چاہے بعد میں پتلون ہی کیوں نہ بدلتی پڑے۔“

”یار! تم تو ایسی باتیں نہ کرو۔“ جمال الدین نے اکبر خان کو مزید چڑانے کی خاطر کہا۔

”اگر میں مر گیا تو سب سے زیادہ تم ہی کو روکنا پڑے گا۔“

”رہتی ہے میری جوتی۔“ اکبر خان تلملا گیا۔ ”بس، اب اس سبجیکٹ پر مجھ سے کلام کرنے کی ضرورت نہیں در نہ پیر ویت اٹھا کر مار دوں گا۔“

”اگر میں تمہارے ہاتھ سے قتل ہوا تو سیدھا جنت ہی میں جاؤں گا۔“

پھر بات بڑھ بھی سکتی تھی۔ اکبر خان پٹھان آدمی تھا، اس لئے اس کی کھوپڑی کسی وقت الٹ بھی سکتی تھی۔ چنانچہ جعفری صاحب نے درمیان میں آتے ہوئے جمال الدین سے کہا۔

”اب آپ اکیلے دفتر سے باہر بالکل نہیں جائیں گے۔ بس اسے میرا حکم سمجھ لیں۔“

”آپ کا حکم سر آٹھکوں پر۔ لیکن میں کسی نا محرم کے ساتھ بھی.....“ جمال الدین نے اپنا جملہ مکمل چھوڑ کر تیزی سے سر جھکا لیا اور نہ اکبر خان کا پھینکا ہوا پیر ویت اس کی کھوپڑی پر ہی پڑا ہوتا۔ جمال الدین کی عادت تھی کہ وہ اکبر خان کو چڑا کر اس کے غصے سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اس وقت اس کی قسمت ہی اچھی تھی جو بچ گیا، ورنہ اکبر خان محرم والی بات پر حقیقتاً ہی لال پیلا ہو گیا تھا۔ پھر حسب معمول جعفری صاحب ہی نے دونوں کے درمیان صلح کرائی تھی۔ ایسے موقعوں پر ثالث کا کردار عموماً ہی ادا کرتے تھے!!



پہلی کونٹھی کی دو منزلہ عمارت ہر اعتبار سے قابل دید تھی۔ بیرونی گیٹ پر موجود دو مسلح گارڈز کی موجودگی اس بات کی دلیل تھی کہ وہ کونٹھی کسی بہت بڑے آدمی کی ملکیت ہے، بیرونی گیٹ سے صدر دروازے تک چھوٹے چھوٹے سرخ پتھروں کی روش تھی جو پورٹیکو تک جاتی تھی۔ روش کے دونوں اطراف خوب صورت لان تھا، جس میں پودوں کی تراش خراش کے لئے ایک تجربے کار مالی موجود رہتا تھا۔ صدر دروازے کے پاس سفید لباس میں ملبوس ہمد

کے باہر موجود گارڈز کو اپنی شناخت کرائے بغیر اندر نہیں جاسکتا تھا۔ پیر اکرم شاہ کی طرف سے ان دونوں گارڈز کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ بہر حال چونکہ قرب وجوار کی کوشیوں میں بھی زیادہ تر بڑے اور کاروباری افراد رہتے تھے، اس لئے انہیں ایک دوسرے کی ذاتی زندگی کے بارے میں کوئی کھوج لگانے کی نہ تو فرصت ہی تھی نہ ہی کوئی سروکار تھا۔ سب اپنی اپنی کھال میں مست رہنے کے عادی تھے۔

اس وقت رات کے تقریباً گیارہ کا عمل تھا جب گہرے چاکلیٹ کلر کی ایک قیمتی کار پیر اکرم شاہ کی کوشی کے باہر آ کر رکی۔ کار کی پچھلی نشست پر ایک خوب صورت مرد اور ایک حسین و جمیل عورت جس کی عمر تیس بیس سے زیادہ نہیں تھی، بیٹھے تھے۔ ان کے لباس سے بھی ان کی امارت کا احساس جھلک رہا تھا۔ پہناوے کے اعتبار سے وہ دونوں ہی ماڈرن تہذیب اور آزاد خیال نظر آتے تھے۔ گاڑی ڈرائیو کرنے والا ڈرائیو سفید رنگ کی یونیفارم میں ملبوس تھا۔ گاڑی رکتے ہی ایک مسلح گارڈ مستعدی سے اس کے قریب آ گیا، جب کہ دوسرا اپنی جگہ پوری طرح محتاط نظر آ رہا تھا۔

”آپ کو کس سے ملاقات کرنی ہے؟“ مسلح گارڈ نے پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے مرد سے بظاہر بڑے مہذب لہجے میں دریافت کیا۔

”ہم گوٹھ سے آئے ہیں۔ پیر سائیں سے ملاقات کرنی ہے۔“ مرد نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”پیر سائیں اس وقت موجود نہیں ہیں۔“

”ہم ان کا انتظار کر لیں گے۔ اس لئے کہ اب اتنی رات گئے گوٹھ واپس جانا ممکن نہیں ہے۔“

”آپ کیا ان کے عزیز رشتے دار ہیں یا صرف واقف کار؟“ گارڈ نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

”ہم دونوں کئی زمانے میں ایک ساتھ ٹینس کھیلا کرتے تھے۔“ مرد نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

”لیکن پیر سائیں کا حکم ہے کہ.....“

”ہم دونوں ڈریم لینڈ پارک کے مشترکہ مالک بھی ہیں۔“ اس بار مرد نے تیز لہجے میں کہا۔ ”کیا تمہیں اور کوئی ثبوت بھی درکار ہے؟“

”سوری سر!“ گارڈ کا لہجہ یک لخت نرم پڑ گیا۔ ”میں باز پرس کی معافی کا خواستگار ہوں۔ میں نے شاہ سائیں سے ڈریم لینڈ کے بارے میں سن رکھا ہے، مگر پیر سائیں کا حکم ہے کہ شناختی کارڈ دکھائے بغیر کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ دی جائے اور میرا خیال غلط نہیں

وقت ایک ملازم تعینات رہتا تھا، جو آنے جانے والوں کے لئے دروازہ کھولنے کی خدمت انجام دیتا تھا۔ بیرونی گیٹ کے اوپر بائیں جانب پیر اکرم شاہ کی تختی موجود تھی جس کے بارے میں لوگوں کو یہی علم تھا کہ وہ حزب اختلاف اور حزب اقتدار دونوں دھڑوں میں یکساں مقبولیت کا حامل تھا۔ وہ ایک اچھی فکر اور پراسرار شخصیت کا مالک تھا۔ اچھی شہرت اس لئے تھی کہ آئے دن اخبارات میں اس کے بارے میں خبریں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ وہ بیک وقت کئی رفاہی اداروں کا صدر تھا اور فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کا عادی تھا۔ جن افراد کو اس سے ملنے کا شرف حاصل تھا، وہ بھی ہر وقت اس کی شان میں قصیدے پڑھتے رہتے تھے۔ صورت و شکل کے اعتبار سے بھی وہ خاصا منسار، حلیم الطبع اور مذہبی نظر آتا تھا۔ شہر میں اس کے کئی کاروباری ادارے بھی موجود تھے لیکن ایک عام خیال یہ تھا کہ بیرونی منڈی میں اس کے مقامی قالینوں اور سبز و سیاہ پتھروں کی آرائشی اشیاء کی بہت بڑی کھپت تھی۔ اس کے علاوہ وہ بڑے پیمانے پر دیگر مصنوعات کی درآمد اور برآمد کا کام بھی کرتا تھا اور آئے دن بڑی فیاضی سے رفاہی اداروں کے لئے بڑی بڑی رقوم کے چیک بھی کاٹتا تھا، جس کی تشہیر اخبارات کے ذریعے ہوتی رہتی تھی۔

کچھ لوگ اس کی شخصیت کے ایک پہلو کو پراسرار بھی سمجھتے تھے، اس لئے کہ وہ عام آدمیوں سے زیادہ میل جول رکھنے کا عادی نہیں تھا۔ اس کی نشست و برخاست یا تو رفاہی ادارے کے مالکان سے رہتی تھی یا پھر وہ ایسے بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں سے ملنا پسند کرتا تھا، جن کی پیشانی کا ایک بل بھی حکومت کے ستونوں کو لرزہ بہ اندام کر دینے کے لئے کافی ہوتا تھا۔

پہلی کوشی کے پڑوس میں آباد لوگوں کے ساتھ اس کا کوئی خاص میل جول نہیں تھا اس لئے کہ وہ صبح ہی گھر سے اپنی شاندار کار میں نکل جاتا تھا۔ رات گئے اس کی واپسی کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ اس کی گاڑی کے شیشے گہرے دھوئیں کے رنگ کے تھے، اس لئے باہر سے دیکھنے والوں کو اندر کی ہر شے بہت دھندلی نظر آتی تھی۔ کوئی شخص یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس گاڑی میں کون سفر کر رہا ہے۔ ان کے لئے مرد وزن کی تشخیص کرنا بھی دشوار ہی ہوتا تھا۔ اس ضمن میں کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ دشمنوں سے اپنی زندگی محفوظ رکھنے کے لئے ایسی گاڑیاں استعمال کرتا تھا، جس سے اندر بیٹھے ہوئے کسی فرد کی شناخت باہر سے ممکن نہ ہو۔ دوسری بات کچھ لوگوں کو کھٹکتی تھی، وہ یہ تھی کہ پیر اکرم شاہ کے پاس ایک وقت میں کئی گاڑیاں موجود رہتی تھیں لیکن ان سب کا رنگ، میک اور ماڈل ایک ہی ہوتا تھا۔

دن کے اوقات میں پہلی کوشی میں شاذ و نادر ہی کوئی ملنے جلنے والا آتا تھا۔ جب کہ رات کے اوقات میں لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ تادیر قائم رہتا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی گیٹ

ہے تو آپ شاید پہلی بار تشریف لائے ہیں۔“  
 نو جوان کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ اس کی پیشانی پر نمودار ہونے والی سلوٹیں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ اسے گاڑی کی مداخلت اچھی نہیں لگی تھی۔ اس نے جواب دینے کے بجائے جیب سے ایک کارڈ نکال کر گاڑی کے سامنے کر دیا جس کے بعد گاڑی انجن پوزیشن میں آ گیا۔ پھر اس نے اپنے ساتھی کو گیٹ کھول دینے کا اشارہ کر دیا تھا۔ گیٹ کھلتے ہی گاڑی حرکت میں آئی اور روش عبور کرتے ہوئے پور نیو میں رک گئی، جہاں سبز رنگ کی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ روش کے دونوں جانب کے لان سنسان ہی تھے لیکن وہاں لگے ہوئے پودوں کے پھولوں کی ملی جلی خوشبو فضا کو معطر کر رہی تھی۔ گاڑی رکتے ہی باوردی ڈرائیور تیزی سے نیچے آیا اور پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر باادب کھڑا ہو گیا۔ پہلے عورت باہر نکلی، پھر مرد۔

”میرے لئے کیا حکم ہے سر؟“ ڈرائیور نے مرد سے سوال کیا۔  
 ”تم جا سکتے ہو، لیکن گاڑی صبح چھ بجے واپس لانا۔ مجھے کچھ دیر آرام بھی کرنا ہے اور اس کے بعد وقت پر کلینک بھی پہنچنا ہے۔“

”اوکے سر!“ ڈرائیور نے ہاتھ اٹھا کر سیلوٹ کیا، پھر گاڑی میں بیٹھ کر تیزی سے چلی گئی سے باہر چلا گیا۔

”ونڈرفل اینڈ رومانٹک!“ عورت نے ایک لمبی سانس لے کر فضا میں بکھری ہوئی خوشبو کو اپنے وجود میں سیسٹے ہوئے کہا۔ ”بھرا کر م شاہ واقعی اعلیٰ شوق کا مالک معلوم ہوتا ہے۔“  
 ”ہم یہاں جس مقصد کے لئے آئے ہیں، اس کے بارے میں ایک بار پھر غور کر لو۔“  
 مرد نے سگریٹ روش پر پھینک کر جوتے تلے رگڑتے ہوئے کہا۔

”اگر غور نہ کیا ہوتا تو یہاں تمہارے ساتھ آنے پر کبھی آمادہ نہ ہوتی۔“ عورت جواب میں معنی خیز انداز میں مسکرائی، پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ”یہاں کوئی دوسری گاڑی نظر نہیں آ رہی ہے۔“

”بھرا کر م شاہ نہایت اعلیٰ ذوق رکھتا ہے، اس کی باتیں بھی اس کی شخصیت کی طرح نرالی ہیں۔“ مرد نے جواب دیا۔ ”اس نے کبھی کے نیچے ایک انڈر گراؤنڈ پارکنگ لاٹ بنا رکھی ہے، گاڑیاں صرف وہیں پارک کی جا سکتی ہیں، اس سلسلے میں اس کی ہدایتیں بہت سخت ہیں۔“

”کوئی خاص وجہ؟“

”ہم یہاں باتوں میں وقت برباد کرنے نہیں آئے ہیں بلکہ سکون اور چنچ (Change) کی خاطر آئے ہیں۔“

”اوکے۔“ عورت نے جلدی سے جواب دیا۔ ”تمہاری طرح میں بھی ایڈ ونچر اور چنچ کی عادی ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ابھی تک ہماری زندگی پرسکون گزر رہی ہے۔“

مرد نے اس کا ہاتھ تھام لیا، پھر سیڑھیاں ملے کرتا ہوا صدر دروازے تک چلا گیا، جو اس کی خاطر کھول دیا گیا تھا۔ دروازے پر کھڑے ہوئے باوردی انڈنٹ نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا، البتہ نہایت شکریے کے ساتھ سو روپے کا وہ نیا نوٹ ضرور قبول کر لیا تھا جو مرد نے اندر داخل ہوتے وقت جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھایا اور اس نوٹ کی کشش نے انڈنٹ کو جواب میں سیلوٹ جھاڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دونوں کے اندر داخل ہوتے ہی خود کار دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔

”واؤ!“ عورت نے دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد چاروں طرف پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اٹ ایز ریکلی اے ڈریم لینڈ۔“  
 مرد نے جواب میں مسکرا کر عورت کی طرف دیکھا، پھر بائیں ہاتھ والی راہداری کی طرف اشارہ کیا۔

”تمہیں اس طرف جانا ہے۔ راہداری سے بائیں ہاتھ مڑنے کے بعد تمہیں وہ سرخ بورڈ نظر آئے گا جس پر کمروں کے نمبر اور چابیاں موجود ہوں گی۔ تم جس کمرے کا چاہے انتخاب کر سکتی ہو۔ اٹ آل ڈپنڈز آن یور لک (Its all depends on your luck)“  
 ”اے دی بیسٹ اینڈ اے فٹاسٹک ٹائٹ۔“

”ٹو یو ایڈ ویل۔“ عورت نے مسکرا کر جواب دیا، پھر بائیں جانب والی راہداری کی سمت قدم اٹھانے لگی۔ اس کی نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد ہی اس کے ساتھی نے اوپر جانے والے زینوں کی طرف قدم بڑھایا جن پر دبیز سرخ کارپٹ موجود تھا۔ اندرونی ہال میں اس وقت کوئی تیسرا شخص دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔



میں ٹھیک سات بجے سورج ڈھلتے ہی سمندر کے کنارے پہنچ گیا تھا۔ زیادہ سردی ہونے کے سبب اس وقت ساحل پر وہ چہل پہل نظر نہیں آ رہی تھی، جو گرمیوں میں ہوا کرتی تھی۔ پھر بھی متعدد لوگ ادھر ادھر چھدرے چھدرے نظر آ رہے تھے، ان میں زیادہ تعداد بے فکرے نو جوانوں کی تھی۔ جب کہ خواتین کے ساتھ آئے ہوئے افراد اپنی گاڑیوں کے اندر ہی بیٹھے آپس میں گڈمڈ ہوتی موجوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

میں وہاں محض تفریحا نہیں گیا تھا، انسپکٹر جمال الدین نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ٹھیک ساڑھے سات بجے اس سے ساحل کے کنارے واقع ہوٹل ”سی دیو“ کے ٹاپ فلور پر ملوں جو چھت سے بے نیاز ہونے کی وجہ سے اس وقت سردی کی شدت کے سبب ویران ہی پڑا تھا۔

نوش لینے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔  
 ”اتنی سردی میں اور فالودہ آئس کریم؟“ جمال الدین نے بیرے کے جانے کے بعد حیرت کا اظہار کیا۔

”ٹاپ فلور پر آسمان کے نیچے بیٹھ کر وقت گزارنے کا یہی ایک نسخہ ہے۔“ میں نے قدرے خفگی کا اظہار کیا۔  
 ”تمہیں ایسا کوئی شک تو نہیں ہے کہ کسی نے تمہارا تعاقب کیا ہو؟“ جمال الدین نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”کیا مطلب.....؟“ میں نے اسے وضاحت طلب نظروں سے گھورا۔  
 ”دوسرے اسٹاف کو کم لیکن ہمارے سپرنٹنڈنٹ کو اس بات پر ہمیشہ تشویش لاحق رہتی ہے کہ ہمارا ہر کیس مشترکہ نام سے کیوں ہوتا ہے؟“  
 ”تم اسے کیا نام دو گے؟“

”ایک بڑے اور ذمے دار آفسر کی حماقت اور تنگ نظری۔“  
 ”اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو شاید تم نے اس وقت مجھے یہاں اسی کیس پر ڈسکس کرنے کو بلایا ہے، جس میں تمہیں اپنی جان جانے کا خطرہ بھی لاحق ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”ہماری زندگی کے نظریات ضرور مختلف ہیں۔ مجھے تمہاری بہت ساری ذاتی سرگرمیوں پر بھی اعتراض ہے لیکن اس کے باوجود میں تمہیں کم از کم کیس کے معاملات میں ایک اچھا اور قابل اعتماد دوست سمجھتا ہوں۔“ جمال الدین بولا۔ ”نام کے اعتبار سے بھی تمہارے فیصلے اکثر میرے لئے کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ میں نے اسی وجہ سے تمہیں سپرنٹنڈنٹ پر ترجیح دی ہے۔“

”اس کرم نوازی کا شکریہ۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے بائی دی وے، کیا تم جس خطرناک کیس پر کام کر رہے ہو ابھی تک اس کے بارے میں کلکٹر صاحب کو بھی مطلع نہیں کیا؟“  
 ”نی الحال نہ انہوں نے اصرار کیا ہے، نہ ہی میں قبل از وقت تمہارے علاوہ کسی اور سے اس معاملے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیس کی نوعیت کیا ہے؟“ میں نے آئس کریم کا چیمہ لیتے ہوئے پوچھا۔  
 ”ناجائز شراب اور دیگر منشیات۔“ جمال الدین نے تھوڑے وقفے سے کہا۔ ”مجھے اس بات کا بخوبی علم ہے کہ یہ کیس بظاہر آب کاری والوں سے متعلق ہے۔ لیکن میں کنٹریبنڈ گولڈ (Contraband Gold) کے حوالے سے اس پر ہاتھ ڈالوں گا۔ ویسے ممکن ہے کہ کچھ فارن کرنسی میں ہاتھ آجائے۔ قیمتی اور نایاب ہیرے بھی ہاتھ لگ سکتے ہیں۔“

میں نے ٹاپ فلور پر جانے کے لئے سیڑھیوں پر قدم رکھا تو ایک بیرا لپکتا ہوا میرے قریب آ کر بولا۔

”اوپر سردی کی وجہ سے کوئی نہیں ہے جناب! ہم جو آرڈر سرور کرتے ہیں وہ بھی اوپر جاتے جاتے سرد اور ٹھنڈا ہو جاتا ہے، اس لئے.....“  
 ”فکرم نہ کرو۔“ میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پیشتر ہی مسکرا کر کہا۔ ”میں سردی میں زیادہ تر فالودہ آئس کریم پسند کرتا ہوں۔ جس طرح گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے اسی طرح سردیوں میں بخ آئس کریم مجھے گرمی پہنچاتی ہے۔“  
 ”جی! بیرے نے مجھے حیرت سے گھورا۔

”تم فی الحال ایک اسٹیشل فالودہ آئس کریم لے آؤ۔ دوسرا گلاس بعد میں لانا۔“  
 ”کیا آپ کو کسی ”اور“ کا بھی انتظار ہے؟“ بیرے نے اور پر زور دیتے ہوئے کہا۔  
 ”ہاں۔ تمہارا خیال غلط بھی نہیں ہے۔“ میں نے اس کا مفہوم سمجھتے ہوئے جواب دیا تو وہ بڑی رازداری سے بولا۔

”آج کل ادھر پولیس کے سادہ لباس والے زیادہ منڈلاتے رہتے ہیں۔“ اس نے کھل کر اپنا مقصد بیان کرنے کی کوشش کی۔ ”خواتین شریف لوگوں کو تھانے چلنے کی دھمکی دے کر رقیں بٹرتے ہیں اور نکاح نامہ بھی طلب کرتے ہیں۔“

”تم پریشان مت ہو۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”میں ہر وقت اپنی جیب میں بھتے کی رقم اور نکاح نامہ دونوں ساتھ رکھتا ہوں اور بوقت ضرورت ان کے استعمال سے بھی بخوبی واقف ہوں۔“

”ایک مشورہ دوں جناب!“ وہ کچھ زیادہ ہی فری ہونے لگا۔ ”آپ نیچے فیملی روم میں بیٹھیں۔ وہاں بیٹھنے والوں پر زیادہ شک نہیں کیا جاتا ہے۔“  
 ”تم صرف اپنے کام سے کام رکھو۔ اگر پولیس والوں نے پریشان کیا تو بعد میں دیکھا جائے گا۔“

”آپ کی مرضی۔“ بیرے نے شانے اچکا کر جواب دیا، پھر کاؤنٹر کی طرف واپس لوٹ گیا۔

ٹھیک ساڑھے سات بجے انسپکٹر جمال الدین آگیا، اس نے حسب عادت اپنے چہرے میں معمولی سی تبدیلی کر لی تھی۔ اہم کیسوں کے سلسلے میں وہ ہمیشہ بدلنے میں بھی اپنی مثال آپ تھا۔ بہر حال میری میز کے قریب آ کر اس نے خود ہی اپنی شناخت کرا دی تھی، اس لئے مجھے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جمال الدین کے آنے کے پانچ منٹ بعد ہی بیرا فالودہ، آئس کریم اور دوسرا گلاس لایا تو کچھ جھل سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کی شرمندگی کا

”میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے، وہ غیر قانونی ہے۔“  
 ”کوئی ٹھوس ثبوت ہے تمہارے پاس؟“ میں نے جمال الدین کو گھورتے ہوئے دریافت کیا تو اس نے جیب سے ہلکے نیلے رنگ کا ایک کاغذ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔  
 میں نے کاغذ کی تہ کھول کر دیکھا تو اس میں ایک مختصر ٹائپ شدہ پیغام درج تھا۔  
 ”ذیروز جمال الدین! تم ایک فرض شناس اور دیانت دار آفیسر ہو، اس لئے مجھے تمہارے اوپر ترس آ رہا ہے۔ میرا مشورہ مانو تو آگ کے شعلوں میں ہاتھ ڈالنے کی حماقت سے باز آ جاؤ، ورنہ تمہارے وجود کا بھی کوئی نشان باقی نہیں بچے گا۔ تم نے کانفرنس کے دوران جو گفتگو اپنے افسران سے کی ہے، اس کی ایک ایک تفصیل ہمارے پاس پہنچ چکی ہے۔ بہتر ہے کہ اپنی زبان بند ہی رکھو۔ تمہارا ایک خیر خواہ۔“

”یہ پیغام تمہیں کس کے ذریعے ملا ہے؟“ میں نے کاغذ کو تہ کر کے دوبارہ جمال الدین کے حوالے کرتے ہوئے پوچھا۔

”آفس کے لیٹر بکس میں پڑا تھا اور تم جانتے ہو کہ اس لیٹر بکس کی کنجی صرف میرے پاس ہے اس لئے کہ میں دفتر ہی کے ایک کمرے میں رہتا ہوں۔“

”اس کا مطلب تو یہی ہے کہ ہمارے درمیان بھی کوئی کالی بھیڑ موجود ہے۔ لیکن کون ہو سکتا ہے؟“

”کوئی بھی ہو سکتا ہے۔“ جمال الدین نے پرچے کو جیب میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔“

”میرے ذہن میں تو صرف ایک ہی نام آ سکتا ہے۔ ہمارا سپرنٹنڈنٹ۔ دولت کے معاملے میں وہ بے حد لاپچی واقع ہوا ہے۔“

”نہیں۔ سپرنٹنڈنٹ دولت کا بھوکا ضرور ہے، لیکن اتنے بڑے آدمی سے ساز باز کی ہمت نہیں کر سکتا۔“

”پھر..... تمہارا شبہ کس پر ہے؟“ میں نے پہلو بدل کر پوچھا۔  
 ”کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے سپرنٹنڈنٹ ہی ہو، جو کسی درمیانی آدمی کے ذریعے

اکرم شاہ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔“  
 ”کوئی سپاہی یا نیچلے عملے کا کوئی فرد؟“

”مائی ڈیئر مسٹر فیصل!“ اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہاری عقل گھاس چرنے گئی ہوئی ہے؟ پیغام میں کانفرنس ہال میں ہونے والے ڈسکشن کا حوالہ موجود ہے، اس لئے وہ ہم میں ہی سے کوئی افسر ہو سکتا ہے۔“

”گویا ملک الموت تمہارے کہیں آس پاس ہی منڈلا رہا ہے اور تم اس کے باوجود اسے

”ایسے کیس آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں جان جانے کا خطرہ تمہیں کس وجہ سے ہو رہا ہے؟“

”جو پارٹی میری نظر میں ہے، اس کی وابستگی اونچے سیاسی حلقوں سے ہے۔ اس کے علاوہ وہ خطرناک لوگ ہیں۔ میری اپنی معلومات کے مطابق پہلے بھی دو ایک ایسے سرکاری اہلکاروں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا ہے، جو یقیناً کسی خاص شے کی بنا پر پارٹی کے پیچھے لگے تھے۔ پولیس نے اس سلسلے میں ایک دو مشتبہ افراد اور ہسٹری میگزین کو کارزن بھی کیا تھا، لیکن صرف ایک فون کال پر اس معاملے کو داخل دفتر کر کے سرد خانے میں ڈال دیا گیا۔“

”اس کے باوجود تم.....“  
 ”ہاں۔“ وہ تیزی سے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑی گھمبیر سنجیدگی سے بولا۔

”میں موجودہ کیس کو اسی پارٹی کی وجہ سے اپنے لئے ایک چیلنج سمجھ رہا ہوں۔ رہا زندگی اور موت کا مسئلہ تو تم جانتے ہو کہ میں.....“

”خالص ملنگ اور مجذوب واقع ہوئے ہو۔“ میں نے اس کا جملہ مکمل کیا۔ ”ویسے سر پھر ا کہنا شاید مناسب ہوگا۔“

”تم نے پیر اکرم شاہ کا نام ضرور سنا ہوگا۔“ وہ میری بات کو نظر انداز کرتا ہوا بولا۔  
 ”پیر اکرم شاہ.....“ میں حیرت سے چونکا۔ ”کیا تم اس کے خلاف کوئی اقدام کرنے

کی حماقت کر رہے ہو؟“  
 ”حماقت نہیں، فرض کی ادائیگی۔“

”میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تم شاید نہیں جانتے کہ برگلہ کے بوڑھے درخت کے مانند اس کی جڑیں کہاں کہاں پھیلی ہوئی ہیں۔ حکومت کے حساس اداروں کے اکابرین بھی اس کے ہاتھ چومنے کو اپنے لئے ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔“

”لیکن میں پیری مریدی کا سرے سے قائل ہی نہیں ہوں۔“ جمال الدین بے پروائی سے بولا۔

”تم اس کے خلاف کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟“

”یہی کہ ایک گندی مچھلی پورے تالاب کے پانی کو گندا کر دیتی ہے۔“ جمال الدین نے کہا۔ ”میڈیکل سائنس بھی اب اس اصول کی قائل ہو گئی ہے کہ اگر کسی خطرناک متعدی مرض کا کوئی سیریس مریض ہزاروں انسانی زندگیوں کے لئے خطرے کی علامت بن سکتا ہے تو اسے سلو پوائزننگ کے ذریعے موت کی ابدی نیند سلا دینا ہی بہتر ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔ ”کیا اکرم شاہ بھی منشیات کی ناجائز تجارت میں ملوث ہو سکتا ہے؟“



”ہے۔“  
 ”آئی سی۔“ میں سنجیدہ ہو گیا۔ ”گویا اس طرح ہم با آسانی اکرم شاہ کی شہ رگ تک پہنچ سکتے ہیں۔“

”خدا کا شکر ہے کہ ایک باریک بات تو تمہاری موٹی عقل میں سمائی۔“  
 ”لیکن کیا پیر اکرم شاہ بھی ڈاکٹر عادل کی طرح.....“

”اس سے کچھ زیادہ ہی ندیدہ ہے۔“ جمال الدین نے تیزی سے جواب دیا۔ ”ڈاکٹر عادل اور اکرم شاہ میں اسی مشترکہ شوق کی وجہ سے خاصی بے تکلفی ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے جمال الدین کے مشورے سے اتفاق کرنے کے بعد اسے چھیڑنے کی خاطر کہا۔ ”جو کالی بیڑ کا نفرنس روم کی باتیں دشمنوں تک پہنچاتی ہے، کیا وہ اس وقت بھی ہمارے تعاقب میں نہ ہوگی؟“

”ہو سکتا ہے، لیکن رسک تو بہر حال لینا پڑتا ہے۔“

اس کے بعد ضروری لائن آف ایکشن طے کرنے کے بعد ہم ہوٹل سے باہر نکل کر خاصی دیر تک اور دور تک ساحل پر چہل قدمی کرتے رہے، مقصد اس شے کی تصدیق کرنا بھی تھا کہ آیا کوئی سایہ ہمارے ساتھ تو نہیں لگا ہوا۔ لیکن ہمیں کسی ایسے شخص پر شبہ نہیں ہوا جو ہمارے خیال کے مطابق ہمارا تعاقب کر رہا ہو۔ چہل قدمی کے دوران ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، پھر تقریباً نو بجے ہماری واپسی ہوئی تھی۔

❖.....❖.....❖

مہ جبین اس وقت پیر اکرم شاہ کے خاص کمرے میں بیٹھی اس کے ساتھ مے نوشی کا شغل کر رہی تھی اکرم شاہ جو عام زندگی میں خود کو خاصا لئے دیئے رہنے کا عادی تھا، اس وقت کسی شیطان سے بدتر روپ میں نظر آ رہا تھا، اس کے شیطانی قہقہے پورے کمرے میں گونج رہے تھے۔

”کیا ہماری بے تکلفانہ باتوں کی آواز.....“

”اکرم شاہ کے حکم کے بغیر کوئی کبھی بھی اس کمرے کے قریب آنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔“ وہ ایک لمبا گھونٹ لیتے ہوئے مسکرایا۔ ”تمہاری اطلاع کے لئے یہ بھی بتا دوں کہ یہ کمرہ ساؤنڈ پروف ہے۔“

”یو آر ریٹلی گریٹ۔“ مہ جبین لہرا کر بولی۔ ”آئی فیل پراؤ ڈ آف می۔“

”ڈاکٹر عادل کو کب سے جانتی ہو؟“

”ابھی نئی نئی ملاقات ہے۔“

”اس کے باوجود تم اس کے اشارے پر یہاں تک آ گئیں۔“ اکرم شاہ نے ایک گلاس

دعوت نامہ بھیجنے کی حماقت کرنے سے باز نہیں آؤ گے۔“

”اسی وجہ سے میں نے ٹریک بدل دینے کا فیصلہ کیا ہے۔“ جمال الدین نے بڑے اعتماد سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب میں پس پردہ رہوں گا اور پیش منظر میں تم میرے لئے کام کرو گے۔“

”یعنی قربانی کا بکرا مجھے بنانا چاہتے ہو۔“

”مہ جبین سے تمہارے تعلقات آج کل کس قسم کے ہیں؟“ جمال الدین نے مسکرا کر پوچھا۔

”ابھی تک تو خاصے گہرے ہیں، لیکن کسی وقت ختم بھی ہو سکتے ہیں۔“ میں نے آنکھ مار کر جواب دیا۔ ”تم میرے عزیز دوست اور ساتھی ہو، اس لئے واقف ہو گے کہ بھنورے کی خصلت کیا ہوتی ہے۔ وہ پھول پھول اور کلیوں کلیوں منڈلاتا رہتا ہے۔ کسی ایک پھول پر قناعت کرنا اس کی فطرت کے خلاف ہوتا ہے۔“

”مہ جبین کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”وہ بڑے باپ کی آزاد ماحول میں پروردہ ایک خوب صورت اور حسین تلی ہے۔“ میں نے رازداری سے جواب دیا۔ ”ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی فطرت سے واقف ہیں اس لئے کبھی ایک دوسرے کے نجی معاملات پر باز پرس نہیں کرتے۔“

”گڈ!“ جمال الدین نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”گویا مہ جبین کے سلسلے میں میرا انتخاب غلط نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”کیا تم ڈاکٹر عادل سے واقف ہو؟“ جمال الدین نے میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”صرف اسی حد تک کہ وہ بھی خوب صورت عورتوں کے معاملے میں ایک نمبر کا ہر جانی واقع ہوا ہے۔ ڈاکٹر کی طرح اس کی بیوی بھی آزاد خیال ہے، اس لئے دونوں کے درمیان انڈر اسٹینڈنگ بھی خاصی گہری ہے۔“

”کوشش کرو کہ کسی طرح ڈاکٹر عادل مہ جبین کے حُسن کے جال میں پھنس جائے۔“

”کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ میں نے جمال الدین کو مصنوعی غصے سے گھورتے ہوئے احتجاجی لہجہ اختیار کیا۔

”ڈاکٹر عادل اور پیر اکرم شاہ ایک دوسرے کے لنگوٹیا یار ہیں۔“ جمال الدین نے اطراف پر ایک نظر ڈالتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تم اگر میری مدد کرو تو مہ جبین ڈاکٹر کے ذریعے پیر اکرم شاہ کے قریب پہنچ سکتی ہے اور اس طرح ہمارے لئے بہت کارآمد ہو سکتی

حلق میں اٹھ پینے کے بعد دوسرا بھرتے ہوئے کہا۔ اس کے لب و لہجے میں ہلکا سا شبہ بھی تھا۔  
 ”میں چھ سال تک امریکہ میں رہ کر تعلیم حاصل کر چکی ہوں۔“ مہجیں نے بے باکی سے کہا۔ ”وہاں ڈیٹنگ (Dating) کو نابالغ لڑکی کے والدین بھی قبول کر لیتے ہیں، میں تو پھر بھی بالغ ہوں۔“  
 ”گڈ۔ مجھے تمہاری یہ بات پسند آئی۔“

”میرے بارے میں کیا خیال ہے؟“ مہجیں نے ایک توبہ شکن انگڑائی لیتے ہوئے کہا تو پیر اکرم شاہ کی شیطانی آنکھوں کی سرخیاں کچھ اور گہری ہو گئیں۔ پھر اس نے بیڈ سوچ کی جانب ہاتھ بڑھایا تو کمر اگھپ اندھیرے میں نہا گیا، صرف نیلے رنگ کا ایک مدھم بلب گہرے شیڈ کی وٹ میں چھپا اپنی روشنی سے کمرے کی فضا کو خوبناک بنا رہا تھا۔  
 تقریباً ایک گھنٹے بعد خواب گاہ کے برقی قمقمے دوبارہ روشن ہوئے تو پیر اکرم شاہ نے اپنی سیٹ سے سوسو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر مہجیں کی طرف اچھالتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”یہ تمہاری نہیں۔ بلکہ تمہاری خاموشی کی قیمت ہے۔ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کمرے کی ہوا بھی باہر نکل سکے۔“

”اتنے نوٹ تو میں ایک وقت کی شاپنگ میں خرچ کر دیتی ہوں۔“ مہجیں نے قدرے ناراضگی کا اظہار کیا۔ ”اس کے علاوہ میں ایڈ وچر کی کوئی قیمت وصول کرنا بھی کسر شان سمجھتی ہوں۔“

”پھر تم میری طرف سے اس کو انعام سمجھ کر قبول کر لو۔“  
 ”انعام ملازموں کو دیئے جاتے ہیں، دوستوں کو نہیں۔“ مہجیں کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔  
 ”ڈاکٹر عادل نے بھی مجھے یہی بتایا تھا کہ تم صرف چھینچ کی خاطر ہو۔ پیر اکرم شاہ نے مہجیں کے جسمانی نشیب و فراز پر اپنی نگاہوں کا رُص جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”آئی لائیک بیج ٹاپ آف بیوٹی۔“

”جھینکس۔“ مہجیں نے شوخی سے جواب دیا۔ پھر اٹھ کر لہراتی ہوئی اٹیچڈ ہاتھ روم کی طرف چلی گئی۔

پیر اکرم شاہ اپنی جگہ بیٹھا چسکیاں لیتا رہا لیکن اس وقت اس کے چہرے کے تاثرات اس بات کی چغلی کھا رہے تھے کہ وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔ کچھ دیر بعد ماہ جیں تیار ہو کر ہاتھ روم سے باہر نکلی تو اکرم شاہ کے چہرے کے تاثرات ایک دم ہی تبدیل ہو گئے۔ ہاں میں نے مہجیں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ تمہیں دوست بنایا جاسکتا ہے۔“

”سر پرانزنگ۔“ وہ شانے اچکاتے ہوئے بولی۔ ”ڈاکٹر عادل نے تو بتایا تھا کہ آپ دوسری بار کسی کو اپنے قرب سے نوازنے کے عادی نہیں ہیں۔“  
 ”ڈاکٹر نے غلط نہیں کہا تھا لیکن تمہارے بارے میں مجھے اپنا اصول توڑنا پڑے گا۔“  
 ”کوئی خاص وجہ؟“ مہجیں نے بڑے دلبرانہ انداز میں اکرام شاہ کے قریب بیٹھتے ہوئے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”ہاں۔“ اکرم شاہ نے تھوڑے توقف کے بعد کہا۔ ”میں تبدیلیء آب و ہوا کے لئے دو چار دنوں کے لئے ملک سے باہر کسی پیر فضا مقام پر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تم میرے لئے ایک اچھی پارٹنر ثابت ہوگی۔“  
 ”ابھی یہ صرف یک طرفہ فیصلہ ہے۔“ مہجیں نے نخوتِ حُسن کا اظہار کیا۔ ”ضروری بھی نہیں ہے کہ میں آمادہ ہو جاؤں۔“

”کیا پرانے دوستوں سے دور رہنے کا خیال ستائے گا؟“  
 ”مجھے پرانے دوستوں کے بجائے نئے ساتھیوں کی تلاش کا زیادہ خیال رہتا ہے۔“ مہجیں نے بے باکی کا مظاہرہ کیا، پھر سنجیدگی سے بولی۔ ”کب تک چلنے کا ارادہ ہے؟“  
 ”جب تم آمادہ ہو جاؤ۔ لیکن میری دو شرطیں ہوں گی۔“

”وہ کیا؟“ مہجیں نے اپنی دراز پلکوں کو جھپکاتے ہوئے پوچھا۔  
 ”ہم ایک ساتھ نہیں، بلکہ الگ الگ سفر کریں گے۔“ اکرم شاہ نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”باہر ہمارا قیام بھی کسی فائو اسٹار ہوٹل کے علیحدہ علیحدہ سوٹ میں ہوگا اور.....“ وہ مہجیں کو شمار آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم وہاں میرے سوا کسی اور دوست یا ایڈ وچر کی تلاش نہیں کرو گی خود کو صرف میری ذات تک محدود رکھنے کی پابند ہوگی۔“  
 ”اور ان شرائط کو قبول کرنے کے عوض مجھے کیا معاوضہ ملے گا؟“ مہجیں نے بڑی راز داری سے سرسراتے لہجے میں دریافت کیا

”وہی جو ایک بارمل چکا ہے۔“ اکرم شاہ نے شیشے کی گول میز پر پڑی ہوئی روپوں کی گڈی کو ردی کاغذات کی طرح اٹھا کر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔



تین ہٹے کئے نقاب پوش اچانک ڈاکٹر عادل کے سر پر نازل ہوئے تو وہ بری طرح بوکھلا گیا۔

”تت.....تت.....تم۔“ اس کی زبان خوف سے کانپ رہی تھی۔ وہ اس وقت اپنے کلیک کے کنسلٹنگ روم میں بیٹھا تھا۔ جب وہ تینوں اس پر آؤٹ ناگہانی بن کر ٹوٹ پڑے تھے۔ صدر دروازے اور ڈاکٹر عادل کی میز کے درمیان ایک کرشن اسٹینڈ موجود تھا ڈاکٹر کو

جانتے ہیں کہ برے کاموں میں تم بھی اس کے جوڑی دار ہو، اگر تم نے سچ نہیں بولا تو پھر ہمیں مجبوراً تمہیں بھی خون میں نہلانا پڑے گا۔“

”نن..... نہیں..... نہیں..... میں تم کو سب کچھ ٹھیک بتا دوں گا۔“ ڈاکٹر نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

”وہ تخم خنزیر دوسری عورتوں پر بری نظر رکھتا ہے یا نہیں۔“ پہلے نے ریوالور کا رخ ڈاکٹر کی کھوپڑی کی طرف کیا تو موت کا تصور ڈاکٹر کی آنکھوں سے چھلک اٹھا۔

”ہاں..... وہ..... اسی طبیعت کا آدمی ہے۔“ اس نے خود کو بچانے کی خاطر سچ اُگلنے کو ترجیح دی۔

”اور تم..... کیا تم بھی اس ولد الحرام کے ساتھ اپنی عورتوں کی ادلی بدلی نہیں کرتا؟“ دوسرے نے خونخوار انداز اختیار کیا۔

”سب..... کبھی کبھی۔“ ڈاکٹر نے مُردہ سی آواز میں ہامی بھر لی۔

”پیلی کٹھی کے اندر اور کیا دھندا ہوتا ہے؟“ پہلے نے غرا کر دریافت کیا۔

”وہ..... وہ..... سکی کلب (Key Club) کے طور پر استعمال ہوتا ہے لیکن صرف وہاں ممبر ہی جاسکتے ہیں، عام آدمی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

”اور ان بے غیرتوں میں سے ایک ممبر تو بھی ہے۔“ دوسرے نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے اپنی انگلی شہادت کو بلبلی پر رکھا تو ڈاکٹر لرز گیا۔

”میرے علاوہ اور بھی کئی لوگ ہیں۔ لال..... لیکن ممبران اسے معیوب نہیں سمجھتے۔“

”خو کمین انخصلت۔ تم کو شرم نہیں آتی۔“ تیسرا بولا۔ ”پیدا مقدس زمین پر ہوا اور بات اُدھر کی کرتا جدر آنکھوں کا شرم و حیا سب کچھ مٹ چکا ہے۔ اوئے بے غیرت۔ تمہارے خون میں گندے خون کی ملاوٹ کیسے ہوگئی؟“

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بدستور سہمی سہمی نظروں سے ان تینوں کو دیکھ رہا تھا۔

”ہمیں اس کے ساتھ اپنے مطلب کی بات کرنی چاہئے۔“ دوسرے نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا، پھر ڈاکٹر سے بولا۔ ”تمہارے کچھ دوست نے ہمارے قبیلے کی ایک لڑکی کی زندگی برباد کی ہے۔ وہ غیرت مند زہر کھا کر مر گئی، لیکن تمہارے دوست اکرم شاہ کو اس کا تاوان بھرنا پڑے گا۔“

”اور وہ تاوان تم اس سے وصول کر کے ہمارے حوالے کرے گا۔ کیا سمجھا؟“ پہلے نے ہونٹ کاٹتے ہوئے گڑے ہوئے تیور سے کہا۔

”تمہیں کتنی رقم درکار ہوگی؟“

”اوئے..... اوئے.....“ تیسرے کا پارا چڑھنے لگا۔ ”تم امارا ساتھ اتنا گاڑھا زبان

بدحواسی کے باوجود اس بات کا یقین تھا کہ ان تینوں نے اندر داخل ہونے کے بعد کرشن اسٹینڈ کی آڑ میں اپنے چہرے نقاب میں چھپائے ہوں گے۔“ وہ پھٹی پھٹی خوف زدہ نظروں سے ان تینوں کو دیکھ رہا تھا، جن کے ہاتھوں میں موجود ریوالور پر سالنسر بھی لگے ہوئے تھے۔ وہ اگر چاہتا تو پاؤں کی ایک ہلکی سی جنبش سے خطرے کا الارم بجھا کر اپنے اسٹاف کو اندر طلب کر سکتا تھا۔ لیکن اسے اس بات کا یقین بھی تھا کہ اگر اس نے ایک معمولی سی حرکت بھی کی تو اس کی کھوپڑی ”ٹچ“ کی ایک مدھم آواز کے ساتھ ہمیشہ کے لئے تاریک ہو جائے گی۔ چنانچہ اس نے بوکھا ہٹ کے باوجود خود کو قابو میں رکھا تھا۔

”ہمارے سلسلے میں پریشان مت ہو، ڈاکٹر!“ ایک نقاب پوش نے کھر درے لہجے میں کہا۔ ”اگر تم نے حماقت کا کوئی ثبوت نہیں دیا تو ہم تمہیں جان سے نہیں ماریں گے۔“

”میرے پاس اس وقت زیادہ رقم نہیں ہے۔“ ڈاکٹر نے تیزی سے کہا۔ ”زیادہ تر رقم کیشز کے پاس رہتی ہے اس لئے اگر تم مجھ پر یقین کرو تو.....“

”تم نے غلط اندازہ لگایا۔“ دوسرے نقاب پوش نے سفاک انداز میں کہا۔ ”ہمیں براہ راست تمہاری ذات سے نہ کوئی دشمنی ہے، نہ ہی ہمیں کسی دولت کی ضرورت ہے۔ ہم آزاد قبائلی لوگ ہیں جو کسی دشمن یا دغا فریب کرنے والے سے جب تک انتقام نہ لے لیں، پیٹ بھر کر دانہ پانی اپنے اوپر حرام سمجھتے ہیں۔ چھانسی کے پھندے کا تصور بھی آج تک کبھی ہمارے راستے کی دیوار نہیں بنا۔“

”تمہارے ساتھ بھلا میری کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟“ ڈاکٹر تھوک نکل کر بولا۔ ”کیا تمہارا کوئی مریض؟“

”نہیں۔ خو، ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔“ تیسرے فرد نے ٹھٹھ پٹھانی لہجے میں کہا۔

”اب تم سے ایک اور بات کے بارے میں معلوم کرنے آیا ہے، تم اس کو اچھی طرح جانتی ہے۔“

”کون ہے وہ؟“

”تمہارا یا رعار۔ تمہارا دل برجانی۔ وہ حرام کا تخم، پیر اکرم شاہ۔ آخ تھو۔“ تیسرے شخص نے فحارت سے کہا۔ ”اس نے خو امارا عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ ام اس کو چھوڑے گا نہیں ہمیں بتاؤ کہ ڈاڑھی کی آڑ میں وہ کیا دھندا کرتا ہے۔ ام اپنی بے عزتی کا بدلہ اس کے خون سے لے گا۔“

”ہاں، ہاں..... میں اس کو بہت نزدیک سے جانتا ہوں لیکن.....“ ڈاکٹر نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ ”اس نے تمہارے ساتھ کیا زیادتی کی ہے؟“

”اس نے ہمارے قبیلے کی ایک لڑکی کو بے آبرو کیا۔“ دوسرا سرد لہجے میں بولا۔ ”ہم یہ بھی

بولتی۔ خوش رکھو! کیا تم امارے ساتھ سودے بازی کرے گی؟“

”پچاس لاکھ۔“ دوسرے نے سفاک انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”اس میں کسی کی بیشی کی گنجائش نہیں ہوگی۔“

”ٹھٹ..... ٹھیک ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں پیر اکرم شاہ سے تمہارا راضی نامہ کرانے کی کوشش کروں گا۔“

”ام کو تمہارا یا تمہارا دوست کا راضی نامہ نہیں، روکڑا چاہئے۔ پورے پچاس لاکھ۔ کل شام تک۔ کیا سمجھا؟“

”رقم کی وصولی یا بی کہاں ہوگی؟“ ڈاکٹر نے اس بار جال پھینکنے کی کوشش کی، پھر تیزی سے بولا۔ ”میرا کلینک رات نو بجے تک کھلا رہتا ہے، تم میں سے کوئی بھی آکر مطلوبہ رقم مجھ سے لے سکتا ہے۔“

”تم رقم کل شام تک تیار رکھنا۔ ہم اسے کس طرح وصول کریں گے، یہ سوچنا ہمارا کام ہے۔“ پہلے نے ڈاکٹر کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ پچاس لاکھ تم نہیں، پیر اکرم شاہ دے گا، ورنہ.....“

”مجھے منظور ہے۔ اکرم شاہ میری بات نہیں ٹالے گا۔“ ڈاکٹر نے جلدی سے کہا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”تم نے اس لڑکی کا نام نہیں بتایا، جسے اکرم شاہ نے.....“

”خو اپنا گندی زبان بند کرو، نئی تو ام تمہارا کھوپڑی اڑا دے گا۔“ تیسرا بولا۔ ”پیر اکرم شاہ کا بول دینا کہ وہ قبائل لوگوں کا خون تھی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں بول دوں گا۔“ ڈاکٹر نے جان بچانے کی خاطر ہتھیار ڈال دیئے۔

”کیا تم اس کے دوسرے کاروبار میں بھی بھاگی دار (حصہ دار) ہو۔“ دوسرے نے دبی زبان میں سوال کیا۔

”یہ دوسرا کاروبار.....“

”شراب، حشیش اور دوسرا نشہ آور چیزوں کا کاروبار۔“

”نہیں۔ میں صرف کی کلب کا ممبر ہوں، ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے اکرم شاہ میرا دوست بن گیا، ورنہ وہ کسی اور کو اپنے قریب بھی نہیں پھکنے دیتا۔“

”سمجھ گیا۔“ پہلے نے کہا۔ ”تم اس کو انجکشن کے ذریعے جوان بنا دیتا ہے۔“

”لیکن تم جانتے ہو کہ پیر اکرم شاہ کا لے دھندے بھی کرتا ہے۔“ دوسرے نے سرد آواز میں کہا۔ ”کیوں، کیا تم اس بات سے انکار کرو گے؟“

”نہیں۔ لیکن میں کسی ایسے گندے کام میں ملوث نہیں ہوں۔“ ڈاکٹر نے اپنی صفائی پیش کی۔

”اور کی کلب میں ہونے والی بے غیرتی کو تم کیا کہو گے؟“ پہلے نے نفرت سے کہا۔

ڈاکٹر اپنی کرسی پر کسمسا کر رہ گیا، وہ کروڑ پتی ہونے کے باوجود اس وقت خود کو اس کھسی کی طرح محسوس کر رہا تھا، جو اچانک کڑی کے جالے میں پوری طرح پھنس چکی ہو اور فرار کا کوئی راستہ نہ ہو۔

”ختم اب تک کتنا عورت لوگوں کو اس بے غیرت شاہ کو بطور تحفہ پیش کر چکا ہے؟“ تیسرا کرخت لہجے میں بولا۔

”سات یا شاید آٹھ۔“ ڈاکٹر نے پھر تھوک نکل کر کہا۔ ”اس کے علاوہ جو کچھ ہوتا ہے، وہ اپنی قسمت کی بات ہوتی ہے۔“

”کی کلب کا اصول کیا ہے؟“ پہلے نے سرد لہجے میں دریافت کیا۔

”سب سے پہلے وہاں کا ممبر بننے کے لئے کسی پرانے ممبر کی سفارش حاصل کرنی پڑتی ہے۔ اس کے بعد نئے ممبر کو ایک عارضی کارڈ جاری کر دیا جاتا ہے، جسے تین ماہ بعد مستقل کر دیا جاتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہوتی ہے کہ نیا ممبر کلب میں ہفتے میں کم از کم تین بار حاضری دے۔ ہر بار اس کے ساتھ ایک عورت یا لڑکی کا ہونا ضروری ہے۔“

ڈاکٹر نے ایک لمحہ خاموشی کے بعد دوبارہ کہنا شروع کیا۔

”وہاں۔ میرا مطلب ہے کہ پہلی کوشش میں داخل ہونے کے بعد عورت اور مرد کو علیحدہ علیحدہ ہونا پڑتا ہے۔ وہ مخصوص بورڈ پر جا کر کوئی بھی ایک چابی لے لیتی ہے اور اسی نمبر کے کمرے میں چلی جاتی ہے، جہاں کوئی شخص پہلے سے موجود ہوتا ہے یا پھر کچھ دیر بعد آ جاتا ہے اور اس کے بعد.....“

”تم خوشیطان کی طرح بے غیرت ہو جاتا ہے۔ آخ تھو!“ تیسرے نے پھر خفارت سے اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر کے منہ پر تھوک دیا۔

اس کے بعد پہلے شخص کے ریوالور سے ”چچ“ کی مدھم آواز بلند ہوئی اور ڈاکٹر اپنی میز پر جھول گیا۔ ریوالور سے ایک ایسی زور اثر سوئی نکل کر برق رفتاری سے ڈاکٹر کے جسم میں داخل ہوئی تھی، جس نے پلک جھپکنے میں اسے بے ہوش کی کیفیت سے دوچار کر دیا۔ تینوں نقاب پوشوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر چہرے کے نقاب اتار کر جیب میں رکھے ریوالور کو شلوار کے نیچے میں اڑسا اور پھر دو آدمی تیسرے کو دونوں طرف سے پکڑ کر سہارا دیتے ہوئے اس طرح باہر نکلے جیسے تیسرا شخص چلنے پھرنے سے بالکل ہی معذور ہو۔ اس کے چہرے پر شدید کرب کے تاثرات نظر آرہے تھے۔ باہر نکلتے ہی انہوں نے وہاں پہلے سے کھڑی فلیسی کو دوبارہ استعمال کیا اور ہسپتال کی حد سے دور ہوتے چلے گئے۔ دوبارہ ہوش آنے پر ڈاکٹر نے اپنی بے ہوشی کو محض اتفاقیہ قرار دیا تھا۔ وہ اس معاملے کو پولیس تک نہیں لے جانا

چاہتا تھا۔



”مسٹر فیصل!“ سپرنٹنڈنٹ نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ آپ کے گولڈ کیمر کا گراف روز بروز بہتر ہوتا جا رہا ہے، میں نے آپ کی کانفیڈنشل رپورٹ میں آپ کی فوری ترقی ترجیحی بنیادوں پر کرنے کی سفارش کی ہے۔“

”تھینک یو دیری مچ سر!“ میں نے بظاہر خوشی کا اظہار کیا لیکن میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں میری بلی خالی از علت نہیں ہوگی۔ میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا۔“

”مسٹر فیصل!“ سپرنٹنڈنٹ نے کچھ دیر تک میری تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے کے بعد دبی زبان میں کہا۔ ”حیرت اس بات کی ہے کہ انسپکٹر جمال الدین اور آپ کے بہت گہرے تعلقات ہیں لیکن اس کے باوجود گزشتہ تین ہفتوں میں موصوف نے کوئی کیس نہیں پکڑا۔“

”سر! میرا خیال ہے کہ وہ اسی کیس کے پیچھے پڑ کر رہ گیا ہے، جس کا ذکر اس نے کلکٹر کانفرنس میں کیا تھا۔“

”اس کیس کی نوعیت کیا ہے؟“ اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

”میں نے کئی بار اسے کریدنے کی کوشش کی ہے مگر اس نے ہر بائیک ہی جواب دیا۔“ میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”اس کا کہنا ہے کہ جس دن اس کی زبان پر اس کیس میں ملوث مجرموں کا نام آگیا، وہ اس کی زندگی کا آخری دن ثابت ہوگا۔“

”ایسا مجرم کون ہو سکتا ہے؟“

”اسی ایک سوال نے مجھے بھی الجھا دیا ہے۔“ میں بدستور سنجیدہ تھا۔

”حیرت ہے کہ مسٹر جمال نے آپ پر بھی بھروسہ نہیں کیا، جب کہ اکثر بڑے کیمرز آپ کی اور انسپکٹر جمال کی مشترکہ مشقوں ہی کا نتیجہ ثابت ہوئے ہیں۔“

”مجھے بھی اسی بات کا شکوہ ہے جناب! لیکن آپ جانتے ہیں کہ وہ جس بات پر اڑ جاتا ہے، اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔“

”کیا اس نے آپ کو کوئی اشارہ بھی نہیں دیا؟“ سپرنٹنڈنٹ نے میرے چہرے پر نظر جما کر دریافت کیا۔

”جی نہیں۔ مگر میرا اندازہ ہے کہ وہ کسی ایسے کیس پر کام کر رہا ہے جس کے مجرم اس کی زندگی کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں۔“

”جان بوجھ کر آگ میں ہاتھ ڈالنا دانش مندی نہیں ہے۔“ سپرنٹنڈنٹ نے کہا، پھر معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”اس قسم کے خطرناک کیمرز کو داخل دفتر کرنے کے اور بھی بہت سارے

منفعت بخش ذرائع ہوتے ہیں۔ اور پھر پارٹی کو سونے کا انڈا دینے والی مرغی کے طور پر بھی بوقت ضرورت کیش کیا جاسکتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

”میں آپ سے سو فیصد متفق ہوں سر!“ میں نے دل پر جبر کر کے رازدارانہ انداز میں جواب دیا۔ ”خالی ایمانداری سے اگر کام کیا جائے تو پھر پہلی تاریخ کو جب جھاڑنے کے بعد ہی گھر تک پہنچا جاسکتا ہے۔“

”آپ انسپکٹر جمال کے جگری دوست ہیں، اسے سمجھانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟“

”آپ خود بھی واقف ہیں سر! کہ جمال کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ اس لئے اس کے سر پر ہر وقت ایمانداری کا بھوت سوار رہتا ہے۔ شاید اس کی یہی ادا کلکٹر صاحب کو بھی بھاگتی ہے، ورنہ جمال کی جگہ کوئی دوسرا تین ہفتے تک صفر کارکردگی کا مظاہرہ کرتا تو اب تک اس کا تبادلہ بطور پشیمٹ کسی دور دراز علاقے میں ہو چکا تھا۔“

”حیرت تو یہی ہے کہ کلکٹر صاحب بھی اس کے بارے میں کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتے۔“ سپرنٹنڈنٹ نے سنجیدگی سے خود کلامی کے انداز میں کہا، پھر موضوع بدل کر بولے۔ ”اور سنائیے۔ آج کل آپ کس کیس پر کام کر رہے ہیں؟“

”گولڈ کے ساتھ انڈین کرنسی پر بھی توجہ دے رہا ہوں، جس کی کھپت بیرونی منڈیوں میں آئے دن بڑھتی جا رہی ہے۔“

”گڈ! میں بھی آپ کو یہی مشورہ دینے والا تھا کہ اب انڈین کرنسی کے بھی دو ایک بڑے کیمرز ضرور ہونے چاہئیں تاکہ ہماری برانچ کی اہمیت اور نمایاں ہو سکے۔“

”میں فی الحال اس طرف زیادہ زور دے رہا ہوں۔“

”کل غفار بھائی نے مجھے گھر پر فون کیا تھا۔“ سپرنٹنڈنٹ نے کچھ دیر بعد دبی زبان میں کہا۔ ”آپ شاید اب تک اس کے تین چار کنسائمنٹ پڑ چکے ہیں۔“

”جی ہاں۔ لیکن میرے ذرائع کے مطابق وہ ابھی تک اسی میدان میں ڈٹا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے، میں ایک بار پھر اس پر ہاتھ ڈال دوں۔“

”میرا مشورہ ہے کہ آپ اسے ایک دو ماہ کے لئے نظر انداز کر دیں۔ میں نے اس سے بات کر لی ہے۔“

”اگر آپ کا حکم ہے تو پھر ٹھیک ہے۔“ میں نے اپنی مرضی کے خلاف ہامی بھر لی۔

”سیٹھ غفار کا خیال ہے کہ اسی کا کوئی خاص کارندہ آپ کو خبری کرتا ہے۔“

”سوری.....“ اس بار میں نے تیزی سے کہا۔ ”کسی خبر کے نام کا اظہار کرنا ہمارے اصول کی خلاف ورزی ہے اور میں اس اصول کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔“

”کرنا بھی نہیں چاہئے۔ ورنہ خبر کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔“ سپرنٹنڈنٹ نے

بڑی ہوشیاری سے پینتر ابد لہتے ہوئے کہا، پھر دراز میں سے ایک براؤن لفافہ نکال کر میری جانب کھسکاتے ہوئے رازداری سے بولا۔ ”یہ غفار بھائی کی طرف سے فی الحال ایک حقیر سا نذرانہ ہے۔“

”شکر یہ سر!“ میں نے دیدہ و دانستہ معنی خیز انداز میں کہا۔ ”میں نے کبھی پارسائی کا دعویٰ نہیں کیا لیکن میرا ایک اصول اور بھی ہے جو آپ کو بھی بخوبی معلوم ہے۔ میں خود اپنا شکار کر کے پیٹ بھرنے کا عادی ہوں۔ اس کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔“

”آپ بھی مسٹر جمال کی طرح کچھ کم اصول پسند نہیں ہیں۔“ سپرنٹنڈنٹ نے بے تکلفی کا اظہار کیا، پھر لفافہ دوبارہ دراز میں رکھتے ہوئے بولا۔ ”بہر حال مجھے خوشی ہے کہ آپ کم از کم مجھ سے کوآپریشن تو کرتے ہیں۔“

”دریا میں رہ کر مگر کچھ سے بیر لینا اچھا نہیں ہوتا۔“ میں نے لطیف سا طنز کیا، لیکن سپرنٹنڈنٹ اسے میری وفاداری سمجھ کر مسکرا دیا۔

”آپ ذہن اور سمجھ دار افسر ہیں۔ لیکن پہلے تو آپ بھی انسپکٹر جمال کی طرح.....“

”وہ میری نا سمجھی تھی سر!“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”کبھی وقت ملے تو مسٹر جمال کو بھی سمجھانے کی کوشش کیجئے گا کہ وہ بھی میرے ساتھ تعاون کریں۔ اس لئے کہ جو کلکٹر آج ہیں وہ کل نہیں رہیں گے۔ اچھا اور ماہر پیراک وہی ہوتا ہے، جو سمندر میں چھلانگ لگانے سے پہلے مدوجزر کا خاص خیال رکھتا ہے۔ آپ شاید میرا مطلب سمجھ رہے ہیں۔“

”میں اسے سمجھانے کی کوشش ضرور کروں گا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ آسانی سے راہ راست پر نہیں آئے گا۔“

”کوئی بات نہیں۔ وقت کی رفتار انسان کی سمجھ میں اسی وقت آتی ہے، جب وہ نظریں اٹھا کر چلتا اور ٹھوکر کھاتا ہے۔ ویسے بھی دن اور رات میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ وقت ہمیشہ یکساں نہیں رہتا، تبدیل ہوتا رہتا ہے۔“

مجھے سپرنٹنڈنٹ کے وہ ریمارکس خاصے برے لگے تھے، اس کی بات میں کھلی ہوئی دھمکی شامل تھی۔ لیکن بہتر ہی ہوا تھا کہ اسی وقت کسی واقف کار کی کال آگئی۔ سپرنٹنڈنٹ نے مجھے اشارے سے کچھ دیر بعد آنے کو کہا۔ جواب میں، میں ہونٹ چباتا ہوا اٹھا اور تیزی سے باہر آ گیا۔ میری رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی گردش خاصی تیز ہو رہی تھی، اس لئے میں نے ریکریشن ہال کی طرف جانے کے بجائے، جہاں دفتر کے دوسرے افسران موجود تھے، دفتر سے باہر جانے والی راہ اختیار کی۔ میرے ذہن میں اس وقت چوہنیاں رینگ رہی تھیں۔ پھر میرے تصور میں اس دھمکی آمیز خط کی تحریر روشن ہونے لگی، جو انسپکٹر جمال نے مجھے تین روز

پہلے دکھایا تھا، جس سے صاف ظاہر تھا کہ ہمارے درمیان کوئی کالی بھیڑ بھی ضرور موجود تھی جو بند کمرے میں ہونے والی کلکٹر کانفرنس سے واقف ہوتی تھی۔

”کہیں وہ کالی بھیڑ ہمارا سپرنٹنڈنٹ تو نہیں ہے؟“ میرے ذہن میں یہ سوال تیزی سے اُبھرا۔



اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ کا عمل تھا، ڈاکٹر عادل اپنی خواب گاہ میں ٹہل رہا تھا۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، اس کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے نقاب پوشوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پیر اکرم شاہ سے ان کے مطالبے کی بات کر کے کسی نہ کسی طرح پچاس لاکھ کا بندوبست ضرور کر لے گا۔ لیکن اس نے اس ضمن میں اکرم شاہ سے کوئی گفتگو نہیں کی تھی، تاوان کی رقم کا بندوبست اس نے اپنی جیب خاص سے کیا تھا۔ وہ چاہتا تو پولیس سے بھی مدد طلب کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اکرم شاہ کی شخصیت کے ہر پہلو سے بخوبی واقف تھا۔ اسے علم تھا کہ وہ آسانی سے کبھی تاوان کی رقم کبھی نہ دے گا اور ایسی صورت میں جب کہ ڈاکٹر عادل کو اس لڑکی کے نام کا بھی کوئی علم نہیں تھا، جسے بقول نقاب پوشوں کے پیر اکرم شاہ نے برباد کیا تھا، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پیر اکرم شاہ اپنے سائے سے بھی محتاط رہنے کا عادی ہے اور کسی ایسی لڑکی پر ہاتھ ڈالنے کے اصول کے سخت مخالف تھا، جو کلکب کی باقاعدہ ممبر نہ ہو یا کسی ممبر کے ساتھ اس کی خواب گاہ تک نہ پہنچی ہو۔

بہر حال، ڈاکٹر عادل نے بہت غور و خوض کے بعد یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی زندگی بچانے کی خاطر پچاس لاکھ کا دھچکا خود ہی برداشت کر لے۔ مطلوبہ رقم اس وقت بھی ایک بریف کیس میں اس کی مسہری کی سائیڈ ٹیبل پر موجود تھی لیکن ابھی تک کوئی اسے وصول کرنے نہیں آیا تھا۔ شام کو اس کی خوب صورت اور ماڈرن تہذیب کی دلدادہ بیوی نے اس سے پہلی کوشمی چلنے کی فرمائش کی تھی لیکن وہ اسے بڑی خوب صورتی سے ٹال گیا تھا، البتہ اس نے بڑی فراخ دلی سے اپنی بیوی کو تنہا جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اسے خوف تھا کہ جو لوگ اس کے کلینک میں گھس کر اسے بے ہوشی سے ہمکنار کر سکتے ہیں، وہ اپنی دھمکی کو بھی عملی جامہ پہنانے سے گریز نہیں کریں گے۔

ٹھیک پونے بارہ بجے دروازے پر دستک ہوئی تو ڈاکٹر عادل کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا، اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے دروازہ کھولا تو وہ جہیں اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

”تم.....“ ڈاکٹر نے وقتی طور پر خود کو کچھ ہلکا محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے معلوم تھا کہ تم اس وقت گھر پر تنہا ہی ملو گے۔“ وہ بڑی بے تکلفی سے خواب گاہ کے

اندر داخل ہوئی، پھر دروازے کو اندر سے بولٹ کرتے ہوئے بولی۔ ”کچھ دیر پہلے میں نے تمہاری حسین و جمیل بیوی کو پہلی کوشی میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ میرا ارادہ بھی وہیں جانے کا تھا، مگر میں نے صرف اور صرف تمہاری خاطر اپنا پروگرام تبدیل کر دیا۔“

”اچھا ہوا جو تم اس وقت آ گئیں۔“

”کیا بات ہے مائی ڈیئر؟ تم اس وقت کچھ الجھے الجھے سے نظر آ رہے ہو؟“

”کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا، پھر اس کی غزالی اور مخمور آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔ ”تمہارا پروگرام جلدی واپسی کا تو نہیں ہے؟“

”تم اگر پسند نہ کرو تو میں واپس بھی جاسکتی ہوں۔“ مہ جبین نے اس کے نرم و گداز بستر پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ”بلا وجہ میں تمہارے لئے بوجھ بھی نہیں بننا چاہتی۔“

”غلط خیال ہے تمہارا۔“

”پھر صحیح خیال کیا ہے؟“ وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ”کیا کسی اور تلی کا انتظار ہے؟“

”نہیں۔“ ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔ ”میں گھر پر حافقیں کرنے کے اصول کے خلاف ہوں۔“

”بدنامی سے ڈرتے ہو۔ کیوں؟“

”ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے، البتہ احتیاط کرنا بہر حال ضروری ہے۔“

”پھر اب کیا پروگرام ہے؟“ مہ جبین نے اسے قاتل نظروں سے دیکھا۔

”تم آرام سے بیٹھو، میں ذرا چینج کر کے آتا ہوں۔“ ڈاکٹر نے اس کے سراپا کو لپٹائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا، پھر واش روم کی طرف مڑ گیا، جس کا ایک پورشن ڈریسنگ کے کام بھی آتا تھا۔

دس منٹ بعد ڈاکٹر چینج کر کے خواب گاہ میں واپس آیا تو ایک لحو کو ٹھٹک کر رک گیا۔ مہ جبین ایک ایسے جرمین ساخت کے پستول کو ہاتھ میں لئے بیٹھی تھی، جس پر سائنسر بھی فٹ تھا۔

”تم تو خود قاتل ہو۔ پھر اس پستول کی کیا ضرورت ہے؟“ ڈاکٹر نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔

”آج ہی خریدا ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”ابھی تک اس کا استعمال بھی نہیں کیا۔“

”ایسے خطرات کھلوانے تمہارے نازک نازک ہاتھوں کو زیب نہیں دیتے۔“ ڈاکٹر نے قدم آگے بڑھانے کی کوشش کی تو مہ جبین یک لخت اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”خبردار ڈاکٹر! میرے قریب آنے کی کوشش مت کرنا۔“ وہ ناگن کے انداز میں زہریلی نظر آ رہی تھی۔

”کیا مطلب؟“

”پچاس لاکھ کی رقم خاصی چارمنگ اور انٹرینٹنگ ہوتی ہے۔“ وہ سرد لہجے میں بولی۔ ”میرے حصے میں صرف ساڑھے بارہ لاکھ آئیں گے۔ لیکن یہ بھی ان لحوں کی خاصی معقول قیمت ہے، جو میں نے تمہارے اور تمہاری ایما پر پیرا کریم شاہ کے ساتھ گزارے ہیں۔ کیا تم کو مزید کوئی وضاحت درکار ہے؟“

”آئی سی۔“ ڈاکٹر ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔ ”گویا وہ تینوں نقاب پوش تمہارے ہی ساتھ تھے۔“

”یہی سمجھ لو۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔ پھر پستول کا رخ ڈاکٹر کی چوڑی چھاتی کی سمت کر کے پوچھا۔ ”رقم کہاں ہے؟“

”اس بریف کیس میں۔“ ڈاکٹر نے بریف کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مُردہ سی آواز میں کہا۔

”تم اگر چاہو تو اب اپنی کوئی آخری خواہش بھی بیان کر سکتے ہو۔“ وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ ”اگر میرے اختیار میں ہو تو ضرور پورا کرنے کی کوشش کروں گی۔“

”کیا؟“ ڈاکٹر کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”مجبوری ہے ڈارلنگ!“ مہ جبین نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا، پھر پستول کے ٹرائیگر پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھ گیا۔ ڈاکٹر کے سینے سے خون کا فوارہ اُبل پڑا۔ اس نے لڑکھڑاتے ہوئے سنبھلنے کی کوشش کی تھی، لیکن دوسری گولی نے اس کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل کر دیا تھا۔

ڈاکٹر کو ٹھکانے لگانے کے بعد اس نے پستول صاف کر کے اطمینان سے اپنے پرس میں رکھا، آگے بڑھ کر بریف کیس اٹھایا، ڈاکٹر کے چہرے پر ایک آخری نظر ڈالتی ہوئی اور کوشی کے صدر دروازے سے جہاں چوکیدار کی اکڑی ہوئی لاش ایک طرف پڑی تھی، گزر کر کھلی سڑک پر آ گئی۔ پھر اس نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ اس کا چہرہ اس وقت بھی پُر سکون ہی نظر آ رہا تھا۔



انسپکٹر جمال الدین اس وقت فرنیچ کٹ داڑھی اور چہرے میں تھوڑی سی تبدیلی کر لینے کے بعد کوئی مصری باشندہ ہی نظر آ رہا تھا۔ لباس پر بھی اس نے خاص توجہ دی تھی۔ وہ میک اپ اس نے ایئر پورٹ کے ایک واش روم میں کیا تھا۔ لباس بھی وہیں تبدیل کیا تھا۔ پرانا لباس اتار کر اس نے اپنے بریف کیس میں رکھ لیا تھا۔ پھر وہ خاصی دیر ایئر پورٹ ہوٹل میں بیٹھا کولڈ کافی سے دل بہلاتا رہا، پھر جب اس کی مطلوبہ فلائٹ آ گئی تو ایگزٹ گیٹ پر ہجوم بڑھ گیا۔

کہا۔ ”تیسرا حصہ تم بطور امانت اپنے پاس رکھو۔ میں اپنے کاروبار میں کسی قسم کی بددیانتی پسند نہیں کرتا۔“

”اور کوئی حکم؟“

”لڑکی کو کسی صورت میں بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہئے۔ وہ ہمارے لئے سب سے مؤثر چار اٹا بت ہوگی۔“

”میں فون بند کرتے ہی دونوں انجینئروں (ساتھیوں) کے ساتھ سائٹ پر پہنچ جاؤں گا۔“

”بلا وجہ کسی دوسری پارٹی سے الجھنے کی کوشش سے گریز کرنا۔“

”میں سمجھا نہیں جتا؟“

”تمہیں معلوم ہے کہ ایک دوسری پارٹی بھی بزنس میں دلچسپی لے رہی ہے، وہ بھی اپنی ہی ہے۔“

”لیکن میں ان افراد کو شناخت کس طرح کروں گا؟“ دوسری جانب سے سوال کیا گیا۔

”کیوں، کیا تم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟ یا پھر بھول گئے ہو؟“

”سوری سر!“ دوسری طرف سے شرمندگی کا اظہار کیا گیا۔

”آنکھیں کھلی رکھنا، میں کسی قسم کی کوتاہی پسند نہیں کروں گا۔“

”ڈونٹ دری سر!“

جمال الدین نے ریسیور ہک پر رکھ دیا۔ پھر وہ ریسیپشن کی طرف گیا جہاں اس نے خود کو ایک ٹورسٹ ظاہر کر کے کمال ناصر کے نام پر تھرڈ فلور کا کمر نمبر تین سو چار تک کرانا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد اس نے کمرے میں پہنچ کر فون کی ڈائریکٹ لائن مانگی تھی۔



میں اس وقت ایک مخبر سے ملنے کے بعد واپس لوٹا تھا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد کھانے کے ارادے سے بیٹھا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی اور میں نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔

”ہیلو! فیصل اسپیکنگ۔“

”جمال۔“ دوسری جانب سے جمال الدین کی آواز ابھری۔

”تم کل سے کہاں غائب ہو؟ میں متعدد بار فون کر چکا ہوں۔ تم دفتر بھی نہیں آئے۔“

سپرٹنڈنٹ بار بارتھری غیر حاضری کے بارے میں میرے کان کھارہا تھا۔ میں نے ایک ہی سانس میں کہا۔ ”کیا کرتے پھر رہے ہو؟“

”میں نے سپرنٹنڈنٹ کو اپنی درخواست بذریعہ ڈاک بھجوا دی ہے، ایک ہفتے بعد ہی دفتر میں نظر آؤں گا۔ درخواست میں ایک بہت ضروری کام کا حوالہ ہے، لیکن اس کی نوعیت نہیں

ہوٹل سے نکل کر وہ بھی ایک مخصوص راستے سے گزر کر ہجوم میں شامل ہو گیا۔ اب وہ بظاہر ایک مسافر ہی لگ رہا تھا۔ آنکھوں پر گہرے سیاہ رنگ کا چشمہ موجود تھا، جس کی پشت سے وہ دوسروں کی حرکات و سکنات بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

ٹیکسی اسٹینڈ پر جانے سے پیشتر اس نے اس بات کا بخوبی جائزہ لے لیا تھا کہ کوئی دوسرا اس کی نقل و حرکت کی نگرانی تو نہیں کر رہا۔ ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد اس نے ڈرائیور کو فائیو اسٹار ہوٹل کا پتہ بتایا تھا۔ راستے میں بھی وہ عقبی شیشے میں کسی تعاقب کے امکانات کا جائزہ لیتا رہا۔ مطلوبہ ہوٹل پہنچنے کے بعد اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو اصل کرائے کی رقم کے علاوہ ایک نیا نوٹ بھی دیا تھا۔ پھر ہوٹل کے مرکزی ہال میں داخل ہونے کے بعد وہ ریسیپشن کی طرف جاتے جاتے ایک پبلک فون بوتھ کے قریب رک گیا۔ بریف کیس فرش پر رکھنے کے بعد اس نے جیب سے رقم نکالی اور مطلوبہ سیکے استعمال کرنے کے بعد کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اس کی نگاہیں اس وقت بھی سیاہ شیشوں کے پیچھے سے ان لوگوں کا جائزہ لے رہی تھیں، جو ریسیپشن ہال کے اندر مختلف میزوں اور صوفوں پر بے فکری سے بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

”ہیلو!“ دوسری جانب سے ایک بھاری بھر کم کھردری آواز ابھری۔ ”کیپٹن راجا خان۔“

”جمال الدین۔“ اس نے سپاہی طور خان کی آواز شناخت کرنے کے بعد مدہم لہجے میں کہا۔ ”لڑکی ایئر پورٹ کے قریب ہوٹل میں پہنچ چکی ہے۔ باقی ساتھیوں کو بھی ہدایت کر دو کہ وہ دور دورہ کر اس کی نگرانی کریں اور اس سے ملنے جلنے والوں پر کڑی نظر رکھیں۔“

”صاحب!“ طور خان نے اس بار کیپٹن راجا خان کے بجائے اپنی اصلی آواز میں کہا۔

”آپ کے لئے ایک اور خبر ہے۔ ڈاکٹر عادل لمبے سفر پر روانہ ہو چکے ہیں۔ لڑکی نے اس کا فیصلہ اپنی مرضی ہی سے کیا تھا، ہمیں بعد میں علم ہوا ہے۔“

”کیا ڈے دار لوگ سامان اٹھا لے گئے ہیں؟“ جمال الدین کی پیشانی خشک آلود ہو گئی۔ اس نے اشاروں کنایوں میں ڈاکٹر کی لاش کے بارے میں دریافت کیا۔

”جی ہاں۔ مگر ابھی تک اس بات کا علم کسی کو نہیں ہو سکا کہ صندوق کا تالا کس نے توڑا ہے۔ لڑکی نے ہر کام بہت ذرا اندیشی سے کیا ہے، لیکن.....“

”چابی (پچاس لاکھ کی رقم) کس کے پاس ہے؟“ جمال الدین نے اس کا جملہ کاٹتے ہوئے دریافت کیا۔

”لڑکی نے ہمارے ساتھ ایک بدعہدی اور کی ہے۔ اس نے پورا حساب نہیں دیا، چوتھائی حساب میں ہیرا پھیری کر گئی ہے۔“

”فکرمٹ کرو۔ اسے اس کا حساب بھی دینا پڑے گا۔“ جمال الدین نے خشک لہجے میں



ظاہر کی۔“ جمال نے ساٹھ لہجے میں جواب دیا۔ ”درخواست میں، میں نے یہ لکھ دیا ہے کہ شاید مجھے آؤٹ آف انٹینشن بھی جانا پڑے۔“

”اس وقت کہاں ہو؟“

”اسی شہر میں۔“ جمال بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ”تم سے ایک ضروری پروگرام طے کرنا ہے۔“

”کیا ہم براہ راست نہیں مل سکتے؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”میری بات بہت غور سے سنو۔“ وہ میرا جملہ نظر انداز کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”تمہاری گرل فرینڈ پرسوں رات کی فلائٹ سے باہر جا رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے روانگی کے وقت اچانک ایئر پورٹ پہنچ کر روکنے کی کوشش کرو۔“ اس نے مجھے فلائٹ نمبر وغیرہ نوٹ کرادیا۔

”کس جرم کی پاداش میں؟“

”تم صرف اس کے ساتھ اس کے سامان کو بھی ہر قیمت پر روک لینا۔ باقی ثبوت یا تو تمہیں خود مل جائیں گے یا میں فراہم کر دوں گا۔“ جمال نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اسی فلائٹ سے ہمارا دوست بھی جانے والا ہے، لیکن وہ فرسٹ کلاس کا مسافر ہوگا۔ جب کہ تمہاری گرل فرینڈ بزنس کلاس میں جائے گی۔“

”آئی سی۔“ میں نے جمال کے جملے کا مفہوم سمجھتے ہوئے کہا۔ ”اصل سامان کس کے ساتھ ہوگا؟“

”میرا ذاتی خیال تمہاری گرل فرینڈ کی طرف جاتا ہے۔“

”کیا تم ایئر پورٹ پر موجود نہیں ہو گے؟“

”یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”فرسٹ کلاس کے مسافر کا کیا ہوگا؟“ میں نے تیزی سے سوال کیا۔

”ہو سکتا ہے کہ وہ عین وقت پر اس فلائٹ سے روانگی کا ارادہ ترک کر دے۔“

”میں سمجھا نہیں؟“ میں نے اُچھٹے ہوئے کہا۔ ”کیا تم کھل کر بات نہیں کر سکتے؟“

”اگر تم اپنی فرینڈ کو روکنے کی کوشش میں کوئی دشواری محسوس کرو تو اس پر قاتل ہونے کا

الزام بھی لگا سکتے ہو۔ ڈاکٹر عادل کا حوالہ بہت کافی ہوگا۔“

”کیا مطلب؟“ میں حیرت سے اُچھل پڑا۔ ”کیا ڈاکٹر کے قتل میں.....“

”میری درخواست کو فراموش کرنے کی کوشش مت کرنا، ورنہ میں بیچ منجھدار میں بھی

ڈوب سکتا ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آزاد فضا میں یہ میری اور تمہاری آخری گفتگو ہو۔“

”صداقت کی باتیں مت کرو۔“ میں نے بڑی اپنائیت کا اظہار کیا۔ لیکن پھر اس سے پیشتر

کہ میں مزید کچھ کہتا، دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔



میں نے اپنا کارڈ دکھانے کے بعد ہی کسٹم کے شفٹ انچارج سپرنٹنڈنٹ علی نواز سے ملاقات کی اور اسے مہ جبین کے بارے میں ضروری انفارمیشن دے دی۔ جمال نے مجھے چونکہ مہ جبین کے بارے میں مکمل تفصیل نہیں بتائی تھی، اس لئے میں نے براہ راست اسے روکنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ علی نواز سے میری تھوڑی بہت سلام دعا پہلے سے تھی، اس لئے میں نے درخواست کی تھی کہ مہ جبین کے سلسلے میں میرا نام درمیان میں نہ آنے پائے۔

اس وقت میں علی نواز کے دفتر ہی میں موجود تھا، جب مہ جبین کسٹم لاؤنج میں داخل ہوئی اس کے پاس ایک لیڈیز پرس اور ایک درمیانے سائز کے سوٹ کیس کے سوا کوئی اور سامان نہیں تھا۔ پورٹر نے اس سوٹ کیس کو ٹرائی سے اتارا، اسکریننگ بیٹ پر رکھنے کی کوشش کی ہی تھی کہ علی نواز لپکتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور سوٹ کیس کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ مہ جبین نے اس حرکت پر علی نواز سے کچھ باز پرس کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے درمیان کیا بات چیت ہوئی، یہ میں نہیں سن سکا۔ لیکن پھر میں نے دیکھا کہ علی نواز، مہ جبین کو ایک کسٹم انفر اور ایک لیڈی سرچ کے ہمراہ اس کمرے میں لے گیا، جہاں مشکوک مسافروں کے سامان کے ساتھ ساتھ ان کی جامہ تلاشی بھی لی جاتی ہے۔ مجھے علی نواز کے پرسل آفس میں کوئی دو ڈھائی گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ اس عرصے میں رہ رہ کر دل ہی دل میں جمال الدین کے خلاف بیچ دتا ب کھاتا رہا۔ پھر علی نواز نے کمرے میں داخل ہو کر بڑی گرم جوشی سے اپنی کامیابی کی خوش خبری سنائی اور مجھے حیرت سے گھورتے ہوئے بولا۔

”مسٹر فیصل! میں آپ کو براہ راست بہت زیادہ نہیں جانتا لیکن میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ کیا آپ اس کی وجہ بتانا پسند کریں گے کہ اتنا شاندار کیس آپ نے خود کرنے کے بجائے میرے حوالے کیوں کر دیا؟“

”خیر سگالی کے طور پر۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی باتیں تھیں، جس کے باعث میں سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گے کہ کل مال کی تفصیل کیا ہے؟“

”مال کے بجائے اس کیس میں جو طریق کار اختیار کیا گیا تھا، وہ بھی بہت زیادہ اہم ہے۔“ علی نواز نے میرے لئے کافی کا آرڈر دیتے ہوئے کہا۔ ”ہیروئن کی ایک بڑی مقدار نہ صرف سوٹ کیس کے فاس باٹم (False Bottom) سے ملی ہے بلکہ اسے انتہائی ماہرانہ انداز میں لیڈیز لیڈر جیکٹ میں بھی پوتھن بیک کے اندر رکھ کر اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ کسی کو اس پر شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ خاتون کی جامہ تلاشی لینے پر قیمتی جواہرات

بھی ملے ہیں، جو سفر کے دوران اس کے لئے خاصی دشواری کا سبب بھی بن سکتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کنسٹینٹک پارٹ آف دی ہاڈی کے بارے میں میرا اشارہ سمجھ گئے ہوں گے۔“

”کیا آپ نے جواہرات اور ہیروئن کی علیحدہ علیحدہ مالیت کا کوئی اندازہ بھی لگایا ہے؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”ہیرونی ممالک میں جہاں اس کی زیادہ کھپت ہے، ان دونوں اشیاء کی قیمت کروڑوں میں بھی لگائی جاسکتی ہے۔“

”کیا میں اُمید رکھوں کہ آپ کسی حالت میں کہیں بھی میرا نام درمیان میں نہیں آنے دیں گے؟“ میں نے کافی کا آخری گھونٹ حلق کے نیچے اتارنے کے بعد اُٹھتے ہوئے کہا۔

”سوچ لیجئے۔“ علی نواز نے دوستانہ لہجے میں مسکرا کر جواب دیا۔ ”اس کیس کا رپورٹ بھی ہماری توقعات سے کہیں زیادہ ہو سکتا ہے۔“

”مجھے اندازہ ہے۔ لیکن میں نے کیس کے سلسلے میں کبھی انعام کی رقم کے بارے میں سوچنے کی زحمت نہیں کی۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ پھر علی نواز سے مصافحہ کر کے کسٹم لاؤنچ سے باہر آ گیا۔ مجھے اس بات پر شدید حیرت ہو رہی تھی کہ اتنے شاندار کیس کو جمال الدین نے نظر انداز کرنے کی حماقت کیوں کی۔ میں نے اس لئے سامنے آنے سے گریز کیا تھا کہ جمال الدین نے مہ جبین کے بارے میں ڈاکٹر عادل کا قاتل ہونے کا اشارہ بھی کیا تھا، میں کسی اُبھرنے والے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ جمال الدین نے صرف اس بات پر زور دیا تھا کہ میں مہ جبین کو ہر قیمت پر اس فلائٹ سے نہ جانے دوں۔ میں اپنے مقصد میں ناکام بھی نہیں رہا تھا۔ پھر انکوائری کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے پیر اکرم شاہ کا خیال آ گیا۔ انسپکٹر جمال نے کہا تھا کہ وہ بھی اسی فلائٹ میں فرسٹ کلاس کا پنجر ہو گا اور یہ بھی شبہ ظاہر کیا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ عین وقت پر اپنی روانگی کا ارادہ ترک کر دے۔ اس خیال کے آتے ہی میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ایئر لائن کے دفتر میں گیا۔ وہاں بھی میرا آفیشل کارڈ ہی کام آیا تھا۔ تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد پنجر لسٹ میرے سامنے رکھ دی گئی۔ میں نے پوری فہرست کو دوبارہ کھنگال ڈالا لیکن فسٹ کلاس کے علاوہ دوسری کسی کلاس میں بھی پیر اکرم شاہ کا نام تلاش نہ کر سکا۔ اس کے نام پر کوئی چانس سیٹ بھی نہیں تھی۔



دوسرے روز میں دفتر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ اکبر خان سرکاری جیب لے کر گھر آ گیا۔ اس کا اس وقت آنا مجھے کھٹکا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہوئی ہے، جس نے اکبر خان کے آنے پر میرے سکون کو لوٹ لیا تھا۔ میں

جلدی سے تیار ہو کر باہر آ کر جیب میں بیٹھ گیا۔ اکبر خان نے فوری طور پر مجھ سے کوئی بات نہیں کی، وہ خلاف توقع کچھ اُلجھا اُلجھا اور کسی گہری سوچ میں غرق نظر آ رہا تھا۔

”کیا کسی کیس پر چلنا ہے؟“ میں نے ایک امکانی پہلو پر غور کرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں۔“ وہ بدستور سامنے سڑک پر نظر جمائے جمائے بولا۔ ”ہم اس وقت اس پولیس اسٹیشن چل رہے ہیں، جس کے حدود میں پہلی کوٹھی اور ایک رہنما کا مزار واقع ہے۔“

”جمال الدین کے بارے میں کوئی خبر ہے؟“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوال کیا۔

”ہاں۔ اس نے پیر اکرم شاہ کی کوٹھی پر ریڈ کیا تھا۔ دفتر کے تین سپاہی بھی تھے اس کے ساتھ۔ وہ سب اس وقت پولیس لاک اپ میں ہیں۔“ اکبر خان نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”تھانہ انچارج مجھے جانتا ہے۔ ابھی ایک گھنٹے پہلے اسی نے مجھے اطلاع دی ہے۔“

”لیکن.....“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔“ اکبر خان تمللا کر بولا۔ ”شیر کی کچھار میں بکریوں کا پورا ریوڑ بھی گھس جائے تو اس کا بال بیکانہیں کر سکتا۔ چہ پدی چہ پدی کا شور با۔ جمال الدین بہت طرم باز بنتے تھے، لیکن اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے نہیں آتا، تب تک اسے اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا اس سے زیادہ بلند ہے۔“ اپنے آخری جملے میں اکبر خان نے غلیظ سی گالی بکی تھی۔

”معاملہ کیا ہے؟“

”تھانے چل کر اصل حالات معلوم ہوں گے۔“ اکبر خان نے جیب کی رفتار تیز کرتے ہوئے کہا۔

پندرہ منٹ بعد ہم متعلقہ تھانے پہنچ گئے۔ انسپکٹر انچارج شاید اکبر خان ہی کا منتظر تھا۔ اسے دیکھتے ہی کرسی سے اُٹھ گیا۔ پھر وہ ہمیں تھانے ہی کے اندر ایک ایسے کمرے میں لے گیا، جہاں شاید کسی کی مداخلت کا اندیشہ نہیں تھا۔

”جمال کہاں ہے؟“ اکبر خان نے پہلا سوال کیا۔

”وہ لاک اپ میں ہے۔ لیکن تم اس وقت اس سے نہیں مل سکتے۔“ انسپکٹر نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”پیر اکرم شاہ کے آدمی ابھی تک اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔“

”چکر کیا ہے؟“ اکبر خان نے سگریٹ جلاتے ہوئے دریافت کیا۔

”تمہارا ساتھی پہلی کوٹھی پر چھاپہ مارنے کی حماقت کر بیٹھا تھا۔“ انسپکٹر نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو سکتا تھا، خاصی بڑی مقدار میں اس نے قیمتی جواہرات، ہیروئن اور شراب کی نان ڈیوٹی پیڈ بوتلیں بھی پکڑی تھیں، کچھ ایسے لوگوں کی

پکڑا ہوا سامان اس سے زبردستی چھین لیا گیا۔ کاغذات نذر آتش کر دیئے گئے، ناجائز سامان واپس پیر صاحب کے مریدوں کے حوالے کر دیا گیا اور انسپٹر جمال الدین کو اس جرم کی پاداش میں اندر کر دیا گیا کہ وہ ایک راشی آفیسر ہے۔ خود ہمارے ڈی آئی جی صاحب کی موجودگی میں جمال الدین کی تحویل سے دو لاکھ کی وہ رقم برآمد کر لی گئی، جس پر علاقہ مجسٹریٹ کے دستخط تھے۔ نشان زدہ نوٹوں کو ابھی تک آن ریکارڈ رکھا گیا ہے۔ پیر اکرم شاہ کے ماتحت کے تحریری بیان کے مطابق جمال الدین نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر مطلوبہ رقم اسے نہ دی گئی تو وہ جھوٹا کیس بنا کر ان کو پھنسا دے گا۔ چنانچہ ٹریپ اریج کیا گیا اور کھرے سٹے کو کھوٹا کر کے گردش کرنے سے روک دیا گیا۔

”کیا میں جمال سے مل سکتا ہوں؟“

”فی الحال میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ تمہاری اس سے ملاقات کرا سکوں۔“ انسپٹر انچارج نے معذرت کر لی۔

”جمال الدین کی ضمانت کے لئے کیا طریق کار ہو سکتا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ انسپٹر استہزائیہ انداز میں بولا۔ ”جو مجسٹریٹ گھر پر بیٹھ کر نوٹوں پر مجبوراً دستخط کر سکتا ہے، اس کے لئے ضمانت کی درخواست کو رد کر دینا زیادہ آسان ہو گا۔ البتہ ایک طریقہ اب بھی ممکن ہے۔“

”وہ کیا؟“ اکبر خان نے تیزی سے دریافت کیا۔

”انسپٹر جمال کے عملے کے افراد یہ بیان دے چکے ہیں کہ انہیں زبردستی اس ریڈ میں شریک کیا گیا تھا۔ پہلی پیشی پر ان کی ضمانت بھی ہو جائے گی۔ اگر تمہارے جمال صاحب بھی یہ بیان دے دیں کہ انہیں تمہارے سپرنٹنڈنٹ نے پیر اکرم شاہ سے معاملہ فٹ کرنے کو مجبور کیا تھا تو ہو سکتا ہے کہ وہ بھی گلو خلاصی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے لیکن ایسا ممکن نظر نہیں آتا۔“ تھانہ انچارج نے کہا۔ ”میں اپنی زبان میں بھی انسپٹر جمال کو دے لفظوں میں سمجھا چکا ہوں لیکن وہ کوئی جھوٹا بیان دے کر کسی کو بھی اندر کرانے پر تیار نہیں ہے۔“

”کیا ہمارے کلکٹر کی بھی شنوائی نہیں ہو گی؟“ میں نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔ ”انسپٹر جمال کا سابقہ تمام ریکارڈ بے داغ ہے۔“

”اطلاعا عرض ہے میرے بھائی! کہ آپ کے کلکٹر صاحب بھی کل رات ہی سے اپنے گھوڑے دوڑا رہے ہیں لیکن میری اطلاع کے مطابق آج ہی ان کے تبادلے کے آرڈر بھی اوپر سے ہو جائیں گے۔ پھر نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری۔“ انسپٹر انچارج نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”انسپٹر جمال کو بھی آج ہی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ بظاہر مہذب، معزز اور قابل اعتماد لوگوں کے بیانات کیس فائل پر موجود ہیں اس لئے کیس بھی یک طرفہ ہی ہو گا،

تصویریں بھی کھینچی گئی تھیں، جو اس وقت وہاں داو عیش دے رہے تھے۔ وہ سب ٹاپ لیول کے آدمی تھے، پیر اکرم شاہ کے کارندوں نے تمہارے ساتھی کو بڑی معقول رقم دے کر خاموشی سے خالی ہاتھ چلے جانے کا اشارہ کیا تھا۔ لیکن تم انسپٹر جمال الدین کو مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ وہ پکے کے لئے تیار نہیں تھا، اس لئے ہاتھی کے پیروں تلے آ گیا۔“

”جب اس نے کامیاب چھاپہ مارا تھا تو پھر اسے لاک اپ میں کیوں بند کیا گیا؟“ اکبر خان نے جھل کر کہا۔

”آرام سے میری جان! آرام سے۔“ انسپٹر انچارج نے اکبر خان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”پیر اکرم شاہ سے سارا شہر واقف ہے، اس کی پہنچ کتنی اوپر تک ہے، یہ تم بھی جانتے ہو گے۔ میں اس علاقے کا انچارج ہوں۔ میرے علاوہ میرے عملے کے بیشتر افراد بھی سو بی جانتے ہیں کہ چلی کوشی کے اندر بڑے بڑے گھرانے کے آزاد خیال مرد اور عورتیں کیسے کیسے شرم ناک کھیل رچاتے ہیں۔ کیا کچھ نہیں ہوتا وہاں۔ حکومت کے سربراہ آدرہ افراد، اوجھی اوجھی کریسیوں کے مالک بھی اس مذموم کھیل میں ملوث ہیں۔ پولیس کے علاوہ کوئی دوسری ایجنسی بھی اس خفیہ کلب کی طرف رخ کرنے کی حماقت نہیں کرتی۔ پیر اکرم شاہ ہماری چشم پوشی کے لئے ایک معقول رقم بھتے کے طور پر ہر ماہ بڑی پابندی سے ادا کرتا ہے۔ وہ چاہے تو ہمیں اوپر سے ایک فون بھی کرا سکتا ہے۔ یا! حکومت ہی مجھو اسی کی ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے، کچھ سر پھرے افسران نے پیر اکرم سے ٹکرانے کی کوشش بھی کی تھی، ان پر بھی تمہارے انسپٹر جمال کی طرح ایمانداری کا بھوت سوار تھا، لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ یا تو وہ اب مارے مارے پھر رہے ہیں یا ابھی تک پاگل خانے اور مختلف جیلوں میں سزا بھگت رہے ہیں۔“

”انسپٹر جمال کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ اکبر خان نے کہا۔ ”تم میرے

ساتھ اس سے متعدد بار مل چکے ہو۔“

”یار! سمجھنے کی کوشش کرو۔“ انسپٹر انچارج نے دبی زبان میں کہا۔ ”جس وقت مجھے سادہ لباس میں پہلی کوشی طلب کیا گیا تھا، اس وقت وہاں ہمارے ڈی آئی جی صاحب بہادر کے علاوہ اور بھی حساس اداروں کی بڑی بڑی توپیں موجود تھیں۔ تمہارے جمال الدین صاحب کیس پیر بھی تیار کر چکے تھے، میں ذاتی طور پر تم کو بتاتا ہوں کہ کیس سو فیصد سچا اور کھرا تھا، مگر اب جھوٹا ہو گیا۔“ میں نے بھی اشاروں کنایوں میں جمال صاحب کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ معاملہ رن دغ کر کے جان چھڑا لے لیکن شاید اس کا برا وقت آچکا تھا۔ وہ کسی طرح کیس چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ پھر وہی ہوا، جو ایسے موقعوں پر ہوتا ہے۔ ہمارے افسران نے خفیہ طور پر شریف النسل پیر اکرم شاہ سے رابطہ قائم کیا، اس کے بعد اوپر سے ملنے والی ہدایت کے مطابق جمال الدین اور اس کی ٹیم کے دوسرے افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ اصل کاغذات اور

اور بہادر شاہ ظفر کا ایک شعر یاد آ جاتا ہے۔

غنیمت ہے جو ہم جیسے یہاں دو چار بیٹھے ہیں  
بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

مہ جبین کے بارے میں مجھے دوسرے ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ وہ اسمگلنگ کی سزا کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عادل کے قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا بھگت رہی ہے۔ رہا 37,50,000 (سینتیس لاکھ پچاس ہزار) کی رقم کا معاملہ، جو مہ جبین نے جمال الدین کے تین سپاہیوں کے حوالے کیا تھا تو اس بارے میں مجھے کوئی پتہ نہیں۔ میں نے جاننے کی ضرورت بھی نہیں محسوس کی تھی!!



آپ کے جمال صاحب نے کہا ہے کہ وہ اپنے مقدمے کی پیروی خود ہی کریں گے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ انہیں آج ہی جیل کسٹڈی میں دے دیا جائے۔ اس کے بعد جو بھی فیصلہ ہوگا، وہ بھی میرے خیال میں جمال صاحب کے حق میں نہیں ہوگا۔ پتھروں سے سرکرا کر لہولہاں ہونے کے علاوہ اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔“

”پتھر وہی ہوا، جو تھانہ انچارج نے کہا تھا۔ جس روز ہم اس سے ملے تھے، اسی روز اوپر سے کلکٹر صاحب کے فوری طور پر چارج چھوڑ دینے کے آرڈر آ گئے اور عدالت نے پہلی ہی پیشی پر جمال الدین کو جیل بھیج دیا۔ اکبر خان کے علاوہ میں نے اور جعفری صاحب نے اپنی ہر ممکن کوشش کی اور تمام ذرائع اپنائے لیکن کوئی بھی موثر ثابت نہیں ہوئے اور تین پیشیوں کے بعد ہی جمال الدین کو دو سال قید با مشقت اور دو لاکھ جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ عدم ادائیگی جرمانہ کے عوض اسے چھ ماہ مزید قید با مشقت کاٹنے کا حکم صادر کیا گیا تھا۔ دیگر افراد کو ان کے بیان کی روشنی میں معاف کر دیا گیا۔

جس روز فیصلہ سنایا جانے والا تھا اس روز ہم سب ہی حسرت و یاس کی تصویر بنے عدالت میں موجود تھے لیکن جمال الدین اپنا فیصلہ سننے کے بعد بھی بڑا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی آسودہ سی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی، جو اس کی فطرت کا خاصہ تھی۔ جس روز اسے عدالت سے سزا سنائی گئی، اسی روز نئے کلکٹر نے ملازمت سے اس کی برطرفی کے آرڈر بھی جاری کر دیئے۔ ازاں بعد ہم لوگوں نے جمال الدین سے جیل جا کر ملاقات کرنی چاہی۔ ہمارے پاس ملاقات کا پروانہ محض دکھاوے کے لئے ہوتا تھا اس لئے کہ جیلر کو بھی اپنی ملازمت عزیز تھی۔ وہ ہمیں ہر بار کسی نہ کسی بہانے سے ٹال دیا کرتا تھا۔

جمال الدین تقریباً ڈیڑھ سال تک نا کردہ گناہوں کی سزا بھگتتا رہا، اس نے اپنے فیصلے کے خلاف اپیل بھی دائر کر رکھی تھی۔ لیکن ہر تاریخ پر کسی نہ کسی عذر کے سبب نئی تاریخ دے دی جاتی تھی۔ پھر ایک روز ہمیں اچانک اطلاع ملی کہ ہارٹ فیل ہو جانے کے سبب اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ اُس روز ہم جیل گئے تو ہمیں بغیر اجازت نامے کے جمال الدین کی لاش کا آخری دیدار کرنے کی اجازت دے دی گئی، جو جیل کے ہسپتال کے بیرونی دروازے میں کسی کھوٹے سلتے ہی کی طرح ننگے فرش پر پڑی تھی۔ ہم نے لاش حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی اجازت نہیں ملی۔



اس واقعے کو گزرے ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے، مجھے ملازمت سے ریٹائر ہوئے بھی تقریباً چار سال گزر چکے ہیں، یہ کیس میری ریٹائرمنٹ سے بھی پندرہ بیس سال پرانا ہے لیکن آج بھی جب مجھے انسپکٹر جمال الدین کی یاد آتی ہے تو میری ہلکوں کے گوشے ہچکنے لگتے ہیں

مظاہرہ کیا۔ ”اس مارکیٹ میں صرف ریشیل کا کاروبار ہوتا ہے۔ تھوک مال حاصل کرنے کے لئے آپ کو براہ راست انجنی سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا۔“

”کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ کمپنی ریٹ پر معمولی منافع لے کر میری مدد کر دیں۔ دراصل میں کراچی میں پہلی بار آیا ہوں۔“ دراز قد والے نے جواب دیا۔ ”اس سے قبل میرا ایک قابل اعتماد سیلز مین یہ کام انجام دیتا تھا لیکن وہ غریب کچھ دنوں پیشتر ایک حادثے میں کام آگیا، اس لئے۔“

”آپ بجافرمار ہے ہیں، میرے بھائی! لیکن ہم یہاں مارکیٹ میں کاروبار کرنے بیٹھے ہیں۔ اگر کسی دکان دار کو بھنگ مل گئی کہ میں نے ریشیل کے بھاؤ میں ڈنڈی مارنے کی کوشش کی ہے تو مقامی ایسوسی ایشن ہمارا حقہ پانی بند کر دے گی۔“

”آپ چاہیں تو رسید اصل قیمت کی کاٹ دیں۔ پھر تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”کہاں کاروبار ہے آپ کا؟“ عبدالکریم نے مسکرا کر پوچھا۔

”پنڈی میں راجا بازار کے قریب ہی دکان ہے۔“

”کیا پنڈی میں آپ لوگوں کے لئے انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس معاف ہے؟“

”جی نہیں۔ لیکن.....“

”کسی اور دکان پر قسمت آزماء میرے بھائیو! اس مارکیٹ میں کوئی بھی آپ کی مدد نہیں کرے گا۔“ عبدالکریم نے بدستور خندہ پیشانی سے مسکرا کر جواب دیا۔ ”کون پاگل ہے جو جان بوجھ کر گھائے کا سودا کرے گا۔“

”مجھے ایک واقف کار نے آپ کے پاس اپنا حوالہ دے کر بھیجا ہے۔“ دراز قد والے آدی نے پہلو بدل کر پوچھا۔ ”آپ کا نام عبدالکریم ہی ہے نا۔“

”جی ہاں..... میرا نام یہی ہے۔“

”پھر تو آپ فیصل آزاد صاحب سے بخوبی واقف ہوں گے“ اس بار سرگوشی میں کہا گیا۔ دراز قد والے نے عبدالکریم کے چہرے کے تاثرات کو محسوس کرنے کی خاطر اس کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑ رکھی تھیں لیکن اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ عبدالکریم نے فیصل آزاد کا نام سن کر اس طرح سنجیدگی اختیار کر لی جیسے وہ اپنے ذہن کو کرید رہا ہو۔ پھر اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

”یہ نام میں پہلی بار سن رہا ہوں۔ ویسے فیصل صاحب کیا کاروبار کرتے ہیں؟“

”کیا یہاں عبدالکریم نام کے کچھ اور بیوپاری بھی ہیں؟“ دراز قد والے نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے میں غلط جگہ پر آگیا ہوں۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“ عبدالکریم نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”آپ باہر کی

## چوہے دان

بہادر شاہ ظفر مارکیٹ میں آٹو پارٹس کی دکان پر بیٹھا ہوا گول منول اور چٹا جوان جو چہرے بشرے سے مبین معلوم ہو رہا تھا، اس وقت دو چار گاہکوں کے ساتھ کاروباری معاملات میں کچھ زیادہ ہی الجھا ہوا تھا۔ دکان کے سامنے ایک دراز قد کا شخص کئی بار اس طرح ادھر ادھر کا چکر لگا چکا تھا جیسے وہ کسی شخص کا متلاشی ہو۔ ممکن ہے، اس کی پریشانی کی وجہ یہ رہی ہو کہ اس مارکیٹ میں چار چھ دکانیں آٹو پارٹس کا کام کر رہی تھیں جب کہ باہر کی سمت جناح روڈ سے لے کر بڑے نالے تک کی پیشتر دکانیں اسی کاروبار کو ذریعہ معاش بنائے ہوئے تھیں۔ جس شخص نے دراز قد آدمی کو ہدایت کی تھی اس میں اندر یا باہر سمت کا حوالہ دینا بھول گیا تھا۔ چنانچہ وہ بیرہی تمام دکانوں کی چھان پٹک کرنے کے بعد ہی بہادر شاہ مارکیٹ میں داخل ہوا تھا۔ کچھ دیر تک وہ ادھر ادھر دیکھتا رہا، پھر اسی دکان میں داخل ہو گیا، جس میں سیٹھ کی ریوالونگ چیئر پر بیٹھا ہوا چٹا جوان اب اس آخری گاہک کو نمٹا رہا تھا۔ دکان میں صرف ایک سیلز مین تھا، جو کاؤنٹر پر ہاتھ رکھے کھڑا کسی نئے گاہک کی راہ دیکھ رہا تھا۔

دراز قد نو جوان کے اندر داخل ہوتے ہی سیلز مین اس کی جانب متوجہ ہوا لیکن اس نے گول منول شخص کی جانب اس انداز میں اشارہ کیا، جیسے وہ اس کا پرانا واقف کار ہو اور محض ملاقات کی غرض سے آیا ہو۔ پھر جب آخری گاہک بھی اپنا آرڈر لیکس کر کے چلا گیا، تب وہ قدم بڑھاتا ہوا نو جوان کے سامنے رکھی ہوئی ایک کرسی پر بڑی بے تکلفی سے بیٹھ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی سنجیدہ مسکراہٹ نظر آرہی تھی۔

”فرمائیے، کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ گول منول اور چٹے نو جوان نے جس کا نام عبدالکریم تھا، نووارد سے سوال کیا۔

”میرا کاروبار پنڈی میں ہے۔ یہاں تھوک کے حساب سے کچھ سامان خریدنے کے لئے آیا تھا۔“

”آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے، میرے بھائی!“ عبدالکریم نے بے نیازی کا

”ہمیں سے کم پر ممکن نہیں ہے۔“ عبدالکریم کا لہجہ خالص کاروباری تھا۔  
 ”اوکے.....“ شہزاد نے تھوڑے توقف سے کہا۔ ”ہمیں بیس پریسٹ منظور ہے۔ لیکن  
 ذمے داری سو فیصد تمہاری ہوگی۔ مال پکڑے جانے پر تمہیں فنقی پریسٹ نقصان بھرتا پڑے  
 گا۔“

”مال کس پارٹی کا ہوگا؟“  
 ”تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے، پیڑ گننے کی کیا ضرورت ہے؟“ شہزاد نے بیڑی کا  
 دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔ ”یہ سمجھ لو کہ سارا معاملہ ہمارے تمہارے درمیان ہوگا۔ مال اور  
 کمیشن دونوں تمہیں میرے ذریعے سے ملیں گے۔“

”ایک ٹرپ میں کتنا مال ہوگا؟“  
 ”اعتبار اور اعتماد کی بات ہے میرے دوست!“ شہزاد نے بے تکلفی سے جواب دیا۔  
 ”سپلائی کا انحصار تمہاری دیاننداری پر ہوگا۔ کام تسلی بخش ہوا تو ایک وقت میں ایک یا دو جیکٹس  
 بھی روانہ کی جاسکتی ہیں۔“  
 ”ایک بات مجھے کھٹک رہی ہے۔ باجے جیولرز والوں سے میری شروع سے ان بن ہے،  
 اگر مال ان کا ہوا تو.....“

”تمہارا اندازہ غلط ہے۔ باجے جیولرز سے میں نے بھی کوئی ڈیل نہیں کی، تم میری بات  
 پر اعتبار کر سکتے ہو۔“  
 ”فیصل صاحب کو خبری کرنے والی بات تمہیں کس نے بتائی ہے؟“ عبدالکریم نے گہری  
 سنجیدگی سے پوچھا۔

”کیوں؟“ شہزاد کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ”کیا میں نے کوئی غلط بات کہی ہے؟“  
 ”پھر بھی.....“

”سوری مائی ڈیئر پارٹنر!“ شہزاد نے تیزی سے کہا۔ ”جس طرح تم مجری کرتے ہو  
 حکومت کے اہلکار کے لئے، اسی طرح ہمارے کچھ بندے تم جیسے لوگوں کے سائے کے ساتھ  
 ساتھ لگے رہتے تھے اور تم جانتے ہو کہ خبر کا نام کسی قیمت پر ظاہر نہیں کیا جاتا۔“  
 عبدالکریم نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، ایک لمحے تک شہزاد کو ٹوٹتی نظروں سے گھورتا  
 رہا، پھر مسکرا کر بولا۔

”اگر میں تمہارا بھاگی دار بننے سے انکار کر دوں تو؟“  
 ”کوئی فرق نہیں پڑے گا ہمارے کاروبار پر۔ ہم کوئی اور پارٹنر تلاش کر لیں گے۔ لیکن  
 ایسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ تمہارا نام ان پارٹیوں تک پہنچ جائے جو تمہاری مجری کی وجہ سے  
 لاکھوں اور کروڑوں کا نقصان اٹھا چکے ہیں۔“

دکانوں پر پتہ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ جس عبدالکریم کی تلاش آپ کو ہے، وہ کوئی اور ہو۔“  
 ”آپ کا قیام کہاں ہے؟“

”کیوں، کیا آپ کا تعلق مردم شماری کرنے والے محکمے سے بھی ہے؟“  
 ”آپ کراچی میں رہتے ہیں تو کھارادر کے علاقے کے فاروق ہوٹل کا نام ضرور سنا ہوگا  
 آپ نے۔“ اس بار دراز قد والے کے چہرے کے تاثرات کسی بہت ہی گھاگ قسم کے راشی  
 آفیسر سے ملتے جلتے تھے۔  
 ”فاروق ہوٹل کے قریب تو میں بھی رہتا ہوں۔“ عبدالکریم نے بغیر کسی پریشانی کے  
 اقرار کر لیا۔

”نوسونانوے۔ چاکلیٹ۔“ دراز قد والے نے مدھم لہجے میں رازداری سے جواب دیا  
 تو عبدالکریم نے آخری بار پھر خود کو معصوم ظاہر کرنے کی خاطر بڑی سادگی سے کہا۔ ”میں آپ  
 کے اشاروں کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”تم فیصل صاحب کے خاص آدمی ہو، اس لئے ہمارے لئے بھی کارآمد ہو سکتے ہو۔“  
 دراز قد والے نے میز پر کہیں ہٹا کر آگے جھکتے ہوئے کہا۔ ”کمیشن منہ مانگا ملے گا، لیکن  
 کامیابی کی ذمے داری تمہاری ہوگی۔“

”غفارا! دو پیالی چائے کے لئے بول دو۔“ عبدالکریم نے اپنے سیلزمین سے کہا۔ پھر اس  
 کے جانے کے بعد بولا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“  
 ”مجھے شہزاد کہتے ہیں۔ یہیں صرافے میں کام کرتا ہوں۔“ دراز قد والے نے سنجیدگی  
 سے جواب دیا۔

”فیصل آزاد صاحب کون ہیں؟“  
 ”اب زیادہ اڑنے کی کوشش مت کرو۔“ شہزاد نے استہزاء سے انداز میں کہا۔ ”دائی سے  
 پیٹ نہیں چھپایا جاسکتا۔ میں ان ہی فیصل صاحب کی بات کر رہا ہوں، جن کے لئے تم مجری کا  
 کام کرتے ہو۔“

”کیا چاہتے ہو مجھ سے؟“ اس بار عبدالکریم نے بھی سنجیدگی اختیار کر لی۔  
 ”ڈھاکا روٹ پر چاکلیٹ کا کاروبار۔“ شہزاد نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگاتے  
 ہوئے کہا۔ ”سفر خرچ کے علاوہ ہر کھپ پر دس پریسٹ کمیشن بھی دیا جائے گا۔“

”دس پریسٹ بہت کم ہے۔“  
 ”پھر تمہاری کیا ڈیمانڈ ہے؟“  
 ”پچیس پریسٹ۔“

”نہ ہمارے دس نہ تمہارے پچیس، ساڑھے سترہ پڑن کر لو۔“

”اچھا۔“ عبدالکریم نے اسے تیز نظروں سے دیکھا۔ ”گویا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔“  
 ”محبت اور جنگ میں ہر ہتھیار کا استعمال جائز ہوتا ہے۔“ شہزاد معنی خیز انداز میں  
 مسکرایا۔ ”یعقوب گاندھی کے شکاری کتے ابھی تک اس خبر کی خوشبو سونگھتے پھر رہے ہیں جس  
 نے اس غریب کو آسمان سے زمین پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔“

غفار چائے لے کر آگیا تو دونوں کے درمیان کاروباری گفتگو شروع ہو گئی۔ پھر کچھ دیر  
 بعد عبدالکریم نے اسے دوبارہ کسی بہانے سے بھیج دیا اور اصل مقصد کی سمت آتے ہوئے بولا۔  
 ”ہمارے کاروبار میں دو ہی راستے ہوتے ہیں۔ ریل یا پھر جیل۔ تم اگر اپنی خوشی پوری  
 کرنی چاہو تو یعقوب گاندھی کے شکاری کتوں کو میری کوئی اتری ہوئی قمیض لے جا کر سونگھا  
 سکتے ہو۔ مگر اتنا یاد رکھنا کہ جو شخص چوری کرنے کی غرض سے کسی بنگلے میں سیندھ لگاتا ہے، وہ  
 فرار کا راستہ پہلے سے دیکھ رکھتا ہے۔ اور جو استاد ہوتا ہے، وہ بھی اپنے شاگردوں سے ایک داؤ  
 چھپا کر رکھتا ہے۔ اس لئے کہ نہ جانے کب آپس میں ٹاکرا ہو جائے۔“

میرا خیال ہے کہ تم اب جذباتی ہو رہے ہو۔“ شہزاد نے اس بار قدرے نرمی سے دوستانہ  
 انداز اپنایا۔

”مجھ سے پارٹنرشپ برقرار رکھنی ہے تو تمہیں اپنی زبان پر کنٹرول رکھنا ہوگا۔“ کریم نے  
 مسکرا کر جواب دیا۔ ”میں موت سے نہیں ڈرتا۔“

”مال تمہیں کہاں، کب اور کیسے پہنچایا جائے گا؟“ شہزاد نے مطلب کی بات چھیڑ دی۔  
 ”تمہارا کوئی فون نمبر ہے جس پر رابطہ قائم کیا جاسکے؟“

شہزاد نے تھوڑا تامل کیا، پھر اپنے مکان کا پتہ اور نمبر بتا دیا۔  
 ”میں تمہیں خود کسی وقت فون کر لوں گا۔“ کریم بولا۔ ”دن، وقت اور جگہ کا تعین بھی اسی  
 وقت ہو جائے گا۔“

”اگر میں گھر پر نہ ملا، تو؟“  
 ”تو تمہاری قسمت۔“

”عام طور سے میں رات آٹھ بجے کے بعد فلیٹ پر ہی ملتا ہوں۔“  
 ”شادی شدہ ہو؟“

”نہیں۔“ شہزاد نے مسکرا کر ایک آنکھ جھپکاتے ہوئے بے باکی سے کہا۔ ”جب پیٹ  
 کے چوہے زیادہ شور شرابا کرنے لگتے ہیں تو ادھر ادھر منہ مار لیتا ہوں۔“

”میرے بارے میں اور کیا کچھ جانتے ہو؟“ کریم نے دریافت کیا۔  
 ”یہی کہ تمہارا فیصل صاحب کے دفتر آنا جانا بھی ہے۔“ شہزاد نے پہلو بدل کر جواب  
 دیا۔ ”ان کے بہنوئی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جعفری صاحب سے بھی تمہارے اچھے تعلقات ہیں اور

افران بھی تمہیں فیصل صاحب کا دوست ہی سمجھتے ہیں اور یہی تمہاری کامیابی کا راز بھی ہے۔  
 تمہاری ایک حیثیت کاروباری بھی ہے، اس لئے شاید ابھی تک تمہارے اوپر کسی کو شبہ نہیں  
 ہوا۔“

”سوائے تمہارے۔“

”میری بات چھوڑو۔“ شہزاد نے بظاہر بے پروائی سے مگر بڑی گہری بات کہی۔ ”میرا  
 کام تو ہے ہی کھوجیوں والا۔ پیٹ کی خاطر ہاتھ پاؤں تو مارنا پڑتا ہے۔“

”چاکلیٹ کا نام کافی بدنام ہو گیا ہے، اس لئے اب میں نے اسے بسکٹ کہنا شروع کر  
 دیا ہے۔“ کریم نے کہا۔ ”میں جب بھی تم سے بات کروں گا، فون پر بسکٹ ہی کا کوڈ استعمال  
 کروں گا۔ تم کھوجی کا حوالہ دے کر اپنی شناخت کراؤ گے۔“

”یہ طریقہ زیادہ مناسب ہوگا۔“

”ایک بات اور۔ مال میرے حوالے کرنے کے بعد تم یا تمہاری ٹیم کا کوئی دوسرا آدمی  
 میری نگرانی یا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کرے گا، ورنہ ہمارے درمیان اعتماد کا رشتہ کاٹچ کی  
 طرح ٹوٹ بھی سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ مجھے تمہاری یہ شرط بھی منظور ہے۔“  
 ”پہلی کھپ میں کتنی چاکلیٹ (دس تو لے نا جائز سونے کا ایک پیس) روانہ کرنے کا  
 ارادہ ہے؟“

”پہلے کام چھوٹے پیمانے پر شروع ہوگا۔ پھر جیسے جیسے ہماری دوستی بڑھتی جائے گی،  
 ویسے ویسے کاروبار بھی ترقی کرتا جائے گا۔“

”اچھا اصول ہے۔ لیکن میں بیس چاکلیٹ سے کم کا مال نہیں اٹھاتا۔“  
 ”تمہاری یہ شرط بھی مجھے منظور ہے۔“

دونوں کے درمیان دیر تک اسی ناجائز تجارت کے موضوع پر کاروباری معاہدے طے  
 ہوتے رہے، پھر غفار دوبارہ واپس آیا تو شہزاد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”میں اب چلتا ہوں، کریم بھائی! دوبارہ جلدی ہی ملاقات ہوگی۔“  
 شہزاد کے جانے کے بعد بھی کریم خاصی دیر تک اس کے بارے میں غور کرتا رہا، پھر  
 ایسے انداز میں مسکرایا جیسے اس نے اس نئی مصیبت سے چھٹکارا پانے کا کوئی آسان ساحل  
 تلاش کر لیا ہو۔ اس کے بعد وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔



اسکریننگ سے گزرنے کے بعد وہ خوب صورت، شوخ و شنگ لڑکی بورڈنگ کارڈ کے  
 لئے مقامی ایئر لائن کے کاؤنٹر تک پہنچ گئی۔ پہتاوے کے اعتبار سے بھی وہ خاصی ماڈرن نظر آ

سیٹ اپنا لی تھی۔ شاہینہ نے کسی قدر چونک کر کسٹم انسپکٹر کی جانب دیکھا، پھر خود کو بے پروا ظاہر کرنے کی خاطر پرس سے ایک مختصر سا آئینہ نکال کر ہونٹوں کی لب اسٹک درست کرنے لگی۔  
 ”آپ شاید ڈھا کا کاشریف لے جا رہی ہیں۔“ کسٹم انسپکٹر نے جس کا نام سرور خان تھا، دہلی زبان میں شاہینہ سے سوال کیا۔ ایسا کرتے وقت اس نے صرف نہ پر ہاتھ رکھا تھا تاکہ کوئی دوسرا اس کے ہونٹوں کی حرکت کو محسوس نہ کر سکے۔ اس کی توجہ بھی لڑکی کی سمت نہیں تھی۔  
 ”جی!“ شاہینہ نے چونک کر انسپکٹر کی جانب دیکھا۔

”میں ایک چھوٹا سا گفٹ باکس اپنے دوست کو ڈھا کا بھجوانا چاہتا ہوں۔“ سرور خان نے اس بار لڑکی کی جانب اس طرح دیکھا جیسے ان کے درمیان برسوں کی شناسائی ہو۔  
 ”یہ کام آپ میرے علاوہ کسی اور سے بھی کر سکتے ہیں، اس کے علاوہ آپ کسٹم انسپکٹر بھی ہیں۔ جہاں کے کسی کریو (Crew) کے ذریعے بھی اپنا گفٹ پیک بھجوا سکتے ہیں۔ دوسری شکل میں لاؤنج میں اور بھی بہت سارے ڈھا کا باؤنڈ مسافر موجود ہیں۔ آپ نے خاص طور پر میرا ہی انتخاب کیوں کیا؟“

”معاف کیجئے گا، محترمہ!“ سرور خان نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”مجھے انجانے لوگوں سے بے تکلف ہونے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“

”پھر آپ نے مجھے مخاطب کرنے کی غلطی کیوں کی؟“  
 ”اس لئے کہ آپ تنہا سفر کر رہی ہیں۔ اس سے بیشتر بھی آپ اکثر و بیشتر ڈھا کا آتی جاتی رہی ہیں۔“ سرور خان کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

”میں اب بھی نہیں سمجھی۔“ لڑکی نے اسے گھورا۔ ”اکثر و بیشتر ڈھا کا آنے جانے سے آپ کی بے تکلفی کا کیا تعلق ہے؟“

”دریا میں رہ کر مگر مجھ سے بے مناسب نہیں ہوتا۔“ سرور خان نے قرب و جوار میں بیٹھے ہوئے دوسرے مسافروں کو دکھانے کی خاطر مسکرا کر جواب دیا۔ ”میرے اختیارات بڑے وسیع ہیں، میں چاہوں تو آپ کو دوسرے طریقوں سے بھی پریشان کر سکتا ہوں۔“

”یہ آپ دھمکی دے رہے ہیں یا درخواست کر رہے ہیں؟“  
 ”مجھے اس بات کا بخوبی علم ہے کہ آپ ڈھا کا ایئر پورٹ سے باہر جانے کے بعد کیا کام سرانجام دیتی ہیں۔ کہتے تو اس کی تھوڑی بہت تفصیل بھی بتاؤں۔“

”ہو سکتا ہے کہ آپ کو میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔“ شاہینہ نے اس بار کمزور لہجے میں جواب دیا۔

”او۔ کے!“ سرور خان نے اپنا گفٹ باکس اٹھایا، پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں اپنا گفٹ باکس اور ذریعے سے روانہ کر دوں گا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ آپ کو آج نہیں تو کل کسی

رہی تھی۔ صورت و شکل کے اعتبار سے جس مخالف کے لئے اس کے اندر بے پناہ کشش موجود تھی۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں بادامی اور شرمیلی ہونے کی وجہ سے اس کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو تھیں۔ بورڈنگ کارڈ ایٹھ کرنے سے پیشتر کاؤنٹر پر اس کے ضروری کاغذات چیک کئے گئے، پھر ایئر کمپنی کے افسر نے اسے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے بڑے مہذب لہجے میں سوال کیا۔

”کیا آپ کے پاس سوائے بریف کیس اور پرس کے کچھ قسم کی کوئی چیز نہیں ہے؟“  
 ”کیا بیج لگا ہونا ضروری ہے جس کے بغیر بورڈنگ کارڈ نہیں دیا جاسکتا؟“ لڑکی نے ترش روئی سے پوچھا۔

”جی نہیں، ایسی کوئی شرط نہیں ہے۔ میں نے بس یوں ہی اس خیال کے تحت کہ کہیں آپ اپنا کوئی سامان.....“

”پاسپورٹ پر ایک نظر اور ڈال لیں۔“ لڑکی نے شان بے نیازی سے جواب دیا۔  
 ”صرف پاسپورٹ پر مکمل توجہ دیں تو آپ کو نظر آجائے گا کہ میں ہر مہینے میں ایک یا دو بار ڈھا کا ضرور جاتی ہوں۔“

”کیا وہاں آپ کا کوئی قریبی عزیز دار.....“

”میرا خیال ہے کہ آپ اپنے ساتھ ساتھ میرا وقت بھی برباد کر رہے ہیں۔“ لڑکی کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ اس نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ ”کیا مجھے بورڈنگ کارڈ کے حصول کے لئے اسٹیشن آفیسر سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا؟“

”جی نہیں۔“ کاؤنٹر آفیسر نے اسے جلدی سے بورڈنگ کارڈ جاری کر دیا۔

”احسان مند ہوں اس ذرہ نوازی کی۔“ ٹھیکس۔“ لڑکی نے بورڈنگ کارڈ لے کر استہزائیہ انداز میں کہا پھر اونچی ہیل کی سینڈل پر لہراتی، بل کھاتی لاؤنج کی طرف قدم اٹھانے لگی۔

”مرچ ہے مرچ۔“ کاؤنٹر آفیسر کے ساتھ موجود دوسرے فرد نے لڑکی کے بارے میں اظہار خیال کیا۔

”میری ڈیوٹی میں یہ دوسری بار آئی ہے۔ ایک دو بار اور ڈیل ہوئی تو کھل جائے گی۔“  
 ”نام کیا ہے خاتون کا؟“

”شاہینہ۔“ آفیسر نے جواب دیا۔ پھر دوسرے مسافر کو آئینڈ کرنے لگا۔  
 لڑکی، پاسپورٹ پر جس کا نام شاہینہ درج تھا، کھٹ پٹ کرتی لاؤنج میں داخل ہوئی تو بے شمار نگاہیں اس کی جانب اٹھ گئیں۔ شاہینہ نے سرسری نظر سے ادھر ادھر دیکھا، پھر ایک خالی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ وہ اس بات سے غلطی بے خبر تھی کہ ایک کسٹم انسپکٹر آن ڈیوٹی اس کا تعاقب کرتا ہوا لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔ انسپکٹر نے شاہینہ کے بعد ایک سیٹ چھوڑ کر دوسری



دوسرے سفر کے اختتام پر مصیبت کا سامنا کرنا پڑے۔ میری اس بات کو فراموش نہ کیجئے گا۔“  
سرور خان اپنا جملہ ٹھیک کر کے صرف ایک ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ شاہینہ جلدی سے اٹھ کر اس کے سامنے آگئی۔ پھر ہونٹوں پر تبسم بکھیر کر بڑی بے تکلفی سے کہا۔

”آپ تو سچ مچ روٹھ گئے۔“

”سوری میڈم!“ اس نے شاہینہ کو دکھتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں، مجھے انجانے لوگوں سے بے تکلف ہونے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ یہ شعبہ میرے فرائض میں شامل نہیں ہے، لیکن۔“

”آپ تو واقعی خفا معلوم ہو رہے ہیں۔“ شاہینہ نے سرور خان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑی بے باکی سے کہا۔ ”کیا ہم دوستی نہیں کر سکتے؟“

”اس کا جواب میں آپ کو ڈھا کا سے واپسی کے بعد ہی دوں گا۔“  
”لیکن آپ کو اس بات کا علم کس طرح ہو گا کہ میں کس روز اور کس نمبر کی فلائٹ سے واپس آؤں گی۔“

”میرے پاس آپ کے گھر کا فون نمبر اور ایڈریس دونوں موجود ہیں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ اپنے اپارٹمنٹ میں تنہا رہتی ہیں اور ایک مقامی ہوٹل میں ریسپنڈنٹ کے فرائض بھی انجام دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک دو ایئر ہوٹل اور اسٹیورڈز بھی آپ کے حلقہ احباب میں شامل ہیں، لیکن صرف ریسپنڈنٹ کاؤنٹر کی حد تک۔ اپارٹمنٹ میں آپ کسی کو.....“  
”بڑی معلومات اکٹھا کر رکھی ہیں آپ نے میرے بارے میں۔“ شاہینہ اور زیادہ بے تکلف ہو گئی۔

”یہ ساری معلومات رکھنا بھی میرے فرائض میں داخل ہے۔“

”اب غصہ تھوک دیں، پلیز!“ شاہینہ نے ایک انداز دلیرانہ سے کام لیا۔ ”لائیے، کہاں ہے آپ ک گفٹ باکس؟ میں اسے آپ کی فرمائش پر جہاں بھی حکم دیں گے، بخوشی پہنچا دوں گی۔“

”خوب صورت اور ماڈرن لڑکیوں کو حکم دینا بھی میرے اصول کے خلاف ہے۔“  
”چلئے، آپ درخواست کر لیں اور میں اسے قبول کر لیتی ہوں۔“ شاہینہ نے اپنی سحرانہ آنکھوں کا جادو جگاتے ہوئے کہا۔

”آج نہیں۔ پھر کبھی۔“

”آپ کا نام؟“ شاہینہ نے شوقی سے دریافت کیا۔

”میرے سینے کی گہرائیوں میں جانے کی دشواری کیوں مول لے رہی ہیں؟ میرا نام بھی میرے یونیفارم کا ایک حصہ ہے۔“ سرور خان نے بدستور سنجیدگی سے جواب دیا۔ پھر دبی

زبان میں پوچھا۔ ”کیا آپ کو انگریزی.....“  
”میں نے اولیول کر رکھا ہے، مائی ڈیئر مسٹر سرور خان!“  
”اس کے آگے شاید آپ کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں مل سکا ہو گا۔ شاید ذاتی مصروفیات اور معاشی حالات کے سبب۔“

”گفٹ باکس پلیز!“ شاہینہ نے مخمور آواز میں کہا۔

”سوری۔ پھر کبھی سہی۔“ سرور خان نے مسکرا کر جواب دیا۔ پھر تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے اس دروازے کی سمت لپکا جہاں سے فلائٹ کریو داخل ہو رہا تھا۔ آگے بڑھ کر اس نے پہلے کیپٹن سے ہائے ہیلو کیا، پھر فلائٹ پرسر (Flight Purser) کے ساتھ بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

”اور سناؤ۔ زندگی کیسی گزر رہی ہے؟“

”ایک دم فرسٹ کلاس۔“ مجاہد نامی پرسر نے خاصی بلند آواز میں قہقہہ لگا کر جواب دیا۔  
”کوئی نیارومانس؟“

”فی الحال پرانوں کو نمٹانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اسکے بعد ہی کوئی نیا پنچھی جال میں پھانسنے کی کوشش کروں گا۔“

”شاہینہ ایک بار پھر تمہاری فلائٹ سے جا رہی ہے۔“ سرور خان نے دبی زبان میں کہا۔  
”اس بار خاص طور پر اس کی آؤ بھگت کرنا۔ کسی بہانے سے میرا حوالہ بھی دبی زبان میں ضرور دے دینا۔ سنبھل کر ڈیل کرنا۔ خاصی مشکل چیز ہے۔“

”ڈونٹ وری۔“ مجاہد نے ایک آنکھ چھپکا کر جواب دیا۔ ”اس لائن میں، میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کر چکا ہوں اور اب پی ایچ ڈی کی تیاری کر رہا ہوں۔“

”وش یو آل دی بیسٹ۔“

”کوئی خدمت میرے لائق؟“ مجاہد نے اس بار رازداری سے پوچھا۔

”فی الحال میری جانب سے ماسٹرز کرنے کی خوشی میں ایک تحفہ قبول کرو۔“ سرور خان نے باکس کھول کر ایک خوب صورت سارسرخ رنگ کا گفٹ پیک نکال کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اسے سول ایجنٹ تک پہنچا دینا۔“ آخری جملہ اس نے اتنی ہی مدہم آواز میں کہا تھا کہ مجاہد کے سوا کوئی نہیں سن سکا۔

”کتنے دانے ہیں؟“ مجاہد نے گفٹ پیک کو بڑی بے پروائی سے اپنے ایئر بیگ میں رکھتے ہوئے دبی زبان میں پوچھا۔

”بیس۔“

”او۔ کے!“ مجاہد نے ایئر بیگ کو زپ لگاتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔ ”تخفے کا بہت

بہت شکریہ! زندہ رہا تو واپسی پر ملاقات ہوگی۔ ورنہ پھر تم میرے سوئم میں شرکت ضرور کرنا۔  
اٹ ایڈوانس انوی ٹیشن۔ آل رائٹ۔“  
”نان سنس۔“ سرور خان نے شانے جھٹک کر جواب دیا۔ پھر لاؤنج سے گزر کر کسٹم  
کاؤنٹر کے قریب آ کر اپنے فرائض انجام دینے لگا۔



فون کی گھنٹی بار بار بج رہی تھی لیکن شہزاد نے اس کی سمت کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ اپنے دو  
ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا جوا کھیل رہا تھا۔ شاید اسے اتنا ہوش ہی نہیں تھا کہ فون کی آواز سنتا یا  
پھر اس نے کسی وجہ سے جان بوجھ کر ادھر توجہ نہیں دی تھی۔ تقریباً دو ہزار کی رقم ہار جانے کے  
بعد اس بار اس کے پاس کلر اوٹڈ آ گیا تھا۔ دو ایک چال چلنے کے بعد وہ رک گیا۔ چہرے  
سے بظاہر یہی نظر آ رہا تھا جیسے اس بار وہ بھی اپنے پتوں سے مطمئن نہیں ہے۔ جو افراد فلیش کھیلنا  
جانتے ہیں وہ اس امر سے بھی ضرور واقف ہوں گے کہ اس کھیل میں فیس ریڈنگ سب سے  
زیادہ اہم رول ادا کرتی ہے۔ کوئی کھلاڑی کبھی اتنے اعتماد سے لمبی لمبی رقم بورڈ پر ڈال رہا ہوتا  
ہے جیسے اس کے پاس یقینی طور پر حریف سے بہتر کارڈز موجود ہیں اور جب چال بڑھ جانے  
کے بعد حریف اپنا پتا پھینک جاتا ہے تو سامنے والا محض غلام پیش ہونے پر جیت کی رقم سمیٹ  
لیتا ہے۔ جب کہ پتایک (Pack) کرنے والے کے پاس نیچے کا بیئر (Pair) ہوتا ہے۔  
شہزاد بیشتر بازی ہار رہا تھا اس لئے اس بار بھی اس نے چہرے سے یہی تاثر دیا تھا کہ  
اس کے پاس ایسے کارڈز نہیں ہیں، جو اسے مقابل سے جتا سکیں۔ وہ ہونٹ چبا چا کر پتوں کو  
دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک چال اور چل دی۔ بورڈ پر اب تک آٹھ سو روپے کی رقم جمع ہو  
چکی تھی۔

”شہزاد بھائی! کیا اس بار اچھے پتے ہاتھ لگ گئے؟“ ثار نے شہزاد کے چہرے کو بغور  
دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری ہار کے عوض ایک چال میری بھی آگئی۔“  
خالد میمن خالد میمن نے کہا۔ وہ چونکہ جیت میں تھا اس لئے اس نے بھی ایک چال چل  
دی۔

شہزاد نے کچھ سوچا، خالد میمن کو جھلٹائے ہوئے انداز میں دیکھا، پھر کچھ توقف کے بعد  
اس نے ایک چال اور چل دی۔

”جذبات میں مت بہو میری جان!“ ثار نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ”آج  
تیرے ستارے کبڈی کھیل رہے ہیں۔“

”مال میرا پٹ رہا ہے، تمہارے باپ کا نہیں۔“ شہزاد نے مصنوعی جھلاہٹ کا بڑا خوب  
صورت مظاہرہ کیا۔

”اگر یہ بات ہے تو میری طرف سے ڈبل۔“ ثار نے تملکا کر چال سو سے بڑھا کر دو سو  
کر دی۔

”کیا اس بار تم دونوں نے مجھے چکی کے درمیان پیسنے کا ارادہ کر لیا ہے؟“ خالد نے مسکرا  
کر کہا پھر سو سو کے دونوٹ چوم کر بورڈ پر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”جیت کے مال سے ایک چھوٹی  
رقم اور قبول کرو۔“

”بلف (Bluff) کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔“ شہزاد نے خالد کو گھورا۔  
”پتے پھینک جاؤ یا پھر مقابلے پر ڈٹے رہو۔“ خالد مسکرایا اور ایک نئی سگریٹ سلگانے  
لگا۔ اس کے پاس دو بادشاہ تھے۔

”ایک چال اور۔“ شہزاد نے ہچکچا کر اپنی رقم گنی، پھر بجھے ہوئے دل سے دو سو روپے  
بورڈ پر پڑی رقم میں شامل کر دیئے۔

”یا پیر دھندا۔ کر دے سب کو اندھا۔“ ثار نے مسکراتے ہوئے تک بندی کی، پھر اس  
نے دوبارہ چال بڑھا کر دو سو سے چار سو کر دی۔ اس کے ہاتھ میں آٹھ نوٹس کا راؤنڈ تھا۔  
”کیا بات ہے ثار بھائی؟“ خالد نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے پوچھا۔ ”کوئی وزنی  
مچھلی پھنس گئی ہے؟“

”پیسہ پھینک۔ تماشا دیکھ۔“ ثار نے بے پروائی سے کہا۔  
”ایک چال اپنی بھی۔“ خالد نے اس بار کمزور لہجے میں کہا پھر سو سو کے چار کرارے  
نوٹ خود اپنے اوپر سے نچھاور کر کے بورڈ پر پھینک دیئے۔  
فون کی گھنٹی دوبارہ بجی تو شہزاد نے ایک موٹی سی گالی چٹخا دی، پھر ایک چال اس نے بھی  
اور چل دی۔

”جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا۔“ ثار نے کن آنکھوں سے شہزاد کو دیکھتے  
ہوئے ایک چال اور چل دی۔

”اس بار ڈبل نہیں کیا۔“ خالد نے اسے غور سے دیکھا۔ ثار نے پاؤں کے سیدھے  
انگوٹھے کو ہلا کر اشارہ کیا تو خالد کچھ دیر تک اپنے پتے دیکھنے کے بعد پیک کر گیا اور بیزاری  
سے بولا۔

”تم دونوں لڑو، جب تک میں ذرا پاؤں پیار لوں۔“  
شہزاد نے ثار کو مخصوص اشارہ کرتے دیکھ لیا تھا۔ پہلے بھی وہ محسوس کر چکا تھا کہ ثار اور  
خالد مل کر اسے پھانسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ تینوں ہی صرافہ بازار میں کام کرتے تھے۔  
خالد ایک نمبر کا چلن پڑھتا تھا، جب کہ ثار بس واجبی سے داؤ بیچ جانتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح سے  
وہ تینوں ہی اسمگلنگ کا کام کرتے تھے اور ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے رہتے تھے۔ لیکن

بات مان میری۔ جتنی رقم بورڈ پر پڑی ہے، اس کا آدھا آدھا بانٹ لیتے ہیں۔ یہ بھی اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آج تیرے ستارے گردش میں نظر آرہے ہیں۔“

”زیادہ بڑا مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ شہزاد نے جواب دیا۔ ”میں مل بانٹ کر کھانے کا عادی نہیں ہوں۔ تو اگر مضبوط ہے تو چال چل ورنہ میں سے نو دو گیارہ ہو جا۔“

”تین تیرہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ ثار نے اس کے پھر ڈبل کر دیا۔

”اونچے پتے پھس گئے ہیں، اس لئے اکڑ رہا ہے۔“

”اگر یہ بات ہے تو شو کرا لے۔ صرف آٹھ سو کی تو بات ہے۔ رہا چھوٹے بڑے ہونے کا سوال تو فٹس میں بس ایک ہی مثال چالو ہے۔ جس کی لاشی اس کی بھینس۔“

”آٹھ سو روپے اپنے بھی۔“ شہزاد نے نوٹ گن کر بورڈ میں شامل کرائے۔

”پکانے کی کوشش کر رہا ہے پیارے!“ ثار نے شاطرانہ انداز میں پوچھا۔ ”کیا وہیں پھنس گئی ہے جال میں؟“

کچھ دیر تک دونوں کے درمیان ٹھنی رہی۔ بورڈ پر تقریباً چار ساڑھے چار ہزار کی رقم جمع ہو چکی تھی۔ پھر جب رقم میں برق رفتاری سے اضافہ ہونے لگا تو شہزاد نے مصنوعی پریشانی اور بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے شو مانگ لی۔ ثار نے مسکرا کر پتے کھولے تو شہزاد نے محاورہ بتا دیا۔

اپنا سر پیٹ لیا۔ لیکن جیت بہر حال اسی کی ہوئی تھی۔

”چل اٹھ پیارے۔“ خالد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”آئندہ سے کہیں اور بازی جے گی۔“

ثار نے تمللا کر شہزاد کو دیکھا پھر دونوں کمرے سے چلے گئے تو شہزاد نے اندر سے کنڈی چڑھا لی۔ رقم گئی تو پورے چھ ہزار چار سو روپے تھے۔ گویا وہ تقریباً ساڑھے چار ہزار جیت میں رہا تھا۔ پھر فون کی کھنٹی چوٹی بار بجی تو اس نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔

”بسکٹ فیکٹری؟“ دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

”گھاس کھا گیا ہے کیا؟ یہ بسکٹ فیکٹری نہیں، پولیس اسٹیشن ہے۔“ اس نے دوسری جانب سے بولنے والے کو ڈرانے کی کوشش کی۔

”گڈ!“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”پھر تو تمہارے اسٹیشن پر کھوجی بھی آسانی سے مل سکتا ہے۔“

”کھوجی!“ شہزاد نے برا سامنہ بنایا، پھر اچانک اسے عبدالکریم یاد آیا تو لہجہ بدل کر بولا۔ ”ہاں، ہاں۔ میں کھوجی ہی بول رہا ہوں۔ کیا خبر ہے، بھائی صاحب منزل تک پہنچ گئے یا ابھی تک جہاز کی سیٹ نہیں ملی۔“

”میں دو چار ریڑرویشن اور اوپن لکٹ ہمیشہ جیب میں رکھتا ہوں۔“ دوسری جانب سے کہا گیا۔ ”لکی پان ہاؤس سے اپنا بلیو اور اورنج کلر کا ایئر میل لفافہ لے لو۔ تمہارے عزیز

بظاہر خود کو ایک دوسرے کا جاں نثار ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ثار سے شہزاد کے تعلقات پرانے تھے جب کہ خالد، ثار کی وساطت سے نیا نیا شامل ہوا تھا۔ تینوں ہی ایک دوسرے کے دھندے سے واقف تھے لیکن کبھی ایک دوسرے پر ناجائز تجارت میں ملوث ہونے کے سلسلے میں ان کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔

”ثار!“ شہزاد کڑوا سامنہ بنا کر بولا۔ ”تو اپنا پرانا یار ہو کر اپنے ہی ساتھ چیٹنگ کرتا ہے۔“ شہزاد نے ثار کو گھورا۔

”کون کہتا ہے کہ میں نے چیٹنگ کی ہے؟“ ثار تیز لہجے میں بولا۔

”تو نے چال چلنے کے بعد پاؤں کے انگوٹھے کو کیوں ہلایا تھا؟“

”ڈم ہوئی تو وہ بھی ہلا سکتا تھا۔“ ثار نے شہزاد کو گھورا۔ ”واہ! یہ جسمانی کل پرے ہلانے پر بھی اچھی پابندی ہے۔ تو ڈر رہا ہے تو تو بھی پیک کر جا۔ اپن تو گھر جلا کر ہاتھ تاپنے والوں میں سے ہیں۔ وہ کسی فٹ پاتھیا نے کیا پتے کی بات کہی ہے، زندگی کا کیا بھروسہ۔ آج مرے کل بلا لکٹ سیدھے جنت میں۔“

”تاؤ دلانے کی کوشش کر رہا ہے مجھے؟“ شہزاد چونکہ اپنے فلیٹ میں تھا اس لئے اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہونے کی مثل کے مصداق پھیل گیا۔

”اگر یہ بات ہے تو پھر ہمت کر۔ ڈبل کر دے چال۔“ ثار نے اسے غصہ دلانے کی کوشش کی۔

شہزاد کے پاس کلر راؤنڈ میں دہلا، غلام اور بیگم تھی۔ اسے اپنی کامیابی کا مکمل یقین تھا، پھر بھی اس نے جان بوجھ کر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”یہ آخری بار ہے۔ اور آج کے بعد میں تم دونوں کے ساتھ کبھی نہ کھیلوں گا۔“

”ناراض کیوں ہوتے ہو جان من؟“ خالد نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

”نہیں کھیلنا دوبارہ تو نہ کھیلنا۔ اس میں اکڑنے کی کیا بات ہے؟“

”تو میرے فلیٹ میں بیٹھا ہے خالد! اس لئے برداشت کر رہا ہوں، ورنہ.....“

”ورنہ کیا کر لیتا تو؟“ خالد نے سگریٹ کو زمین پر گرڈ کر بجھاتے ہوئے پوچھا۔ ”ہاتھ پیر کے معاملے میں وہ شہزاد کے مقابلے میں زیادہ تندرست و توانا تھا۔“

”یار! اب ختم کرو۔ دنگا فساد۔“ ثار تیزی سے بولا۔ ”بس آج کے بعد سے نہیں کھیلیں گے ایک ساتھ۔ لیکن یہ بازی تو پوری کر لینے دو۔“

”ایک چال اور۔“ شہزاد نے تھلہ کر چال چلی۔

”پرانا چال ہوں پیارے!“ ثار نے شہزاد کو دیکھتے ہوئے عجیب انداز میں کہا۔ ”پھیل گیا تو بھاگنے کا راستہ نہیں ملے گا۔ کیوں بلا وجہ اپنی کھاٹ کھڑی کرنے پر ٹٹلا ہوا ہے؟ ایک

خیریت سے پہنچ گئے ہیں۔“

”لیکن لکی پان ہاؤس۔“ شہزاد بری طرح چونکا۔

”پریشان مت ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے بھی وہاں ایک پوسٹ بکس الاٹ کر رکھا ہے۔ حساب کتاب کی تفصیل درج ہے، دوسری ملاقات ایک ہفتے بعد ہی ہو سکے گی۔ وہیں جہاں پہلے ہوئی تھی۔“ پھر جملے کے اختتام کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

یہ بات غلط نہیں تھی۔ ناجائز رقم کا تمام حساب کتاب اور لین دین کا ذریعہ لکی پان ہاؤس ہی تھا، جو ایک معمولی کمیشن کے عوض بڑی ایمانداری سے کام کرتا تھا۔ لیکن عبدالکریم کو اس کا علم کیسے ہوا۔ شہزاد نے سوچا پھر فلیٹ سے نیچے اتر کر مطلوبہ پان کی دکان پر پہنچ گیا جو اس کے فلیٹ سے بمشکل بیس گز کے فاصلے پر واقع تھی، ایک ڈبل کتھا چوٹا اور دیپ تمباکو کا پان کھانے کے بعد اس نے اپنا لفافہ وصول کیا، پھر دوبارہ فلیٹ پر آ گیا۔ لفافہ کھولا تو اس کے اندر چار ہزار آنھ سو کی رقم اور ٹائپ کی گئی مندرجہ ذیل تفصیل بھی ایک نیلے رنگ کے خوشبودار کاغذ میں موجود تھی۔

کراچی 110..... ڈھا کا 140..... فرق 30

فرق کے حساب سے کل سودا۔/6000 کا بنا

بیس فیصد کمیشن مبلغ۔/1200

کل قابل ادائیگی رقم۔/4800

نوٹ:- جہاز کا کرایہ معاف کر دیا گیا ہے (خیر سگالی کے طور پر صرف پہلی بار)

شہزاد کے چہرے پر خوشی کے تاثرات پھیل کر اور گہرے ہو گئے۔ آج کا دن اس کے لئے خاصا خوش نصیب ثابت ہوا تھا۔ اس نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا، پھر موٹر رکشہ چڑ کر سیدھا گاندھی گارڈن کے لئے روانہ ہو گیا۔ رکشہ چھوڑ کر وہ پان چباتا ہوا اندر داخل ہوا، پھر ایک لمبا راؤنڈ لے کر اس طرف آ گیا، جہاں ملازموں کے رہائشی کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ اس نے ایک بار پھر ادھر کا جائزہ لیا، پھر نمبر کے مکان کا بوسیدہ دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ ایک منٹ بعد ہی دروازے پر گارڈن کا بوڑھا مالی نظر آیا۔

”کیا حال چال ہیں بشیر چاچا؟“

”بس..... گزر بسر ہو رہی ہے جیسے تیسے۔ مہنگائی نے کمر توڑ رکھی ہے۔“

”یہ لفافہ سیٹھ تک پہنچا دینا۔“ شہزاد نے جیب سے لفافہ نکال کر بشیر مالی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”دس پرسنٹ نکالنے کے بعد پورے چار ہزار تین سو بیس روپے موجود ہیں۔ چاہو تو گن کر اپنا اطمینان کر لو۔“

”سیٹھ جانتا ہے کہ میں بے ایمان نہیں ہوں۔“ مالی نے لفافہ لے کر اپنے لمبے میلے

گرتے کی جیب میں ڈال لیا، پھر بولا۔ ”تمہارا تو یہ پہلا پھیرا ہے اس لئے شاید تمہیں بھروسہ نہیں ہے۔“

”ایک بات پوچھوں بشیر چاچا؟“ شہزاد نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد دبی زبان میں کہا۔ ”کیا میں سیٹھ سے براہ راست مل سکتا ہوں؟“

”جسے میں نے آج تک خود کبھی نہیں دیکھا، بھلا اس کی ملاقات اور کسی سے کیسے کر سکتا ہوں؟“

”پھر یہ لفافہ اس تک کیسے پہنچے گا؟“ شہزاد نے بشیر مالی کو جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

”یہ تو میں نہیں جانتا لیکن ایک خاص جناور (جانور) کا نام لے کر جو بھی آئے گا، میں یہ لفافہ اسے دے دوں گا۔“

”جانور کا نام کیا ہے؟“

”غریب ضرور ہوں میرے بھائی! لیکن بے ایمان نہیں ہوں۔“ بشیر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”مجھے درمیان جو دو پیسے بچ جاتے ہیں، وہی میری ایمانداری کی قیمت ہوتی ہے۔“

”کیا لفافہ کسی خاص دن وصول کیا جاتا ہے؟“

”نہیں۔ کبھی کبھی دو دن میں کوئی بندہ بشر آ جاتا ہے اور کبھی کبھی کوئی پلٹ کر نہیں

پوچھتا۔“

”تمہاری اور سیٹھ کی ملاقات کس طرح ہوئی تھی؟“

”ہو سکتا ہے اسی طرح ہوئی ہو جس طرح تم سے ہوئی ہو۔“ بشیر نے کھانتے ہوئے

جواب دیا، پھر مزید کوئی بات کئے بغیر اندر چلا گیا۔

شہزاد اٹھٹلا ہوا دوبارہ کتھرے میں بند جانور کی طرف آ گیا۔ وہ اس لڑکی کے بارے میں

بڑی سنجیدگی سے غور کر رہا تھا جو ایک چھٹی والے دن اس سے کلفٹن کے ساحل پر ٹکرائی تھی۔

دو مہینے پہلے کی بات تھی، اسی نے شہزاد کو آمدنی بڑھانے کی خاطر لائن دی تھی۔ باپ سے

ملاقات کے ایک ہفتے بعد اسے اسی لڑکی کی ملاقات کے حوالے سے ایک فون موصول ہوا تھا،

وہ کسی مرد کی کال تھی، کسی ایسے شخص کی کال، جسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ صرافے میں کام کرنے

کے علاوہ کبھی کبھی کیریئر (Carrier) کا کام بھی کرتا ہے۔ اسی نے اسے عبدالکریم سے ملنے

کے علاوہ ضروری ہدایات دی تھیں، ساتھ ہی اس بات کی دھمکی بھی دی گئی تھی کہ اگر اس نے

انکار کیا تو اس کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اس کے بارے میں خاصی تفصیل

سے بہت کچھ جانتا تھا۔ اس فون کے بعد شہزاد نے اس لڑکی کو شہر میں تلاش کرنے کی ہر ممکن

”ایک مشورہ دوں؟“

”کوئی نامعقول بات ہی ہوگی۔“

”کیا ہم پانٹر شپ میں کاروبار نہیں کر سکتے؟..... میرا مطلب ہے کہ تم کو تمہارے سر اعلیٰ کی طرف سے جو وسیع اختیارات ملے ہوئے ہیں، ہم اسے مل جل کر کیش کر سکتے ہیں۔“

”بکومت۔“ میں نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تمہارا شمار نہایت دیانت دار اور با اصول افراد میں کیا جاتا ہے۔ البتہ خوب صورت لڑکیوں کے سلسلے میں تم بہت زیادہ ندیدے واقع ہوئے ہو۔“

”صرف ونڈو شاپنگ کی حد تک۔“

”کبھی کبھی بد پرہیزی کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔ البتہ شادی کے بعد اپنے جملہ حقوق بحق بیگم محفوظ کر دینا۔ اس دور میں یہ بھی بڑی بات ہے۔“

”کب مل رہے ہو؟“

”بہت جلد۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم سے دو ایک بہت ضروری باتیں بھی کرنی ہیں۔“

پھر چند رسمی باتوں کے بعد میں دفتر کے لئے روانہ ہو گیا!

❖.....❖.....❖

شہزاد کے جانے کے کوئی چار گھنٹے بعد ایک دوہرے بدن کا شخص باغیچے میں ٹہلتا ہوا مالی کے گھر پہنچا تھا۔

”سلام بشیر چاچا! اور سناؤ کیا حال چال ہے؟“

”سب رب کا شکر ہے، جو گاڑی چلا رہا ہے۔ لیکن آپ کون ہو؟“ بوڑھے مالی نے نودار کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے کچھ خاص پودوں کے بیج حاصل کرنے ہیں۔“

”بیج یہاں نہیں، دفتر میں ملتے ہیں۔“

”مگر مجھے معلوم ہوا کہ آپ سے حاصل کیا ہوا بیج زیادہ کارآمد ہوتا ہے، دفتر میں پیکٹ میں بند بیج کی زندگی گھٹ جاتی ہے۔“

”بیج کہا آپ نے، مگر.....“

”فکر مت کرو، چاچا! میں گورنمنٹ کا آدمی نہیں ہوں، پھول پودوں کا شوق جنون کی حد تک ہے، اسی لئے خاک چھانتا ہوا آپ کے مکان تک آ گیا۔“

”میرے پاس ہر قسم کے بیج نہیں ہیں۔“ بوڑھے مالی نے جواب دیا۔ ”میزن کے

کوشش کی تھی، لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ بہر حال پہلے ہی کام میں اسے چار سو اسی روپے کا منافع ہوا تھا۔ آئندہ اس سے زیادہ کی امید تھی، اس کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسے کیریئر کے خطرناک کام سے چھٹکارے کی امید بھی ہو چلی تھی، جس میں رسک بہت زیادہ اور کمیشن صرف پانچ پر سینٹ تھا۔

❖.....❖.....❖

میں گھر سے دفتر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ سرور خان کا فون آ گیا۔

”تمہارا کام حسب معمول ہو گیا ہے۔“

”گڈ!“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”میری طرف سے اس بات کی بھی مبارکباد قبول

کر دو کہ تم بہر حال شاہینہ کوششے میں اتارنے میں کامیاب ہو گئے۔“

”میں نے اس سے وہی کچھ کہا تھا، جو تم نے بتایا تھا۔“

”اور کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟“

”کوئی ایسے کانٹے کی بات، جو اس کے حلق میں اٹک کر رہ جائے۔“

”فکر مت کرو۔ اب وہ تمہارا ہر مطالبہ پورا کرنے پر خوشی خوشی آمادہ ہو جائے گی۔“

”لیکن وہ ہے کون؟ کیا واقعی تمہاری ہی ہے یا جھوٹ بول رہی تھی؟“

”تمہاری رہتی ہے، لیکن اس کے اپارٹمنٹ پر جانے کی حماقت کبھی نہ کرنا۔“

”کوئی خاص وجہ؟“

”در اصل اس کے والدین کسی دوسرے شہر میں رہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ یہاں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آئی ہے، بڑے باپ کی بیٹی ہے، اسی لئے ایک پوش علاقے کے قیمتی فلیٹ کو انورڈ کر رہی ہے۔ ہوٹل کی ملازمت اس نے محض دنیا دکھاوے کی خاطر اختیار کر رکھی ہے۔“

”لیکن روز روز ڈھاکا ٹروٹ پر سفر کرنے والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ جب کہ آج تک اسے کئی ایجنسیوں نے کسی نہ کسی بہانے سے چیک کیا، لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔“ سرور خان نے پوچھا۔ ”کیا ڈھاکا میں اس کا کوئی چکر چل رہا تھا؟“

”اس بات میں تھوڑی سی ترمیم کر لو۔“ میں نے سرور خان کی بے چینی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”کوئی ایسا ہی چکر ہے جس میں اُلجھ کر وہ ڈھاکا آنے جانے پر مجبور ہو گئی ہے۔“

”بلیک میلنگ۔“

”ٹھیک سمجھ۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بڑے باپ کی ماڈرن لڑکیاں جب دوسرے شہر جا کر تنہا رہتی ہیں اور مکمل طور سے آزاد ہوتی ہیں تو اکثر یہ آزادی انہیں بہت مہنگی پڑتی ہے۔ جس کا احساس انہیں اس وقت ہوتا ہے جب پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔“

فاصلے سے اس کا تعاقب کرتی رہی، پھر اسٹیرنگ پر نظر آنے والے ڈرائیور نما شخص نے ایک ہاتھ سے واک ٹاکی کا سوئچ آن کرتے ہوئے دلی زبان میں کہا۔

”ہیلو..... ہیلو..... جے، اے، کے۔ پلیز کم آن دی لائن۔ اور۔“

”جے اے کے اسپیکنگ۔ کیا خبر ہے؟ اور۔“

”میں پٹرول پمپ پر گاڑی روک دوں گا۔ اس کے بعد تمہاری ڈیوٹی شروع ہو جائے گی، شکار رکشے پر ہے، سفید پتلون اور آسمانی رنگ کی ٹی شرٹ میں۔ رکشے کا نمبر کے اے آر ڈبل تھری ڈبل فور ہے۔ سفید پتلون اور آسمانی رنگ کی ٹی شرٹ والا جسمانی اعتبار سے سینڈو بھی کہا جاسکتا ہے۔ اور۔“

”گٹ یور پوائنٹ۔ تم پٹرول پمپ پر رک جاؤ، میں نے مطلوبہ رکشہ دیکھ لیا ہے۔ اور اینڈ آل۔“

پھر جب رکشہ مین روڈ سے گزر کر آگے بڑھا تو ایک موٹر سائیکل، جسے ایک چھیرے ٹائپ کا آدمی چلا رہا تھا، اس کے تعاقب میں چل پڑی۔ پیچھے کیئر بیک پر ایک میلی سی چھابڑی رکھی تھی، جس سے ایک بڑی مچھلی کا سر جھانک رہا تھا اور مچھلی کی بساند بھی دور دور تک پھیل رہی تھی۔ رکشہ تقریباً دو فرلانگ آنے جانے کے بعد ایک پان والے کی دکان پر رک گیا، جو اس پتلی سڑک کے عین کونے پر واقع تھی، جو بل کھاتی اندر ہی اندر پورے صرائے میں گھومتی پھرتی آگے نکل جاتی تھی۔ موٹر سائیکل والے نے بھی اپنی گاڑی دکان کے قریب ہی روک دی۔ دوہرے بدن والے نے دکان پر رک کر ایک پان کھایا، پھر پلٹا ہی تھا کہ چھیرا نما شخص اس کے آگے آگیا۔

”ماچس ہوگی، بڑے صاحب؟“

”ابے..... کے، کنویں کے پاس پہنچ کر دوسروں سے پانی کی بھیک مانگ رہا ہے۔“ دوہرے بدن والے نے ایک بھونڈی سی گالی چٹختے ہوئے تحارت سے کہا۔ ”سالا بلی کی طرح راستہ کاٹ رہا ہے۔ نان سینس۔“

”اوائے صاحب! گالی مت نکالنا۔ نہیں تو میں تمہارا سارا گٹ پٹ دوسرے راستے سے نکال دوں گا۔“

پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے الجھ پڑے تھے۔ لوگوں نے بچاؤ کرا دیا، لیکن مچھلی والا ابھی تک دوہرے بدن والے کو مغالطات سن رہا تھا۔ دوہرے بدن والا بھی غصے میں تھا، لیکن شاید یہ موقع ہاتھ پائی کا نہیں تھا، اس لئے وہ کپڑے جھاڑتا اور بڑبڑاتا ہوا اپنے راستے پر چل پڑا۔ اب اس کے تعاقب میں بمبئی کٹ ڈبل پاکٹ والا پاجامہ اور گرتہ پہنے ایک مین ٹائپ شخص تھوڑے فاصلے سے چل پڑا تھا۔

پودوں کے کچھ بیج ہیں اور دو ایک پھلوں کے بھی، لیکن میں آپ سے اس کی کوئی اُجرت نہیں لوں گا۔“

”وہ کیوں؟“

”کئی برسوں سے یہاں پھول پودوں اور درختوں کی رکھوالی اور دیکھ بھال کر رہا ہوں، ایک محبت سی ہو گئی ہے مجھے ان سے۔ اس لئے میں اپنا پیار نہیں بیچوں گا۔ تم چاہو تو ایک دو قسم کے کچھ بیج تمہاری نذر کر سکتا ہوں۔“

”اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔“ دوہرے بدن والے نے شانے اُچکاتے ہوئے کہا، پھر مسکرا کر بولا۔ ”گھاس سے دوستی کر لو گے تو کھاؤ گے کیا۔“

”جسے اصلی جڑی بوٹیوں کی پہچان ہو، وہ گھاس نہیں کھاتا جناب!“

”اب تم نے ایک مطلب کی بات کی ہے۔“ دوہرے بدن والے نے قدرے مدہم آواز میں جواب دیا۔ ”مجھے دراصل شیر کی چربی ہی درکار ہے۔“

”نمیرے پاس شیر کی چربی نہیں ملتی۔“

”پھر پورا شیر ہی میرے حوالے کر دو۔“ اس بار دوہرے بدن والے کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ”چربی خود ہی نکال لوں گا۔ یہ لو تمہارا بیٹگی۔“ جملے کے اختتام کے ساتھ ہی اس نے سو کے دونٹ نکال کر خاموشی سے شیر کی مٹھی میں دبا دیے۔

”آج کل جانوروں کی دیکھ بھال بھی ٹھیک طرح نہیں ہو رہی ہے۔“ بشیر نے نوٹ وصول کرنے کے بعد مخصوص جملہ دہرایا۔

”ڈاکٹروں کا بھی اپنا پیٹ ہوتا ہے اور پیٹ بھرنے کے لئے ایندھن کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا سمجھے؟“

”اب سمجھ گیا۔“ بشیر نے اطمینان کا سانس لیا، پھر جو لفافہ شہزاد نے اسے لا کر دیا تھا، اسے اندر سے لا کر دوہرے بدن والے کو دیتے ہوئے کہا۔ ”جگہ چھوڑنے سے پہلے کتنی کر کے اپنا اطمینان کر لو، بعد کی ذمہ داری میرے اوپر نہیں ہوگی۔“

”فکر مت کرو، کچھ کمی بھی ہوئی تو میں اپنی جیب سے ملا دوں گا..... اچھا چاچا! پھر ملاقات ہوگی، رب را کھا۔“

دوہرے بدن والے نے مالی کے کوارٹر تک جانے کے لئے خاصا لمبا روٹ اختیار کیا تھا۔ وہ سیٹھ کا دست راست تھا، اس لئے اپنے سائے سے بھی محتاط رہنے کا عادی تھا۔ باغیچے کے دوسرے گیٹ سے نکلنے کے بعد اس نے ایک رکشہ پکڑا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن وہ سفید رنگ کی گاڑی اس کی نظر میں نہیں آسکی تھی، جو اس کے رکشے کے چلنے کے ساتھ ساتھ ہی حرکت میں آئی تھی۔ آنکھوں کے ہسپتال تک سفید رنگ کی گاڑی ایک محدود



ٹھیک دو بجے میرے سپاہی ستار نے آکر مجھے کسی فون کال کی اطلاع دی اور میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں آگیا، جہاں ایک کلرک ہمہ وقت فون اٹینڈ کرنے کی ڈیوٹی پر تعینات رہتا تھا۔ کلرک کے اس کمرے کے بارے میں بڑی سختی کے ساتھ یہ احکامات تھے کہ وہاں کلرک کے علاوہ صرف وہی شخص جاسکتا ہے، جس کی کال ہو اور جتنی دیر کوئی افسر فون پر بات کرے، اتنی دیر تک کلرک کو باہر دراندھے میں رہنے کے ساتھ اس بات کا بھی سختی سے خیال رکھنا پڑتا تھا کہ کوئی تیسرا شخص اندر ہونے والی گفتگو کی بھنک نہ لے رہا ہو۔ یہ احکامات ابھی حال ہی میں نافذ ہوئے تھے۔ کچھ افسران نے کلرک کی ویکیلی کانفرنس میں اس بات کی شکایت کی تھی کہ ان کالز کو اور ہیئر (Over Hear) کیا جاتا ہے۔ بہر حال میں کمرے میں داخل ہوا تو کلرک سلام کرتا ہوا باہر چلا گیا۔

”ہیلو!“ میں نے ریسپور اٹھا کر گھڑی پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے ماؤتھ پیس میں کہا۔

”ایف۔ اے۔ ٹو بول رہا ہوں۔“

”کیا بنا؟“

”اس بار بوبی نے ڈیوٹی انجام دی ہے۔“ دوسری جانب سے کہا گیا۔ ”وہ اسی کے لئے کام کرتا ہے، جس پر آپ کا شبہ تھا۔“

”مستقل آدمی ہے؟“

”جی ہاں۔ زیادہ تک کاؤنٹر پر ہی سبزی مین کے فرائض انجام دیتا ہے، سیٹھ کا بہت خاص آدمی ہے۔“

”شہزاد کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟“ میں نے بڑی مدہم آواز میں دریافت کیا۔

”آج کل وہ بھی اسی پارٹی کے لئے کام کر رہا ہے۔“

”تمہیں پکا یقین ہے؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”ایک دم سائلڈ بات ہے، سر!“

”ٹھیک ہے۔ تم بوبی پر نظر رکھو۔“

”آپ سے ایک ضروری کام اور بھی تھا، سر!“

”گھر پر فون کرنا۔ رات گیارہ بجے کے بعد۔“ میں نے ریسپور رکھا، پھر دوبارہ ریٹائرنگ روم میں آگیا، جہاں میرے دوسرے ساتھی موجود تھے۔

”اور سناؤ، شرلاک ہومز کے بھتیجے!“ اکبر خان نے جو اپنے زمانے کا ہاکی کا مانا ہوا نفل

بیک رہ چکا تھا، مجھے مسکراتے ہوئے مخاطب کیا۔ ”کوئی نئی توپ چلانے کی پلاننگ کر رہے ہو؟“

”اب کی بار توپ نہیں، سب میرین (Submarine) چھوڑنے کا ارادہ ہے۔“ میں نے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

”ذرا احتیاط سے کام لیتا، برخوردار!“ صابر صاحب جو مجھ سے بہت سینئر اور میرے رشتے دار ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جعفری صاحب کے دیرینہ ساتھیوں میں سے تھے، زیر لب مسکراتے ہوئے مخاطب ہوئے۔ ”سب میرین سے بچاؤ کے لئے دشمنوں نے اب اپنے علاقے کے بارڈر پر بارودی سرنگیں بچھانے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔“

”شکریہ۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ جیسے سینئرز کی رہنمائی حاصل رہی تو آہستہ آہستہ سارے داؤ پیچ سیکھ جاؤں گا۔“

”اب زیادہ انوکھی (جاپان کا مشہور اور معروف فری اسٹائل ریسلر) بننے کی کوشش مت کرو۔“ اکبر خان نے مجھے گھورا۔ ”جس دن پہاڑ کے نیچے آگئے تو ساری شیشی دھری کی دھری رہ جائے گی۔“

”جمال احمد آج کہاں غائب ہیں؟“ جعفری صاحب نے مجھ سے دریافت کیا۔ ”کلرک صاحب انہیں کسی کام سے یاد کر رہے ہیں۔“

”کیا وہ آج دفتر نہیں آیا؟“ میں نے بناوٹی حیرت کا اظہار کیا۔ جب کہ میں جانتا تھا کہ وہ میری خاطر چھپروں کے بھیس میں ایک مطلوبہ شخص کے پیچھے لگا تھا۔

”پھر ٹو نے شروع کر دی، اداکاری۔“ اکبر خان نے جل کر کہا۔ ”ابے سدھر جا میں کہتا ہوں۔“

”کیوں..... کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟“

”جی نہیں۔“ اکبر خان نے حسب معمول مجھے چھیڑنے کی خاطر کہا۔ ”آپ تو صورت ہی سے بڑی مسکین شے نظر آتے ہیں۔ آٹو کا پٹھا تو وہ بدنصیب ہے، جو ہمارے ساتھ بچ کی طرح لگا رہتا ہے۔ ڈبل ایم اے کرنے کے بعد بھی گھاس کھود رہا ہے اور وہ بھی تم جیسے گھسیاروں کے ساتھ۔“

”میں بھی سوچ رہا ہوں کہ اسے آپ کے ساتھ رہنا چاہئے۔“ میں نے استہزائیہ انداز اختیار کیا تو اکبر خان نے جعفری صاحب سے کہا۔

”سن رہے ہو جعفری صاحب! یہ تمہاری ساری خدائی کیا کہہ رہا ہے۔“

”دفتری اوقات میں کوئی کسی کا رشتے دار نہیں ہوتا۔“

اسی وقت جمال احمد حسب معمول پتلون اور شرٹ میں لمبوس سگریٹ ہونٹوں میں دبائے اندر داخل ہوا۔ تمام اوصاف حمیدہ کے ساتھ ساتھ بس اس میں یہی ایک خرابی تھی کہ وہ چین سمو کرتا تھا۔

تھا۔

”فضول باتوں سے پرہیز کرو۔“ دوسری جانب سے تنبیہ کی گئی۔ ”میں صرف کام کی بات کرتا ہوں۔“

”اگر میں شریفانہ زندگی گزارنا چاہوں تو۔“

”انکار کرنے کا خوب صورت بہانہ ہے۔ لیکن ایک اچھی طرح سوچ لو۔“ سرد آواز میں جواب ملا۔ ”تم جس راہ کے مسافر ہو، اس میں واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔“

”کمیشن کی رقم بہت کم ہے۔ کیا اس میں اضافہ نہیں ہو سکتا؟“

”تمہاری بات پر غور کر سکتا ہوں، وعدہ نہیں کرتا۔“

”اس بار کیا طریق کار اختیار کیا جائے گا؟“ شہزاد نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”میرا

مطلب مال سے ہے، وہ مجھے کس طرح ملے گا؟“

”جس طرح پہلے ملتا رہا ہے۔ اور یہ سوچنا میرا کام ہے۔ تم صرف اپنے کام سے کام

رکھو۔“

”میں اس لڑکی سے دوبارہ ملنا چاہتا ہوں۔“

”نہیں مل سکو گے۔ اس لئے کہ تم نے اسے جس حلیے میں دیکھا تھا، وہ اس کا اپنا حلیہ

نہیں تھا۔“ اس بار بھی سرد مہری کا مظاہرہ کیا گیا۔ ”اس کے علاوہ میں اس بات کو بھی پسند نہیں

کرتا کہ میرے آدمی آپس میں بھی ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔“

”کوئی وجہ؟“

”ہاں۔ پکڑے جانے کی صورت میں جب ان کی نمٹنکی پر مختلف حربے آزمائے جاتے

ہیں تو وہ سب کچھ اگل دیتے ہیں۔“

”اگر میں خدا خواستہ پکڑا گیا تو مجھے کون بچائے گا؟“ شہزاد نے تیزی سے ذہن میں

اُبھرنے والا سوال کر ڈالا۔

”کوئی بھی نہیں۔“

”گویا قربانی کا بکرا صرف مجھے بننا پڑے گا۔“

”ایسا بھی نہیں ہے۔“ اس بار قدرے بدلے ہوئے لہجے میں جواب ملا۔ ”ہم تمہیں

بچانے کی کوشش، دور در دورہ کر کریں گے۔ اگر سزا ہو گئی تو ایک معقول رقم ماہانہ بنیاد پر تمہارے

حساب میں جمع ہوتی رہے گی، جسے تم رہائی کے بعد حاصل کر سکتے ہو۔“

”عبدالکریم نے بھی پچھلی بار ایک دو جیکٹ کی بات کی تھی۔“

”میں جانتا ہوں۔ فیصل آزادی کی سرپرستی کی وجہ سے بہت ساری آسانیاں بھی حاصل

ہیں۔ میں یہ بھی علم رکھتا ہوں کہ فیصل کے ذریعے باہر جانے والا مال کسٹم کے عملے کے لوگ

”تشریف لائیے جناب عالی حضور، فیض گنجور، صورت لنگور۔ ابھی آپ ہی کا ذکر خیر ہو رہا تھا۔“ اکبر خان جو جمال احمد سے بے حد بے تکلف تھا، مسکرا کر بولا۔ ”یہ دھواں اُڑاتا ہوا انجن بغیر ڈبوں کے کہاں سے آرہا ہے؟“

”شٹنگ (Shunting) کر کے آرہا ہوں۔“ جمال احمد نے مسکرا کر جواب دیا، پھر اکبر خان کے برابر ہی بیٹھ گیا۔

”ابھی جا کر کلکٹر صاحب سے مل لیجئے گا۔“ جعفری صاحب بولے۔ ”صبح سے دوبار آپ کو یاد کر چکے ہیں۔“

”کیا کہہ رہے تھے؟“ جمال نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

”کوئی کام نہیں بتایا۔ بس اتنا کہا تھا کہ آپ شٹنگ کر کے واپس آئیں تو آپ کا رخ ان کے دفتر کی جانب موڑ دیا جائے۔“

”سمجھ گیا۔ کوئی ڈرافٹ لکھوانا ہوگا۔“ جمال احمد نے اس بار بڑی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ پھر اگر وہ تیزی سے لپک کر بچ نہ نکلتا تو اکبر خان کا گھوما ہوا ہاتھ اس کی گدی پر پڑا ہوتا۔

”سالانہ کی اولاد۔“ اکبر خان نے مسکرا کر جعفری صاحب کو مخاطب کیا۔ ”سن رہے ہو آپ، یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟“

”اچھا..... میں ذرا کلکٹر صاحب سے مل کر آتا ہوں۔“ جمال احمد نے کہا۔ پھر اکبر خان کو دیکھ کر بذلہ سنجی سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے انہیں کوئی ضروری تقریر لکھوائی ہو۔“

اکبر خان نے اٹھنے کو ہر تولا لیکن جمال احمد تیزی سے چلا گیا۔ دونوں کے درمیان تقریباً روز ہی اسی قسم کی چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی، اکبر خان چونکہ پٹھان آدمی تھے اس لئے اکثر تھکے سے اُکھڑ بھی جاتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کے اور جمال احمد کے درمیان ہمیشہ گاڑھی ہی چھتی تھی۔

❖.....❖.....❖

فون کی دوسری گھنٹی پر شہزاد نے جو گہری فکر میں ڈوبا ایک نیم شکستہ کرسی پر بیٹھا بیڑی کا دھواں اُڑا رہا تھا، ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ ”میں تم سے بہت خوش ہوں۔“ دوسری جانب سے وہی آواز ابھری جس نے لڑکی کے حوالے سے اسے عبدالکریم سے ملنے کی ہدایت کی تھی۔ ”تمہارے چاروں پھیرے بہت کامیاب رہے۔ اس بار عبدالکریم سے دو جیکٹ کی بات کر لو۔“

”کیا میں آپ سے براہ راست نہیں مل سکتا؟“

”نہیں۔“ خشک لہجے میں جواب ملا۔ ”میں چھوٹے لوگوں سے ملاقات نہیں کرتا۔“

”کیا وہ لڑکی اس شہر میں نہیں ہے جس نے ہمیں ملانے کے لئے پل کا کام انجام دیا



بہر حال، کلکٹر کی جانب سے مجبوروں کے بارے میں بڑا سخت حکم تھا کہ نہ تو ان کا نام کہیں ظاہر کیا جائے اور نہ ہی کسی بھی بڑے افسر کے سامنے پیش کیا جائے۔

بہر حال، عبدالکریم اس وقت میرے ساتھ فرسٹ فلوور پر میرے اور جمال احمد کے مشترکہ کمرے میں موجود تھا، جہاں بنے ہوئے کمرے رہائشی مقصد کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ غلطی منزل پر ہمارا دفتر تھا۔ جمال احمد میرا بہترین دوست اور ساتھی تھا، عام طور پر ہم مل جل کر ہی کسی کس کو اس کے انجام تک پہنچاتے تھے۔ ہمارے درمیان کبھی کوئی راز نہیں رہتا تھا، اس لئے کہ جمال احمد کو محکمے کے ان افسران میں شمار کیا جاتا تھا، بقول شاعر جن کے دامن پر فرشتے بھی سجدہ کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی کئی ہوئی ہر بات کلکٹر کے لئے بھی ایک سند کا درجہ رکھتی تھی۔ جمال احمد کو اس بات کا شبہ ضرور تھا کہ عبدالکریم محض میرا دوست نہیں ہے لیکن اس نے مجھ سے قریب تر ہونے کے باوجود عبدالکریم کے سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ اس وقت بھی جب میں عبدالکریم کے ساتھ بیٹھا اس کے آٹو پارٹس کے کاروبار کی باتیں کر رہا تھا تو جمال احمد اٹھ کر غلطی منزل پر چلا گیا۔

”میرا خیال ہے کہ جمال صاحب جیسا کوئی دوسرا آپ کے پورے محکمے میں نہ ہو گا۔“ عبدالکریم نے جمال احمد کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ”خاص طور پر ہمیں بدلنے میں ایسا ملکہ رکھتے ہیں کہ شاید خود بھی اپنے آپ کو نہ پہچان سکیں۔“

”سیٹھ شفیع کے بارے میں تمہاری کیا رپورٹ ہے؟“

”رپورٹ کیا۔ سب جانتے ہیں کہ وہ دوبار آپ کے ہاتھوں مار کھانے کے باوجود ابھی

تک اسی دھندے سے چپکا ہوا ہے، البتہ اب اس نے اپنا طریق کار بدل دیا ہے۔“

عبدالکریم نے تھوڑے وقفے کے بعد کہا۔ ”میرا ذاتی خیال ہے کہ شہزاد بھی میرے اور

آپ کے ذریعے اسی کا مال ادھر سے ادھر کر رہا ہے۔“

”کیا تمہیں یقین ہے؟“ میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”پہلے نہیں تھا، لیکن اب ہے۔“ عبدالکریم نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔ ”میرا خیال

ہے کہ میرے بارے میں سیٹھ شفیع کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا کہ میرے اور آپ کے درمیان

کس قسم کی دوستی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو شہزاد جیسے دو کوڑی کے چمکورے میری دکان پر

چڑھنے کی ہمت بھی نہ کرتے، اس کے علاوہ اس پاگل کے بچے نے مجھے جو دھمکی دی تھی، اس

سے بھی میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ پھر میں نے بھی اپنے وفادار اور آزمائے ہوئے گھوڑے میدان

میں چھوڑ دیئے اور کامیاب رہا۔“

”کوئی خاص بات؟“

”شہزاد کا جو مال میں آپ کے ذریعے ڈھاکا بھجوا رہا ہوں وہ بھی سیٹھ شفیع کا ہوتا ہے۔“

بڑی خوب صورتی سے جہاز کے کسی عملے تک پہنچاتے ہیں۔“

”ایسی صورت میں آپ براہ راست عبدالکریم کو بھی اپنے جال میں پھانس سکتے تھے،

مجھے مفت کامیشن دینے میں۔“

”فضول باتیں مت کرو۔“ دوسری جانب سے سرد لہجہ اختیار کیا گیا۔ ”مجھے دوبارہ کبھی کسی

معاملے میں نصیحت کرنے کی کوشش مت کرنا، ورنہ میرا اشارہ ہی تمہیں جیل کی سلاخوں کے

پیچھے بھیجنے کے لئے کافی ہوگا۔“

”اب میں کسی اور کے لئے نہیں، صرف آپ کے لئے کام کرتا ہوں۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم صرف میرے لئے کام کرو۔“

”کب تک؟“

”جب تک میں تمہاری چھٹی نہ کر دوں۔“

”میرے خلاف آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں.....“

”بحث مت کرو۔“ شہزاد کی بات کاٹتے ہوئے سختی سے جواب دیا۔ ”کیا تم مجھے آزمانا

چاہتے ہو؟ اگر یہ بات ہے تو پھر تم میرے کام کرنے سے انکار کر کے تماشا دیکھ سکتے ہو۔

چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تمہیں میری طاقت کا اندازہ ہو جائے گا۔“

”مال کب تک مجھے ملے گا؟“ شہزاد نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے سوال کیا۔

”دو روز بعد۔ وقت اور جگہ کا تعین کرنے کے بعد تمہیں مطلع کر دیا جائے گا۔ اور کچھ

پوچھنا چاہتے ہو؟“

”نہیں۔“ شہزاد نے جھلک کر کہا۔ پھر دوسری جانب سے کسی گفتگو کا انتظار کئے بغیر ہی

ریسیور کو بڑی جھلک ہٹ سے کریڈل پر رکھا اور تیزی سے اٹھ کر مختصر سے کمرے کے فرش کی

سینہ کوئی کرنے لگا۔ اس کا ذہن سیٹھ کے بارے میں بھول بھلیوں سے نکل کر اصل منزل تک

پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے پیشتر وہ مختلف پارٹیوں کے لئے کام کر چکا تھا، لیکن ان میں

سے کوئی ایسا نہیں تھا، جس پر وہ شبہ کر سکتا!!



عبدالکریم کے بارے میں، میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، وہ ہماری خفیہ زبان میں ایف

اے ون تھا۔ یعنی میرا نمبر ون مجر۔ ہم تمام انٹیلی جنس آفیسروں کو دو دو خبر رکھنے کی اجازت تھی،

جن کا کوڈ نمبر عام طور پر انسپکٹر کے نام کے ساتھ ون اور ٹو ہوا کرتا تھا۔ ان خبروں کی تنخواہ براہ

راست انسپکٹر بغیر کسی دستخط کے وصول کرتا تھا۔ اس کی ادائیگی سیکرٹ فنڈ سے ہوتی تھی۔ اکثر

گھاگ قسم کے پرانے افسران ایسی رقم بھی خبر کے نام پر ہڑپ کر جاتے تھے اور انک شوی

کے لئے مہینے دو مہینے میں ایک آدھ کس بھی اپنے تجربے کی بنیاد پر کر لیا کرتے تھے۔

”تمہیں اس کا یقین کس طرح ہے؟“

”آپ بوبی کو ضرور جانتے ہوں گے۔ وہی جو سینڈو کے نام سے پورے صرائے میں مشہور ہے۔ پہلے وہ کسی اور کے لئے کام کرتا تھا، ایک نمبر کا حرامی اور لیکر کالج ہے لیکن اپنی لائن میں استاد ہے۔ اس لئے اب سیٹھ شفیع نے اسے باقاعدہ ملازم رکھ لیا ہے، کمیشن الگ سے دیتا ہے۔“

میں نے جان بوجھ کر ایسا ظاہر کیا جیسے وہ تمام اطلاعات میرے لئے نئی ہوں جب کہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ سینڈو یا بوبی کو میں نے ہی ایک واقف کار کی حیثیت سے سامنے آئے بغیر عبدالکریم کے بارے میں بتایا تھا۔ شہزاد اور بوبی میں پرانی دوستی تھی، اس لئے بوبی نے خود سامنے آنے کے بجائے شہزاد کو عبدالکریم کے پیچھے لگا دیا، مجھے یہ بھی علم تھا کہ اس کاروبار کے پیچھے سیٹھ شفیع کی شخصیت ہی کام کر رہی تھی لیکن میں ان تمام ذرائع اور نقل و حرکت کو ٹریپ کرنا چاہتا تھا، جو اپنائے جا رہے تھے۔ مثلاً گارڈن کے بوڑھے مالی کے ذریعے روپے کالین دین ایک ایسا خوب صورت طریقہ تھا جس پر عام طور پر شک و شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ بوبی نے براہ راست شہزاد کو عبدالکریم کے پیچھے نہیں لگایا تھا، اس ضمن میں اس نے شاہینہ کی خدمات حاصل کی تھیں جو دراصل سیٹھ شفیع کی منظور نظر تھی، اس کے ذمے کوئی خاص کام نہیں تھا۔ صرف یہ دیکھنا تھا کہ مال ڈھاکا پہنچ کر ایئر پورٹ سے باہر نکلتا بھی ہے یا نہیں۔ شاہینہ کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی تھی کہ کئی بار کیریئر یہ بہانہ کر کے مال میں ہیرا پھیری کر چکے تھے کہ یا تو مال پکڑا گیا یا پھر پکڑے جانے کے بعد فتنی فتنی کرنے کے بعد ان کو کسٹم کلیئرنس دیا گیا تھا۔ شاہینہ چونکہ مقامی ہوٹل میں ریپشنسٹ کے فرائض پر مامور تھی، اس لئے بار بار اس کے ڈھاکا آنے جانے پر کسی کو شبہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار اس نے ڈھاکا ایئر پورٹ پر ایک بڑے کسٹم آفیسر کی جرح پر یہی بتایا تھا کہ وہ ڈھاکا میں نئے ہوٹل کے تعمیری کام کی رفتار دیکھنے کی خاطر چکر لگاتی رہتی ہے۔ یہ بات درست بھی تھی۔ اس لئے کہ وہ کراچی کے جس ہوٹل سے منسلک تھی، اس کی ایک براچ مشرقی پاکستان میں بھی زیر تعمیر تھی۔

مجھے سیٹھ شفیع کے بارے میں بھی علم تھا کہ وہ دوسرا کیس میرے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد کچھ عرصے تک خاموش بیٹھا رہا، پھر اس نے نئے نئے تجربات کرنے شروع کر دیئے تھے۔ میری نظر میں سیٹھ شفیع کے وہ سارے کارندے تھے جو کسی نہ کسی طرح سے ناجائز تجارت میں اس کی ٹیم کے اہم ممبر تھے۔ لیکن میں نے یہ تمام باتیں عبدالکریم سے بھی پوشیدہ رکھی تھیں۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ عبدالکریم نے میری خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا کسی ماسٹر پلان کا نقشہ ذہن میں بنایا جا رہا ہے؟“

”میں سیٹھ شفیع پر اس بار ایسا ہاتھ رکھنا چاہتا ہوں کہ میرے جال سے باہر نہ نکل سکے لیکن.....“

”جعفری صاحب کا خیال آ جاتا ہے، کیوں؟“ عبدالکریم نے مسکرا کر کہا، پھر خود ہی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”دراصل یہ جعفری صاحب بڑے نیک اور سیدھے سادے انسان ہیں۔ سیٹھ شفیع کے دو بار پکڑے جانے کے باوجود اسے بے قصور سمجھتے ہیں اس لئے کہ وہ سیٹھ غفار بیڑی والا کے ذریعے سیٹھ شفیع سے ملے تھے اور سیٹھ غفار بہر حال ایک ایماندار اور با اصول آدمی ہے، آج بھی مارکیٹ میں اس کے نام کا سکہ چلتا ہے۔“

”تمہارا اندازہ غلط نہیں ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ اس بار کیس کرتے وقت میں جعفری صاحب کو بھی کسی طرح اپنے ساتھ رکھوں تاکہ سیٹھ شفیع کے بارے میں ان کی خوش فہمی ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے۔“

”شہزاد نے اس بار دو جیکٹ پارسل کرانے کا وعدہ کیا ہے۔“ عبدالکریم نے آہستہ سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ آج کل میں وہ مال بھی میرے حوالے کر دے۔“

”خالد اور ثار کو جانتے ہو؟“

”ثار چھوٹے چھوٹے کام کرتا ہے، اس لئے اس پر ہاتھ ڈالنا آپ کی شان کے خلاف ہے، البتہ خالد کبھی کبھی لمبے کام کرتا ہے۔“ عبدالکریم نے کہا۔ ”آپ جب کہیں، خالد کا مال پکڑو ادوں۔“

”نہیں۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”ایک وقت میں، میں صرف ایک ہی کام کرتا ہوں اور وہ بھی کسی بڑی پچھلی پر جال ڈالنے کا۔“

”اس وقت آپ جو خدمت قوم کی کر رہے ہیں، کیا اس کا علم بھی کلکٹر صاحب کو ہے؟“

”ہاں۔ ان کی مرضی کے خلاف میں ایسے معاملات میں کبھی ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھاتا۔“ میں نے کہا۔ ”کسٹم والوں سے میرے جو وسیع تعلقات ہیں، وہ بھی کلکٹر صاحب ہی کی وساطت سے ہوئے ہیں۔“

”سنا ہے کہ آج کل آپ کے دوست سرور خان، شاہینہ کے لئے دانت تیز کر رہے ہیں۔“ عبدالکریم نے مسکرا کر دریافت کیا۔

”کیا تمہیں وقت اور اس جگہ کا علم پہلے سے ہو جاتا ہے جہاں شہزاد یا اس کا کوئی کارندہ مال پہنچاتا ہے؟“ میں نے عبدالکریم کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”وقت کا تعین شہزاد ہی کرتا ہے، لیکن جگہ طے کرنا میرا کام ہے۔“

”اپنے منہ سے اپنی تعریف کر رہے ہو، اس لئے.....“

جمال احمد نے بدستور مسکراتے ہوئے کہنا چاہا لیکن اس نے اکبر خان کے چہرے پر جلالی سرخی کے علاوہ یہ بھی دیکھ لیا کہ اس کا ہاتھ پاؤں کے جوتے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ چنانچہ قیل اس کے کہ بات طول پکڑتی، وہ لپک کر ریٹائرنگ روم سے باہر چلا گیا۔ دونوں کے درمیان اس قسم کے حادثات اکثر رونما ہوتے تھے، لیکن ان کی دوستی میں کوئی فرق نہیں آتا تھا!



انسپکٹر سردور خان اس وقت ساحل سمندر پر شاہینہ کے ساتھ ایک قدرے دیران گوشے میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ شاہینہ کو اس نے فون کر کے ساحل پر آنے کو کہا تھا اور اس کی اس دعوت کو شاہینہ نے کسی جھجک کے بغیر قبول کر لیا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہ سردور خان سے خاصی بے تکلف بھی ہو گئی تھی۔

”مجھے امید تھی کہ تم میری درخواست کو رد نہیں کرو گی۔“

”کیا صرف اتنی سی بات کہنے کو یہاں بلایا تھا؟“ وہ ایک ادا سے اپنی زلفوں کی بکھری لٹوں کو سمیٹ کر پچھلی طرف جھٹکتے ہوئے بولی۔ ”آپ فون پر بھی طویل گفتگو کر سکتے تھے۔“

”فون پر تمہارا یہ قرب اور لباس سے پھوٹنے والی مہک سے محروم ہو جاتا۔“ سردور خان نے اسے پیار بھری نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”تم واقعی ایسی چیز ہو جسے بہت قریب سے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔“

”میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں یا آپ صرف میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟“

”تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ ویسے میں اپنی جگہ پوری طرح سے سنجیدہ ہوں۔“

”میں تھوڑا بہت آپ کی پرائیویٹ زندگی کے بارے میں بھی علم رکھتی ہوں۔“ شاہینہ

شوشی سے بولی۔ ”سچ بتائیے، آپ یہ جملہ مجھ سے پہلے اور کتنی لڑکیوں سے کہہ چکے ہیں؟“

”آئی سی۔ گویا آپ کو میری نجی مصروفیات کے بارے میں بھی خاصی معلومات ہیں۔“

”جی ہاں.....“ وہ پیار سے مسکرا کر بولی۔ ”بالکل اسی طرح جس طرح آپ میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔“

”میرا خیال ہے تم جس راستے پر دوڑ رہی ہو، اس پر کسی وقت کسی سنگ میل سے ٹھوکر کھا کر گر بھی سکتی ہو۔“

”کیا آپ ایسے موقع پر مجھے گرنے سے بچانے کی خاطر میری مدد نہیں کریں گے؟“

شاہینہ نے سردور خان کے کچھ اور قریب ہوتے ہوئے سرسراہی آواز میں کہا۔

”شاید میرے لئے اس وقت یہ ممکن نہ ہو۔ اس لئے کہ میری سرکاری حیثیت میری نجی زندگی میں کبھی رکاوٹ بننے کی کوشش نہیں کرتی۔“

”گڈ.....!“ میں نے خوشی کا اظہار کیا۔ ”پھر تم مجھے ایک دو گھنٹے پہلے بھی مطلع کر سکتے ہو۔“

”آپ کے ذہن میں کیا پلاننگ ہے؟“

”میں چاہتا ہوں کہ کسی طرح سب کو ایک ساتھ ہی ٹریپ کیا جائے اور.....“

”اور کیا؟“

”اور سیٹھ شفیق بھی رنگے ہاتھوں پکڑا جائے۔“ میں اصل جملے سے پہلو تہی کرتے ہوئے بولا۔

”یہ ذرا مشکل ہے۔“

”بہر حال تم شہزاد سے معاملہ طے ہو جانے کے بعد مجھے فوراً اس کی اطلاع دو گے۔“

عبدالکریم کے جانے کے بعد میں خاصی دیر تک آئندہ کے لائحہ عمل پر غور کرتا رہا، پھر نیچے آ گیا، جہاں جمال احمد اور اکبر خان کے درمیان اس بات پر گرم بحث ہو رہی تھی کہ انارکلی کو شہزادہ سلیم سے جدا کرنے کی خاطر دیوار ہی میں کیوں چنوا لیا گیا۔

”اس زمانے میں تم پیدا نہیں ہوئے تھے، اس لئے دیوار میں چنوانے کا فیصلہ کر لیا ہو گا۔“ اکبر خان نے مسکرا کر کہا۔ ”ورنہ انارکلی کو تم جیسے کوڑھ مغز کے پلے باندھ دیا جاتا اور غریب اپنی موت آپ ہی مر جاتی۔“

”کیوں.....؟“ جمال احمد نے سنجیدگی سے برا ماننے کی ادا کاری کی۔ ”مجھ میں کیا

خرابی ہے؟“

”ایک تو یہ کہ تمہاری صورت بچے سے ملتی ہے، اس کے علاوہ تم زاہد خشک بھی ہو، جس کی وجہ سے کوئی بھی لڑکی تمہارے ساتھ رہ کر جس دم کا شکار ہو سکتی ہے۔“

”یہ کیوں نہیں کہتے کہ اکبر میرا دشمن تھا۔ اس لئے کہ وہ ہاکی کا شوقین تھا اور خاص طور پر ہاکی کے قل بیک اجد قسم کے لوگ ہوتے ہیں، جن کے پاس دماغ نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ورنہ انارکلی میں ایسے کون سے سرخاب کے پڑ گئے تھے کہ.....“

”میں نے تمہیں کئی مرتبہ منع کیا ہے کہ ذاتیات کا مذاق مجھے پسند نہیں۔“ اکبر خان یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔

”نچی بات ہمیشہ کڑی ہوتی ہے۔“ جمال احمد نے مسکرا کر کہا۔ ”اب اتفاق ہی ہے کہ تمہارا نام بھی اکبر ہے، ورنہ اکبر بادشاہ تو بے حد ذہین، سنجیدہ، شریف اور دور اندیش آدمی تھا۔“

”کیا تمہارے خیال میں، میں بدھو، رذیل اور کمینہ ہوں؟“ اکبر خان کی پیشانی پر مسکن ہونے لگی۔



شاہ نور پلازہ کے اپارٹمنٹ نمبر آٹھ میں بیٹھے چار افراد شعبہ ٹیلی جنس سے متعلق تھے۔ وہ دوپہر کو تین بجے اس اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تھے جو ایک ریٹائرڈ فوجی افسر کی ملکیت تھا۔ ان چار افراد میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جعفری صاحب کے علاوہ جمال احمد، اکرم خان اور میں بقلم خود بھی شامل تھا۔ ہمارے ساتھ صرف دو سپاہی تھے، جو سادہ لباس میں ہونے کے باوجود پوری طرح مسلح تھے۔

ریٹائرڈ فوجی افسر نے ہماری خاطر خواہ مہمان نوازی کی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔ ساڑھے چار بجے تک ہم ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف رہے، پھر جعفری صاحب نے قدرے اکتائے ہوئے لہجے میں جمال احمد سے کہا۔

”اور آپ کے ساتھ کتنی دیر جھک مارنی پڑے گی؟“

”ہماری واپسی اگر خدا کو منظور ہوا تو چھ بجے تک ہو سکے گی۔“ جمال احمد نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے اس کا دورانیہ طویل بھی ہو جائے۔“

”لیکن یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟“ اکبر خان نے جھل کر پوچھا۔ ”کیا ہم یہاں تفریحاً وقت برباد کرنے آئے ہیں؟“

”تفریح چاہو تو وہ بھی ہو سکتی ہے۔“ جمال احمد نے عقبی کھڑکی کی سمت اشارہ کیا۔ ”اس شیشے کے پاس جا کر کھڑے ہو جاؤ۔ تم کو ساحل سمندر کی موجیں بھی نظر آئیں گی اور ہو سکتا ہے، لہجی کا کچھ سامان بھی نظریں سینکے کو مل جائے۔“

”یار جمال صاحب!“ جعفری صاحب بولے۔ ”کبھی کبھی آپ کا سسپنس کچھ زیادہ ہی ہو جاتا ہے۔ یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟“

”تبدیلی آب و ہوا۔“ جمال احمد نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

”کم از کم سپاہیوں کی موجودگی میں تو جہالت کا ثبوت دینے کی کوشش مت کیا کرو۔“ اکبر خان نے مسکریٹ جلاتے ہوئے کہا۔

”اطمینان سے تو بیٹھے ہو۔ خاطر مدارات بھی ہو رہا ہے۔ اور کیا چاہئے؟“

”کیا تم سیدھی طرح زبان نہیں کھولو گے؟“ اکبر خان کے چہرے پر زلزلے کے اثرات نمایاں ہونے شروع ہو گئے۔

”میں یہاں خود سے نہیں آیا ہوں۔“ جمال احمد نے بڑی مصحوبیت اور سادگی سے جواب دیا۔

”تم بتاؤ، اصل معاملہ کیا ہے؟“ جعفری صاحب نے اس بار مجھ سے سوال کیا۔

”مجھے بھی کوئی علم نہیں ہے۔“ میں نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے کہا۔ ”جمال نے

”مجھے یہ بھی علم ہے کہ آپ کی ریپوٹیشن اپنے جھکے میں کیا ہے۔ لیکن کیا آپ مجھے بھی.....“

”میرا ایک مشورہ مانو گی؟“

”آپ حکم دیں۔ میں انکار نہیں کروں گی۔“ شاہینہ نے بڑی لگاؤ سے جواب دیا۔

”سیٹھ شفیق کی زندگی سے جتنی جلدی ممکن ہو، علیحدہ ہو کر دور نکل آؤ۔“

”جی!“ شاہینہ نے مصنوعی انداز میں چوکتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ نام میں پہلی بار سن رہی ہوں۔ آپ کس سیٹھ شفیق کی بات کر رہے ہیں؟“

”ہو سکتا ہے میری اطلاع غلط ہو۔ بہر حال میں تمہیں محتاط رہنے کا مشورہ دوں گا۔“

”کیا مجھے کوئی خطرہ پیش آنے والا ہے؟ آپ کو میری قسم، کھل کر بتائیں۔“ شاہینہ نے اپنی ترکش کے تیروں کو استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو دھڑکن شروع ہو گئی ہے۔ یقیناً نہیں آتا تو ہاتھ رکھ کر دیکھ لیں۔“

”کل ڈیوٹی کے بعد تمہارا کیا پروگرام ہے؟“ سرور خان نے مسکرا کر دریافت کیا۔

”اپنے اپارٹمنٹ جا کر آرام کرنے کا۔“ جواب میں وہ بھی مسکرا دی۔ ”کوئی خاص بات ہے؟“

”کیا میں تم سے تنہائی میں تمہارے اپارٹمنٹ میں مل سکتا ہوں؟“

”اس پلازہ میں، میں نے اپنی ریپوٹیشن بنا کر رکھی ہے، وہاں میں کسی سے ملاقات نہیں کرتی۔“

”بدنامی سے ڈر لگتا ہے؟“ سرور خان نے ہلکا سا طعنے کیا۔

”کیا ضروری ہے کہ وہ اپارٹمنٹ میرا ہی ہو۔“ اس نے مدھم لہجے میں سرگوشی کی۔

”آپ کسی اور جگہ بھی تنہائی میں مجھ سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ فرمائیے کب اور کہاں پہنچ جاؤں؟“

”ٹھیک ہے۔“ سرور خان نے اس کا ہاتھ آہستہ سے دباتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں رنگ کر کے بتا دوں گا۔ لیکن کل نہیں۔ میں بھول گیا تھا کہ کل میرا ایک بہت ہی خاص کام ہے۔“

”مجھ سے بھی زیادہ؟“ شاہینہ نے لڑکھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”ہاں۔ لیکن اس کی نوعیت خالص سرکاری ہے۔“

بڑی دیر تک وہ دونوں ساحل پر چہل قدمی کرتے رہے۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ دونوں اپنے مقصد کی خاطر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ایک دوسرے سے فری ہوتے جا رہے تھے، لیکن دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ ساحل پر موجود ان گنت افراد میں سے کوئی ایک ایسا بھی تھا، جو ان دونوں کی ایک ایک نقل و حرکت کا جائزہ لے رہا تھا!

جانتے تھے کہ کلکٹر صاحب، جمال احمد کو اس کی ایمانداری اور کارکردگی کے باعث کتنا عزیز رکھتے تھے اس لئے اب ان کے پاس چھ بجے تک وہاں رکنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ٹھیک سوا پانچ بجے صاحب خانہ جو کرٹل کے عہدے پر پہنچنے کے بعد ملٹری سے سبکدوش ہوئے تھے، دوبارہ کمرے میں داخل ہوئے۔ ”حضرات! آپ کو کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ دیکھئے تکلف نہ کیجئے گا، پلیز!“

”بہت بہت شکریہ آپ کا۔“ جعفری صاحب نے بڑے مہذب انداز میں جواب دیا۔  
”اگر کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو ضرور تکلیف دیں گے۔“

”جمال احمد صاحب! آپ کا پہلا مطلوبہ شخص ابھی اپارٹمنٹ میں داخل ہوا ہے۔“ اس بار کرٹل نے جمال احمد سے کہا۔

”تھینکس سر! اب ہم زیادہ دیر تک آپ کو پریشان نہیں کریں گے۔“  
”پلیز! ٹیک یور ٹائم۔“ کرٹل نے وضع داری سے جواب دیا، پھر دوبارہ ملحقہ کمرے میں واپس چلا گیا۔

”نور خان!“ جمال احمد نے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت ہمارے قابل اعتماد سپاہی کو حکم دیا۔ ”تم باہر جا کر مورچہ سنبھال لو۔ برابر والے اپارٹمنٹ سے اگر کوئی بھی باہر نکل کر جانے کی کوشش کرے تو تمہیں ہر قیمت پر اسے روکنا ہوگا۔ لیکن احتیاط سے۔“  
نور خان اثبات میں گردن کو جنبش دیتا ہوا باہر نکل گیا تو جعفری صاحب نے مسکرا کر کہا۔  
”حیرت ہے۔ جس بارات کا دولہا بنا کر سہرا میرے سر پر باندھا جائے گا، اس کے بارے میں مجھے سرے سے کوئی علم ہی نہیں ہے۔“  
’اب آپ ہی بھلیئے۔‘ اکبر خان نے جمال احمد کو جھٹلا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے اس ہنومان کو سر چڑھا رکھا ہے۔“

کچھ دیر تک اسی قسم کی نوک جھوک چلتی رہی، جمال احمد کے علاوہ میں بھی بار بار کن اکیوں سے اپنی دتی گھڑی کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ پھر چھ بجتے میں ایک یا دو منٹ باقی تھے کہ عین اپارٹمنٹ کے باہر کسی ہلکی مگر ٹھوس شے گرنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی میں اور جمال دونوں چوکس ہو گئے۔ پھر جمال نے جعفری صاحب سے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”مجرم کو پھنسی آپ ہی لگائیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔“

”کیا یہ بھی کلکٹر صاحب کا حکم ہے؟“

”نہیں۔ یہ صرف میری درخواست ہے۔“

پھر ہم سب نکل کر باہر آ گئے۔ نور خان میزبوں کے قریب آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کوئی باہر تو نہیں نکلا؟“

آپ لوگوں کی طرح مجھے بھی ساتھ آنے کی دعوت دی تھی، اس لئے میں بھی چلا آیا۔“  
میرے جواب نے جعفری صاحب کی تھلاہٹ میں اور اضافہ کر دیا، رشتے داری کی وجہ سے وہ غصے کا اظہار کرنے سے گریز کر رہے تھے۔ لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ انہیں میرے جواب پر یقین نہیں آیا ہوگا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ میرے اور جمال احمد کے درمیان ہر راز مشترک رہتا تھا، اس لئے ان کی تھلاہٹ بھی اپنی جگہ بے جا نہیں تھی۔ لیکن اکبر خان چپ نہ رہ سکے، مجھے گھور کر بولے۔

”بس رہنے دو فیصل میاں! دائی سے پیٹ نہیں چھپایا کرتے۔“

میں نے جواب میں صرف مسکراہٹ پر اکتفا کیا۔ سپاہیوں کی موجودگی کی وجہ سے ہمارے درمیان انگریزی میں گفتگو ہو رہی تھی۔  
”ٹائم کیا ہوا ہے؟“ جمال احمد نے اکبر خان سے دریافت کیا تو انہیں دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا۔

”تمہاری شکل پر بارہ بج رہے ہیں۔ اور کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟“

”جمال صاحب پلیز!“ جعفری صاحب نے بمشکل اپنی تھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”یا تو آپ یہاں آنے کا سبب بتائیں یا کم از کم میں تو جا رہا ہوں۔“  
”اور میں بھی اب اس بج کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا۔“ اکبر خان نے جمال احمد کو کھانچا جانے والی نظروں سے گھورا۔ ”حماقت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔“

”سوری!“ جمال احمد یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔ ”آپ حضرات اگر جانا چاہیں تو بخوشی جا سکتے ہیں۔ لیکن جالے سے پہلے آپ کو کلکٹر صاحب کو فون کر کے ان سے اجازت لینی ہوگی۔“  
”کیا مطلب؟“ جعفری صاحب کلکٹر کے حوالے پر چوٹے۔

”اس فلیٹ میں ہمارے عارضی قیام کا بندوبست کلکٹر صاحب کی وساطت ہی سے ممکن ہوا ہے اور ہمیں کم از کم چھ بجے تک ہر حال میں یہاں رکنا ہوگا۔“

”یہ بات آپ پہلے بھی بتا سکتے تھے۔“ جعفری صاحب نے شکوہ کیا اور شپٹا کر رہ گئے۔  
”عادت سے مجبور ہے۔“ اکبر خان نے پہلو بدل کر جعفری صاحب سے کہا، پھر جمال احمد سے بولے۔ ”کیا ہم یہاں کسی کیس کے سلسلے میں آئے ہیں؟“

”جناب!“ جمال نے بدستور سنجیدگی سے جواب دیا، پھر مسکرا کر بولا۔ ”اور اطلاع عرض ہے کہ کلکٹر کی ایما پر اس کیس کا سہرا ہمارے جعفری صاحب کے سر بندھے گا۔“

”لیکن مجھے تو علم ہی نہیں ہے کہ.....“

”ہو جائے گا سر! اتنی جلدی بھی کیا ہے؟“ جمال احمد نے بڑی تابعداری سے جواب دیا۔  
کلکٹر صاحب کا نام چونکہ درمیان میں آ گیا تھا اور جعفری صاحب کے علاوہ سب ہی

”نوسرا!“ نور خان نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔ ”ابھی ابھی ایک بندہ اور داخل ہوا ہے۔“

”جعفری صاحب!“ جمال احمد نے سنجیدگی سے کہا۔ ”چوہے دان آپ کا منتظر ہے۔ مجھے امید ہے کہ اصل مجرم کو دیکھ کر آپ کے ذہن کو جھٹکا ضرور لگے گا۔ لیکن قانون بہر حال اندھا ہوتا ہے اور اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں ہوتا۔“

جعفری صاحب کے جواب دینے سے پیشتر ہی جمال احمد نے دو سپاہیوں کو برابر والے اپارٹمنٹ کے دونوں اطراف پوزیشن سنبھالنے کا اشارہ کیا اور خود آگے بڑھ کر دروازے پر تین بار آہستہ آہستہ دستک دی۔ دروازہ کھلنے میں ایک منٹ لگا تھا لیکن جس شخصیت نے دروازہ کھولا تھا، وہ شاہینہ کے سوا اور کوئی نہیں تھی۔ میرا اشارہ پا کر وہ ایک طرف ہو گئی اور ہم دغنائے ہوئے اندر داخل ہوئے، جہاں شہزاد پہلے سے موجود تھا۔ اس نے چہرے کی ایک جیکٹ پہن رکھی تھی، میری شکل دیکھتے ہی اسے خطرے کا احساس ہو گیا لیکن اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ بہر حال، اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔

”مسٹر فیصل!“ جمال نے مجھے تھکمانہ لہجے میں مخاطب کیا۔ ”آپ اس جیکٹ کی تلاشی لیں۔“

یہ محض ایک رسمی سی کارروائی تھی اس لئے کہ ہمیں معلوم تھا کہ جیکٹ کے اندر بنے ہوئے خفیہ خانوں میں اور اسٹر کے اندر پورے دو ہزار تولہ ناجائز سونا دو سو چالیٹ کی شکل میں موجود تھا، جسے اس قدر خوب صورتی سے چھپایا گیا تھا کہ کسی کو ایک ذرہ برابر شک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ جعفری صاحب نے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ شہزاد کو ہتھکڑی لگا دی جائے اور ان کے حکم کی تعمیل میں نور خان نے نیپے سے ہتھکڑی نکال کر شہزاد کو پہنا دی۔

”یہ کس کا مال ہے؟“ جعفری صاحب کی کرخت آواز کمرے میں گونجی۔

”مم..... مجھے نہیں معلوم، لیکن اس کا نام بتانے کو تیار ہوں، جس نے یہ جیکٹ میرے حوالے کی تھی۔“ شہزاد نے قہر قہراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس کا نام بوبی ہے۔ صرافہ بازار کا بچہ بچہ اسے سینڈو کے نام سے جانتا ہے اور..... اور وہ بیچے جیولرز کے سینڈو شفیق کے لئے کام کرتا ہے۔ مجھے صرف دس پرسنٹ کمیشن ملتی ہے۔“

”بکواس مت کرو۔“ جعفری صاحب سینڈو شفیق کا نام سن کر چونکے۔ ”تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ مال سینڈو شفیق کا ہے؟“

”مم..... مم..... میں حلفیہ بیان دینے کو تیار ہوں جناب! کہ یہ مال مجھے بوبی نے لا کر دیا تھا، اس لئے میرے ذہن میں شفیق سینڈو ہی کا نام ابھر رہا تھا۔“

”آپ اس کے بیان کی تائید کرتی ہیں؟“ جعفری صاحب نے شاہینہ کو تیز نظروں سے

گھورا۔

”آپ کو شاید علم نہ ہو لیکن آپ کے محکمے کے سربراہ نے مجھے وعدہ معاف گواہ بنا کر قانون سے پوری پوری رعایت دلانے کا وعدہ لیا ہے۔“ شاہینہ نے بے پروائی سے کہا۔

”آپ بوبی کو گرفتار کر کے اس پر سختی کریں تو وہ بھی سب کچھ اگل دے گا۔“

”مسٹر اکبر!“ جعفری صاحب نے اکبر خان کو مخاطب کیا۔ ”آپ اسی وقت دونوں سپاہیوں کو ساتھ لے جائیں اور جیسے بھی ممکن ہو بوبی یا سینڈو کو اریسٹ کر کے یہاں لے آئیں۔ اس کا بیان ہمارے لئے زیادہ اہمیت کا حامل ہو گا۔“

اکبر خان اپارٹمنٹ سے باہر نکل گئے تو جمال احمد نے کہا۔

”جعفری صاحب! کلکٹر صاحب کی خواہش ہے کہ یہ کیس آپ کے نام سے رجسٹرڈ کیا جائے اور مجرم کو ہتھکڑی بھی آپ ہی لگائیں۔“

”کیا ابھی اور کوئی مجرم باقی رہ گیا ہے؟“ جعفری صاحب نے دریافت کیا۔

”جی ہاں۔“ جمال احمد نے مسکرا کر جواب دیا۔ پھر اونچی آواز میں بولا۔ ”سینڈو شفیق! تم پوری طرح چوہے دان میں پھنس چکے ہو، اس لئے خود ہی باہر آ جاؤ ورنہ ہمیں سختی کرنی پڑے گی۔“

ایک لمحے تک کمرے میں خاموشی رہی، سب کی نظریں اٹیچ ہاتھ روم کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر کچھ دیر بعد سینڈو شفیق مجرموں کی طرح گردن جھکائے باہر آیا تو جعفری صاحب ششدر رہ گئے۔

”شہزاد کے علاوہ بھی میں اس بات کی گواہی دینے کو تیار ہوں کہ یہ مال سینڈو شفیق ہی کا ہے، جس نے اپنا اٹو سیدھا کرنے کی خاطر پہلے مجھے دولت کالا لٹ دے کر اپنے سنہرے جال میں پھانسا، پھر بلیک میلنگ کی دھمکی دے کر ناجائز تجارت کی نگرانی پر مامور کر دیا۔ حالات ایسے ہی تھے کہ میں اس کے کسی حکم سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن میں نے آج تک کسی ناجائز تجارت کے مال کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا۔“

”کیا تمہیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟“ جعفری صاحب نے سینڈو شفیق کو مخاطب کیا۔

پھر جب کوئی جواب نہیں ملا تو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اسے ہتھکڑی پہنائے ہوئے کہا۔

”تمہاری خاموشی اور دو گواہوں کے بیان کی روشنی میں، میں تمہیں گرفتار کرنے پر مجبور ہوں۔ اب تمہارا فیصلہ عدالت ہی کرے گی۔“

جتنی دیر میں ضروری اور قانونی دستاویز مکمل ہوئیں، اتنی دیر میں اکبر خان بوبی عرف سینڈو کو گرفتار کر کے لے آیا تھا۔ بوبی نے اس بات کا اقرار کیا کہ وہ جیکٹ، جو شہزاد کے پاس سے برآمد ہوئی ہے وہ اسی نے سینڈو شفیق کے کہنے پر شہزاد تک پہنچائی تھی۔ اس کے اندر کیا تھا،

بونی نے اس ضمن میں پہلے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا، پھر جمال احمد کے اشارے پر جب نور خان نے اس پر قانون کی قوت کا مظاہرہ کیا تو بونی نے سچ اُگلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ کاغذات کی تکمیل کے بعد جعفری صاحب نے شاہینہ سے کہا۔

”جب تک آپ کلکٹر کی عدالت میں پیش ہو کر اپنا حتمی بیان نہ دے دیں، اس شہر اور اس اپارٹمنٹ کو چھوڑنے کی حماقت نہ کیجئے گا۔ میری برائے کے دو افسران برابر آپ کی نگرانی پر مامور رہیں گے۔“

”مجھے منظور ہے۔“ شاہینہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”لیکن ایک درخواست میری بھی ہے۔ میرا نام اگر اخبارات میں نہ آئے تو میں آپ کی شکر گزار رہوں گی۔“

”کوشش کروں گا، وعدہ نہیں کرتا۔“

ہم اپارٹمنٹ سے اتر کر گاڑیوں میں بیٹھنے لگے تو سیٹھ شفیع نے مجھے گھور کر ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

”میں تمہیں بھولوں گا نہیں، فیصل صاحب! یہ تم نے میرے اوپر تیسرا وار کیا ہے۔“

”تمہاری مرضی۔“ میں شانے اچکا کر بولا۔ ”لیکن اس چوہے دان کو بھی ضرور یاد رکھنا، جس میں ہر مجرم کی نہ کسی دن ضرور پھنستا ہے۔“

جواب میں جعفری صاحب نے مجھے اور جمال کو متنی خیز نظروں سے دیکھا، پھر مسکرانے لگے۔



کیس تقریباً چھ ماہ تک زیر سماعت رہا، پھر اس کے بعد گواہوں کے بیان کی روشنی میں بونی اور شہزاد کو دو دو سال کی سزا دی گئی۔ سیٹھ شفیع کو پانچ سال کی قید با مشقت کی سزا کے علاوہ ایک لاکھ جرمانہ بھرنے کا حکم صادر کیا گیا، عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں اسے مزید چھ ماہ قید با مشقت بھگتنی پڑتی۔ شاہینہ جو چونکہ براہ راست اس ناجائز تجارت میں ملوث نہیں تھی اور اس نے لڑکی ہونے کے باوجود قانون کے تقاضوں کو پورا کرنے کی خاطر اپنے اپارٹمنٹ کو بطور چوہے دان استعمال کرنے میں حکومت سے تعاون کیا اس لئے اسے صرف تنبیہ کر کے چھوڑ دیا گیا۔

میری اس کامیابی میں کچھ ہاتھ سرور خان کا بھی تھا۔ اسی نے میری ایما پر شاہینہ کو کیس کے سلسلے میں آمادہ کیا تھا۔ عبدالکریم نے بھی مجھے اس کو انجام تک پہنچانے میں جو مدد کی تھی، میں اسے بھی فراموش نہیں کر سکتا!!



## عقدہ مشکل

وہ ایماندار ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی بدنام ہو گیا تھا۔ یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے۔ دنیا میں ہر جگہ یہی ہوتا ہے۔ جہاں سوکالوں میں دو تین سفید فام نظر آئیں، وہاں ان کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس کی صورت حال بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ڈیوٹی پوری اور پابندی سے انجام دینے کے بعد بھی اسے جھکے کے اعلیٰ افسروں کی ڈانٹ پھٹکار اور جواب طلبی کے نوٹس برداشت کرنے پڑتے تھے اس کے ساتھی بظاہر اس سے بہت اچھی طرح پیش آتے تھے لیکن افسروں کے سامنے اس کی برائی کرنے سے بھی بچے نہیں چوکتے تھے۔ کئی بے تکلف دوستوں نے اسے بار بار سمجھایا۔

”دیکھو یار! ایک حمام میں جب سب ننگے ہوں تو دو چار لباس پہنے ہوئے لوگ اچھے نہیں لگتے۔“

”لباس اتارنا میری عادت کے خلاف ہے۔“ وہ مسکرا کر جواب دیتا۔ ”میں نہاتے وقت حمام میں بھی جاکھیا پہننے کا عادی ہوں۔“

”لیکن اوپر والے اسے اچھا نہیں سمجھتے۔“

”یہ ان کا ذاتی فعل ہے۔ لیکن میں محض دوسروں کی خاطر اپنی عادت تبدیل نہیں کر سکتا۔“

”جانتے ہو تم سے پہلے جو افسر ڈیپارچنگ لاؤنچ پر تعینات تھا، اس کی روز کی آمدنی کتنی تھی؟“ ایک روز اس کے بے تکلف دوست عارف نے کہا۔ ”یہ پوسٹنگ صرف قسمت والوں کو ہی ملتی ہے۔ نہیں نہیں کر کے بھی اوسطاً پانچ سات ہزار روپے روز کے پیٹ لیتے ہیں اور مونچھوں پر تاؤ دے کر خود کو ایمانداروں کی صف میں بھی نمایاں جگہ دینے کے عادی ہوتے ہیں۔“

”میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ لیکن اگر میری وجہ سے اوپر والوں کا حصہ ملنا بند ہو گیا ہے تو اس میں مجھ سے زیادہ ان کا اپنا قصور ہے۔“ وہ جھلا کر کہتا۔ ”مجھے ڈیپارچنگ لاؤنچ

اپنے ہاتھوں سے اپنے پیروں پر کلبھاری تو مارنے سے رہا۔ برا مت ماننا میری جان!“ عارف مسکرا کر بولا۔ ”تم تو کتے کی ہڈی کی طرح ان کے حلق میں انک کر رہ گئے ہو۔“

وہ پان کھانے کا دھن تھا، ہر وقت دونوں گال گیس بھرے غبارے کی طرح پھولے رہتے تھے۔ اس وقت بھی اس کی یہی کیفیت تھی۔ قوام کی بھینی بھینی خوشبو رجبہ جانی تمباکو کے ساتھ مل کر اس کی باتوں کے ذریعے پھیل رہی تھی۔ عارف کی بات سن کر وہ اپنی بے اختیار ہنسی کو نہ روک سکا۔ جلدی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ تمباکو کی پیک وہ جلدی میں نگل گیا، لیکن پھر بھی دو چار چھینٹوں نے اس کے اُجلے لباس کو داغ دار کر دیا۔ رومال سے منہ پونچھ کر وہ دوبارہ عارف کی طرف پلٹا اور ہونٹ کے گوشوں کو انگلیوں سے صاف کرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

”یار! تم نے یہ کتے کی ہڈی والی مثال لا جواب دی ہے۔ لیکن اس میں بھی میرا نہیں، اوپر والوں کا تصور ہے۔ وہ مردار اور حرام جانور کا گوشت کھانا بند کر دیں، ہڈی آپ ہی آپ ختم ہو جائے گی۔“

”گویا تم شرافت سے نہیں مانو گے۔“

”ایک شرافت ہی تو یوریا بستر رہ گیا ہے، اسے کس طرح چھوڑ دوں؟“ اس نے بذلہ سنجی سے جواب دیا، پھر یک لخت سنجیدہ ہو کر بولا۔

”خدا کی قسم! میں نے ممبر صاحب سے اپنی پوسٹنگ کے سلسلے میں کچھ نہیں کہا، وہ والد صاحب کے دوست ہیں، سا بھی رہ چکے ہیں، ایک ہی وطن کے ہیں لیکن میں ان سے حتی الامکان دور دور ہی رہتا ہوں۔ اگر پاگل ہوتا یا لگائی بھائی کرنے کی عادت ہوتی تو تمہارے ڈی جی کے باپ بھی کبھی میرا جواب طلب کرنے کی جرأت نہ کر سکتے۔ لیکن میں نے آج تک اس سلسلے میں بھی نہ تو کبھی والد صاحب سے کوئی تذکرہ کیا، نہ ہی ممبر صاحب کے کان میں پھونکنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد بھی اگر یہ..... کے بچے میری مخالفت پر کمر بستہ ہیں تو ہوا کریں، مجھے ملازمت کی بھی پروا نہیں ہے۔“

وہ ایسی ہی طبیعت کا مالک تھا۔ جب تک موڈ میں ہوتا تو چھوٹے سے چھوٹے سپاہی کو بھی ساتھ بٹھا کر چائے پلاتا اور دوستوں کی طرح غل غباڑے چلایا کرتا۔ اس کی ہنسی کا انداز بھی دوسروں سے بڑا مختلف تھا۔ اچانک منہ پھاڑ کر قہقہہ بکھیرتا تو آدھا ڈیپار چنگ لاؤنج گونج اُٹھتا۔ دوسری ایجنسی کے لوگ بھی سمجھ جاتے کہ کفیل صاحب ڈیوٹی پر موجود ہیں۔ لیکن جب وہ پیڑی سے اتر جاتا تو پھر اس کے منہ سے جھاگ اُڑتے بھی دیر نہیں لگتی تھی۔ اس کی سچائی اور ایمانداری پر کوئی حرف آتا تو وہ بالکل ہی ہو جاتا تھا۔ ایسے مواقع پر اس کی خود ساختہ گالیاں اور لاف و گزاف بھی سننے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اسے جھوٹ سے شدید چڑھتی۔ سچ

سے ہٹا کر کہیں بھی پوسٹ کر دیں، میں انتظار نہیں کروں گا چارج ہینڈ اوور کرنے میں۔ ذاتی طور پر بھی میں ایسی پوسٹنگ نہیں چاہتا جس پر سینکڑوں کی زبانیں لپلاپاتی ہوں۔“

”تمہاری یہی باتیں لوگوں کو گراں گزرتی ہیں۔“ عارف نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”جو لوگ تمہارے منہ پر تمہاری تعریفیں کرتے نہیں تھکتے، وہیں پیٹھ پیچھے تمہارے خلاف ایک کی دس کر کے لگاتے ہیں۔“

”وہ اپنی عادت سے مجبور ہیں۔ میں ان کی زبانوں کو نہ تو پکڑ سکتا ہوں نہ اس پر تالے ڈال سکتا ہوں۔“

”ایک طریقہ ایسا ہے کہ سانپ بھی مر سکتا ہے اور لاٹھی ٹوٹنے کا اندیشہ بھی زیادہ نہیں ہو گا۔“

”وہ کیا؟“

”تم سپاہیوں پر جو کڑی نگرانی رکھتے ہو، وہ ختم کر دو۔ اوپر والوں کا کام بھی چلتا رہے گا اور تمہاری دیانت داری بھی قائم رہے گی۔ سچ پوچھو تو لین دین کا کام یہی سپاہی کرتے ہیں لیکن تم نے ان کو بھی ٹائٹ کر رکھا ہے۔“

”جہاں دیانت داری ہو، وہاں فرائض سے کوتاہی برتنا بھی بے ایمانی کے زمرے میں آتا ہے۔“

”مگر ہمیشہ یاد رکھو کہ سانپ موقع ملنے پر دودھ پلانے والے کو بھی ڈسنے سے نہیں چوکتے۔“

”بالکل ٹھیک کہا۔“ وہ مسکرا کر کہتا۔ ”جب ڈسنا ہی سانپوں کی سرشت میں ہو تو پھر ان کو دودھ پلانے سے بھی کیا فائدہ؟ میرے اختیار میں ہو تو ان تمام زہریلے کیڑوں کا سر پیروں تلے چل کر پھینک دوں۔“

”ڈپٹی تک تمہارے خلاف ہے۔ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ وہ اپنے تئیں پینتیس ہزار روپے ماہانہ کے نقصان پر ہر وقت تلما تا رہتا ہے۔“

”تمہاری اور ڈپٹی کی تو خاصی دانت کاٹی روٹی ہے۔ اس سے کہو کہ اوپر والوں سے کہہ کر میرا تبادلہ کرادے۔“

”یہی تو مشکل ہے کہ تمہیں ڈیپار چنگ لاؤنج سے ہٹایا بھی نہیں جاسکتا۔“

”کیوں؟ اس میں کیا قباحیت ہے؟“

”سب سے بڑی قباحیت ممبر صاحب ہیں، جو تمہارے والد کے دوست بھی ہیں اور تمہیں بے حد چاہتے ہیں۔ بچوں کی طرح..... انہوں نے ڈائریکٹر جنرل سے بطور خاص تمہاری پوسٹنگ کے سلسلے میں کہا تھا۔ اب ڈی جی ان کے حکم یا اشارے کے بغیر تمہارا تبادلہ کر کے



پر دھمکی آمیز ہتھوڑے ہی کی طرح پڑا تھا۔  
احسن حسن مسکراتا ہوا کفیل کے ساتھ ہولیا، کمرے میں پہنچ کر کفیل نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

”شرافت سے اُگل دو، ورنہ میں تمہیں ننگا بھی کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔“  
”کفیل بھائی!“ احسن حسن نے اس بار قدرے اُلجھ کر کہا۔ ”آپ بھول رہے ہیں شاید، میں آپ کے چھوٹے بھائی جسیم جعفری کا دوست ہوں۔ کئی بار گھر پر بھی آپ سے مل چکا ہوں۔“

”کفیل بھائی“ کے بعد جب کفیل کا غصہ ذرا اٹھٹھا ہوا تو اس نے احسن حسن کو پہچان لیا، اسے خود بازو تھام کر بڑی محبت سے کرسی پر بٹھایا۔ سپاہی سے دو ٹھنڈی بوتل لانے کو کہا، پھر معذرت خواہ لہجے میں بولا۔

”بیٹے! معاف کرنا۔ میں واقعی بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دو، دراصل میں نے تمہیں پہچانا نہیں تھا۔“

”آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں کفیل بھائی؟ آپ بزرگ ہیں۔ اگر مجھے دو ہاتھ ماریں گے تو اس میں بھی یقیناً میری بھلائی کا کوئی پہلو شامل ہوگا۔“

”نہیں بیٹے! نہیں۔“ کفیل نے جلدی سے کہا۔ ”تم پلیز اس بات کا تذکرہ جسیم سے کبھی نہ کرنا، ورنہ وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔“

بوتل آئی، پی گئی۔ احسن حسن اور کفیل کے درمیان ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ پھر جب احسن جانے کے لئے اٹھا تو کفیل نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے کہا۔

”تم تو جانتے ہو بیٹے! کہ امی کی دعائیں ہمیشہ میرے ساتھ رہی ہیں۔ کبھی کبھی مجھے بیٹھے بیٹھے الہام سا ہوتا ہے کہ فلاں شخص غلط راہ کا مسافر ہے اور میں اسے روک کر جب تلاشی لیتا ہوں تو اس کے پاس سے کوئی نہ کوئی قابل اعتراض چیز ضرور برآمد ہوتی ہے۔ میرے پاس کوئی اللہ دین کا چراغ تو نہیں ہے کہ اسے گھسا اور جن حاضر ہوا اور اس نے تمام پوشیدہ باتیں کان میں پھونک دیں۔ بس ماں کی دعا ہے جو کام آ رہی ہے۔ میں اب بھی تم سے شرمندہ ہوں لیکن اپنی چھٹی جس کی تسلی کے لئے پوچھ رہا ہوں کہ کیا تمہارے پاس مروجہ قانون کے تحت ساتھ لے جانے والے ڈالررز کی مقدار کچھ زیادہ نہیں ہے؟“

”آپ درست فرما رہے ہیں کفیل بھائی! دراصل جدہ میں ایک عزیز کی شادی ہے، اسی سلسلے میں۔“

”بس بیٹے! بس۔“ کفیل نے اس کے بازو تھپتھپاتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے صرف معلوم کرنا تھا۔ اب تم جاسکتے ہو۔ لیکن پلیز جسیم کو اس کی اطلاع نہ ہونے پائے کہ میں نے

بولنے پر وہ رعایت کرنے سے بھی نہیں چوکتا تھا، لیکن صرف اس حد تک کہ اس کی سفید پوشی پر کوئی حرف نہ آ سکے۔

ایک بار وہ ڈیوٹی پر تھا کہ ایک بیردنی ایئر لائن کا اسٹیورڈ اس کے سامنے سے گزرا۔ وہ یونیفارم میں تھا اور پاکستان میں اپنی چھٹیاں گزار کر دوبارہ جدہ واپس جا رہا تھا۔ کفیل کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس کی پہنچ جہاں تک ہے۔ بہر حال اس نے نہ جانے کیوں یوں ہی اس اسٹیورڈ کو آواز دے کر قریب بلا لیا، جس کے سینے پر ”احسن حسن“ کا نام بھی موجود تھا۔ بڑی بے تکلفی سے اس طرح ہاتھ ملایا جیسے برسوں پرانی واقفیت ہو۔ احسن حسن اس کے چھوٹے بھائی کا دوست بھی تھا اور دونوں اسی ایئر لائن سے وابستہ تھے۔ وہ کفیل کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ دوست کا بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے اس کی بڑی عزت بھی کرتا تھا، لیکن کفیل ہمیشہ سے واحد حاضر اور جمع غائب رہنے کا عادی تھا، وہ احسن حسن کو بھی نہیں پہچان سکا۔ خاصی گرم جوشی سے مصافحہ کرنے کے بعد سرگوشی میں بولا۔

”یار! یوں تو ہم دونوں ہی ایک راہ کے مسافر ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ تم خالی ہاتھ واپس نہیں جا رہے ہو۔“

”کفیل بھائی! آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔“

یہاں ذرا سی غلط فہمی یہ پیدا ہو گئی کہ احسن حسن نے کفیل بھائی اور پہچانا نہیں کا جملہ دوست کے بڑے بھائی ہونے کی وجہ سے استعمال کیا تھا، لیکن کفیل کی کھوپڑی ٹھوم گئی۔ وہ یہ سمجھا کہ اسے دھمکی دی جا رہی ہے۔ عام طور سے دھمکی دینے والے ایسے ہی جملے اختیار کرتے تھے کہ ”آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔“ جانتے ہیں آپ کہ میں کون ہوں؟..... کیوں بلاوجہ اپنی ملازمت کے پیچھے پڑے ہو..... تمیز سے بات کرو، ورنہ۔“ چنانچہ کفیل کے دماغ میں بھی اس وقت یہی آیا کہ وہ اسٹیورڈ تھا، اس لئے ظاہر ہے کہ اس کے اندرونی مراسم بھی دور دور تک ہوں گے۔ بہر حال پیشانی پر بل پڑ جانے کے باوجود وہ سنجیدگی سے بولا۔

”یار! مجھے ماں کی دعا لگ گئی، جو میں اڑتی چڑیا کے پر بھی خاصی دُور سے گن لیتا ہوں۔ آپ اس وقت یونیفارم میں ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ پورے لاؤنج میں آپ کی شرافت کا ڈھنڈورا پیٹے۔ اس لئے دوست سمجھ کر ہی بتا دو کہ کتنے ڈالر تمہاری مختلف جیبوں میں پڑے ہیں، ورنہ.....“

”ورنہ کیا کریں گے آپ؟“ اس بار بھی احسن حسن نے اپنے دوست کے بڑے بھائی ہونے کی رعایت سے مسکرا کر کہا۔

”ذرا میرے کمرے تک کی زحمت گوارا کریں گے آپ؟“ کفیل احمد نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”ورنہ کیا کریں گے آپ؟“ والا جملہ بھی کفیل کے ذہن

”سر! میں یہاں ٹرانسپورٹ آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں، اس لئے۔“  
 ”وہاٹ؟“ ممبر نے تیز نظروں سے ڈی جی کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ بات آپ کے علم میں نہیں ہے کہ کفیل کو میں نے بطور خاص آپ کے پاس تعینات کیا تھا؟“  
 ”جی ہاں سر! لیکن میں نے سوچا کہ انہیں کچھ تجربہ ہو جائے تو.....“  
 ”نو مینٹس (No-comments)“ ممبر نے افسرانہ لہجے میں اپنا آخری فیصلہ بھی صادر کر دیا۔ ”آپ کل تک کفیل کا تبادلہ ایئر پورٹ ڈیپارچنگ لاؤنچ کریں اور مجھے بذریعہ فون رپورٹ کریں۔“

اس کے بعد ممبر تو گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے لیکن ان کے جانے کے بعد ہی ڈی جی نے اسے اپنے کمرے میں طلب کر لیا، جہاں دو چار اور بڑے افسر بھی بیٹھے ناک بھوں چڑھا رہے تھے۔

”میں آپ کے تبادلے کے آرڈر ابھی کر رہا ہوں، لیکن آپ کو ممبر کے سامنے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ آپ کوئی کیس نہیں کر سکتے؟“ ڈی جی کے لہجے میں کئی اور ناراضگی کا رنگ خاصا واضح تھا۔

”مجھے ہیڈ کوارٹر کے ڈی ایس پی انچارج صاحب نے آپ کی طرف سے بھی حکم دیا تھا کہ میں کسی کیس وغیرہ کے چکروں سے دور رہوں۔“ کفیل نے صاف گوئی سے کہا۔  
 ”مسٹر کفیل!“ ایک اسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب ڈی جی کی ترجمانی کرتے ہوئے پہلو بدل کر بولے۔ ”دریا میں رہ کر مگر مجھ سے بیر لینا مناسب نہیں ہوتا، آپ اس بات کا خیال رکھیں۔“

”سر! میرے خیال سے میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی، جس کی بنا پر دریا اور مگر مجھ والی مثال.....“

”اب آپ جاسکتے ہیں۔“ ڈی جی نے حقارت سے کہا۔ ”دفتر بند ہونے سے پیشتر آپ کو ٹرانسفر آرڈر مل جائیں گے۔“

”تھینک یوسر!“ اس نے سلام کیا، پھر پلٹ کر باہر آ گیا۔

اس کے بعد ہی اس کی تعیناتی ایئر پورٹ پر ہو گئی جس کی وجہ سے لوگوں کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگے۔ کفیل کو معلوم تھا کہ ممبر آتی جانی چیز ہوتے ہیں۔ دل میں بغض بھرا ہوا تو انتقام کی آگ اس وقت تک سرد نہیں ہوتی، جب تک اس کا بدلہ نہ لے لیا جائے اس لئے وہ بہت زیادہ مشاطہ رہنے کا عادی ہو گیا تھا۔ اسے یہ بھی خطرہ لاحق رہتا تھا کہ کہیں اسے کسی ناکردہ گناہ میں تنہی کر کے عتاب کا نشانہ نہ بنا دیا جائے چنانچہ وہ اپنے کمرے میں بھی بہت تنہا بیٹھتا تھا۔ چھ مہینے کے اندر اندر اس نے متعدد ایسے کیسز بھی کر لئے تھے جن کو ”ہذا من فضل

تمہیں روک لیا تھا۔“

غرضیکہ وہ عجیب و غریب طبیعت کا مالک تھا۔ یہ بات بھی درست ہے کہ اسے ممبر کے کہنے پر ہی ڈیپارچنگ لاؤنچ میں تعینات کیا گیا تھا ورنہ اس پوسٹنگ کے لئے تھا نے بکنے والی مثال صادق آتی تھی۔ اس کی تعیناتی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ممبر نے ایک آفیشل میٹنگ کے بعد دفتر سے نکلتے ہوئے اسے دیکھ لیا تھا، اتفاق سے اس وقت ڈی جی اور دوسرے پیشتر توپ قسم کے آفیسر بھی ممبر سے نمبر بڑھوانے کے لئے ان کے آگے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ کفیل نے کترا کر نکل جانے کی کوشش کی لیکن ممبر اسے دیکھ چکے تھے، آواز دے کر قریب بلایا اور سب کے سامنے پوچھا۔

”تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں؟“

”جی نہیں سر!“ میں نے افسروں کو شرمندگی سے بچانے کی خاطر جھوٹ بولا۔ ”ہر شخص مجھ پر مہربان ہے۔ بہت خیال رکھتے ہیں۔“  
 ”گڈ۔“ ممبر نے مسکرا کر بڑی شفقت سے کہا۔ ”کوئی کیس وغیرہ بھی پکڑا یا ابھی تک سیکھ رہے ہو؟“

”جب وقت آئے گا تو کیس بھی پکڑ لوں گا۔“

”حیرت ہے۔ تمہارے والد تو آئے دن کوئی نہ کوئی ہنگامہ کرتے رہتے ہیں۔“ ممبر نے کہا، پھر محبت سے دھمکی دی۔ ”پندرہ دن کے اندر اندر آپ کوئی معقول کیس پکڑ کر اپنے ڈائریکٹر جنرل صاحب کو رپورٹ دیں اور آپ کے ڈی جی صاحب اپنے ریمارکس کے ساتھ اس کی رپورٹ مجھے روانہ کریں گے، تم اسے میری جانب سے اپنا امتحان سمجھ لو۔“  
 ”سوری سر!“ اس بار کفیل نے تمام مصلحتوں کو نظر انداز کر کے سنجیدگی سے جواب دیا۔  
 ”آپ میرا جو امتحان لینا چاہتے ہیں اس میں میری کامیابی کے چانسز صفر سے بھی کچھ کم ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ ممبر نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔

تمام بڑے افسران اپنی اپنی جگہ بغلیں جھانکتے رہے۔ ایک افسر نے تو کفیل کو خاموش رہنے کا اشارہ بھی کیا تھا لیکن وہ اپنے محسن کے ساتھ (اسی ممبر کی سفارش پر ہی اسے ملازمت ملی تھی) مزید دروغ گوئی نہ کر سکا، صاف گوئی سے بولا۔

”میرا نام کیس پکڑنے والوں کی فہرست میں شامل نہیں ہے۔“

”تمہارے والد نے ایک بار بتایا تھا کہ کبھی کبھی تمہارے اوپر حماقتوں کا دورہ پڑتا ہے۔“  
 ممبر نے سنجیدگی سے کہا۔ ”شاید اس وقت بھی تم اسی کیفیت سے دو چار ہو۔ ڈائریکٹر میٹ کے انپکٹروں کو تو وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں، پھر آپ کیس کیوں نہیں پکڑ سکتے؟“

دبی کے تحت چھوڑ کر چشم پوشی کا محتانہ وصول کر لیا جاتا تھا، اس عرصے میں اس نے سی کشم، اے ایس ایف اور دیگر ایجنسیوں کے ذمے دار افراد سے بھی اچھی خاصی صاحب سلامت پیدا کر لی تھی۔ لیکن اپنے پہلے ہی کیس میں اس نے جس رویے کا اظہار کیا، اس سے سب نے ہی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اس سے کسی رعایت کی امید رکھنی فضول ہی تھی۔ بہر حال چھ مہینے کی مختصر مدت کے اندر اندر ہی اس نے اپنا ایک ایسا مقام بنا لیا تھا، جس سے دوسرے نہ سہی لیکن اس کا اپنا ضمیر ضرور مطمئن تھا۔

یہ بات بھی اپنی جگہ درست تھی کہ ماں کی دعائیں بھی کفیل کے ساتھ تھیں، جو وہ ہر اقدام پر سرخرو ہو رہا تھا اور دشمن جو گھات لگائے بیٹھے تھے، منہ کی کھا رہے تھے۔ وہ ڈیوٹی کے معاملات میں بہت سخت تھا، لیکن احتیاطاً کسی بقلی چہرے سے بچنے کی خاطر اس نے بظاہر خود کو انتہائی سخت اور ایماندار آفیسر ظاہر کرنے کے باوجود اپنے سپاہیوں کو اس بات کی اجازت دے رکھی تھی کہ وہ آٹے میں نمک ملا سکتے ہیں۔ لیکن اگر کسی کی رپورٹ اس کے کان تک پہنچی تو پھر اس کی خیر بھی نہیں۔

سپاہیوں اور اس کے درمیان ایک ایسا خاموش معاہدہ تھا جس کی بنا پر وہ کفیل کے سلسلے میں دوسرے افراد کے سامنے ہمیشہ بھوکا مرنے کی باتیں کرتے تھے لیکن ان کا دال دلیا چل رہا تھا، اس لئے وہ بہت خوش بھی تھے۔ اب انہیں اپنے مال غنیمت سے ہیڈ کاسٹیل یا ہیڈ کلرک وغیرہ کو کوئی بھتہ بھی نہیں دینا پڑتا تھا۔

یہاں ایک بات یہ بھی عرض کر دوں کہ کفیل کا بڑا بھائی بھی سی کشم میں بڑے عرصے سے کام کر رہا تھا اور اس کی رپوٹیشن بنی ہوئی تھی۔ اس لئے کفیل کو کشم والوں کی حمایت بھی حاصل ہو گئی تھی، لیکن اس حمایت کے باوجود وہ ان کے ساتھ بھی کسی غیر قانونی کام میں ہاتھ بٹانے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ بڑے بھائی کی وجہ سے وہ سب کی عزت کرتا، ان کے ساتھ عاجزی اور انکساری سے پیش آتا لیکن اپنے اصولوں میں کوئی چلک نہیں آنے دیتا تھا۔ ایک بار بڑے بھائی نے بھی اسے سمجھانے کی خاطر بڑے کھلے لفظوں میں کہا تھا۔

”میرا مشورہ ہے کہ یا تو تم راہ راست پر آ جاؤ یا پھر لمبی چھٹی پر چلے جاؤ۔“

”راہ راست سے آ کی کیا مراد ہے؟“ اس نے بھائی سے وضاحت چاہی۔

”خود بھوکا رہنا چاہئے ہو تو شوق سے رہو لیکن دوسروں کے پیٹ پر لات نہ مارو، ورنہ یہ سب بھوکے بھیڑیوں کی طرح کسی دن تمہیں چیر پھاڑ کر ہڑپ کر جائیں گے۔“

”پھر..... ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے تمہارا کیا مشورہ ہے؟ کیا فرائض منصبی سے پوری طرح چشم پوشی اختیار کر لوں؟“ کفیل نے لا پرواہی سے کہا۔

”اتنی گاڑھی اُردو بولنے کی ضرورت نہیں۔ مگر جو آج ہے وہ کل نہیں رہے گا۔ اس وقت

کیا کرو گے؟“ بڑے بھائی نے بھٹا کر جواب دیا۔ ”ابھی وقت ہے۔ افسروں سے بنا کر رکھو۔ ورنہ حالات بدلتے ہی کسی کوئے کھدرے میں پڑے نظر آؤ گے۔“

”گویا ہذا من فضل دبی کی ٹیپ کل ہی کاٹ کر کھاؤ اور لٹاؤ کے کاروبار کا افتتاح کر دوں۔“ کفیل نے پان منہ میں دباتے ہوئے کہا۔

”جہنم میں جاؤ۔“

”چلا جاؤں گا۔ لیکن چانس نکٹ پر نہیں۔“ کفیل، بھائی کی جھلّا ہٹ سے محفوظ ہوتا ہوا بولا۔ ”سیٹ کنفرم ہو جائے، اس کے بعد ہی زحمت سفر باندھوں گا۔“

غرضیکہ وہ سب سے الگ تھلگ ایک علیحدہ ہی طبیعت کا مالک تھا۔ زیادہ پان کھانے سے اس کا چہرہ بھی بالکل اسی کی طرح گول مٹول ہو کر رہ گیا تھا۔ پان چباتے وقت منہ میں پیک ہو تو غاؤں غاؤں اور غیا غیا کر کے اپنا مفہوم واضح کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ زور سے ہنستے وقت اس کی آنکھ کے پونے پیشانی سے جا ملتے تھے اور چہرے پر بچپنے کی تمام علامتیں عود کر آتی تھیں۔ گھر کے اندر بھی اس کی وہی عادت تھی، جو دفتر میں تھی۔ بیوی سے اس طرح باتیں کرتا تھا، جیسے جنم جنم کی واقفیت ہو۔ لیکن اگر کبھی اتفاق سے ہانڈی میں نمک تیز یا کم ہو جائے تو بیوی کو بھی سانے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ گاڑی چلاتے وقت بھی وہ اس قدر باتیں کرتا تھا کہ اکثر و بیشتر اپنی منزل سے دور نکل جانے کے بعد اسے احساس ہوتا تھا کہ اسے جہاں جانا تھا وہ جگہ بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ رہن بہن کے معاملے میں بھی وہ زیادہ کڑو فرکا عادی نہیں تھا، زندگی سکون سے گزر جائے یہی اس کی خواہش رہتی تھی۔ دنیا دکھاوے کے لئے وہ شوبازی کرنے سے سخت نالاں تھا، آزاد اپند طبیعت کا مالک تھا اس لئے دوسروں کی زیادہ چون و چرا بھی اسے ناگوار لگتی تھی۔ ایک بار کسی دوست نے کہا۔

”یار کفیل! گھر میں کم از کم ایک آدھ ڈھنگ کا صوفہ ہی ڈال لو۔“

”ایک راج سے بات کی تھی۔“ وہ مسکرا کر لا پرواہی سے بولا۔

”دیوار کے ساتھ پتھر کا چپو تراہوا کر اس پر کٹن سجادوں گا۔ صوفے سے زیادہ ڈیورسبل

(Durable) اور پائیدار چیز رہے گی۔“

”یار! کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کرو..... اٹیلی جنس ڈائریکٹریٹ کے ذمے دار آفیسر ہو۔“

”ذمے داری کا صوفے سے کیا تعلق ہے؟“

”وہی جو تمہارا کسی خط الحواس سے ہے۔“ دوست جھلّا گیا۔

”خط الحواس میں بھی حواس کو بڑا دخل ہوتا ہے۔“

بہر حال اس کی تاریخی اور جغرافیائی کیفیت میں زمین و آسمان کا تضاد تھا۔ جو لوگ اس کے کیمرے کے بارے میں سنتے تھے، وہ حیرت انگیز قسم کے کیمرے کیسے کر لیتا ہے، میں اسے بہت

قریب سے جانتا ہوں۔ ہمارے درمیان خون کا رشتہ بھی ہے، وہ میرے بزرگ ہیں۔ ہمارے درمیان سالوں ملاقات نہیں ہوتی، عزیز رشتے داروں سے الگ تھلگ رہنا بھی موصوف کی عادت میں شامل ہے لیکن ان تمام اچھائیوں اور برائیوں کے باوجود میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک تاریخ ساز شخصیت کا مالک ہے، اس کے دو چار کیسز ایسے ہیں جو انٹرپول میں بھی سرفہرست شمار کئے جاتے ہیں۔ میں فی الحال ان کیسز میں سے ایک کو رقم کر رہا ہوں!!



اس روز بھی پی آئی اے کی فلائٹ کی روانگی کے وقت وہ ڈیپارچنگ لاؤنج میں کسی افسردہ مسافر کی طرح تنہا بیٹھا تھا، لیکن اس کی عقلمانی نظریں پنجرہوں کا ایکسرے کرنے میں مصروف تھیں۔ اچانک اس کی نگاہیں ایک سوئڈ بوئڈ شخص پر جم کر رہ گئیں جو اس سے تقریباً پچیس فٹ دور بیٹھا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کی چھٹی جس نے سوچ آن کیا تو اس کے ذہن میں سرخ بتی جلنی بجھنی شروع ہو گئی۔ لاؤنج میں آنے کا مطلب یہی تھا کہ اس کا سامان جہاز پر چڑھ چکا ہو گا اور اسے بورڈنگ کارڈ بھی مل چکا ہو گا۔ کچھ سوچ کر وہ اس آدمی کے قریب سے ہو کر گزرا۔ مسافر بظاہر معزز اور کسی اونچے طبقے کا فرد نظر آ رہا تھا۔ سنہرے فریم کا چشمہ جس میں ہلکے نیلے رنگ کا گلاس لگا ہوا تھا اس کی شخصیت میں اضافہ کر رہا تھا۔ اس کے قریب ایک چتر اور بریف کیس موجود تھا۔

کچھ دیر کفیل اس کے ارد گرد منڈلاتا رہا، پھر وہ تیزی سے کسٹم کاؤنٹر کی طرف لپکا جہاں اتفاق سے اس وقت اس کا بھائی ہی شفٹ انجام دے رہا تھا۔ وہ تیزی سے بھائی کے پاس گیا، اسے اپنی چھٹی جس میں بجنے والی خطرے کی گھنٹی کی روداد سن کر مسافر کا حلیہ بیان کیا تو بڑا بھائی اسے غور سے دیکھنے لگا۔

”تم اس پر کس قسم کا شبہ کر رہے ہو؟“

”بس یونہی۔ سوچ رہا ہوں اس کو بھی چیک کر لیا جائے۔“

”فضول ہے۔“ بڑے بھائی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہم لوگ اسے پہلے ہی اچھی طرح کھنگال چکے ہیں، دراصل اس شخص کے خلاف ہمارے پاس ایک انفارمیشن پہلے سے ہی تھی چنانچہ اس پر سب کی نظر تھی۔“

”نتیجہ کیا نکلا؟“

”صفر۔ اس کے سامان کا اسکریننگ (Screening) بھی دوبار کیا گیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میرے اشارے پر ایک ماتحت آفیسر نے اس کے سامان کو کھول کر بھی خاص طور پر چیک کیا لیکن کچھ برآمد نہیں ہوا۔“ بڑے بھائی نے کہا۔ ”اس شخص کا تعلق بہر حال کسی نہ کسی

خفیہ گینگ سے ضرور ہے لیکن چونکہ ہم اس کے پاس سے کچھ برآمد نہیں کر سکے اس لئے وہ خاصا غصے میں تھا، جس آفیسر نے اس کا سامان کھلوا دیا تھا وہ اسے بھی دھمکی دے رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی جڑیں اندر ہی اندر کسی بڑے آفیسر سے بھی ملتی ہوں۔“

”کتے کی کیا رپورٹ ہے؟“ کفیل نے سدھائے ہوئے کتوں کے سلسلے میں دریافت کیا۔

”ہمارے ملٹری کے کیپٹن نے سادہ لباس میں دو بار سدھائے ہوئے کتوں کو اس کے قریب سے گزارا لیکن کتے نے بھی اس کے سامان کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔“ بڑے بھائی نے اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”گویا کتے نے بھی اس کے بیج کو کلیئر کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے اپنے خلاف خبری کی اطلاع مل گئی ہو اور وہ محتاط ہو گیا ہو۔ ایک بات اور بھی ہے، سامان کھلنے کے بعد اس نے میرے ماتحت سے کہا تھا کہ وہ اس کو دوبارہ پیک کرے۔ میرے اشارے پر وہ آفیسر تیار بھی ہو گیا لیکن اس شخص نے جھلڑ کر سوٹ کیس کاؤنٹر سے نیچے کھینٹ لیا اور خود ہی دوبارہ پیکنگ کرنے لگا۔ اس تمام کارروائی کے دوران وہ مستقل بڑبڑا رہا تھا اور یہ بھی کہہ گیا ہے کہ وہ ہمارے عملے کے رف ٹرینٹ کے بارے میں کلکٹر سے ضرور شکایت کرے گا۔“

”مخبر کی انفارمیشن کیا تھی؟“ کفیل نے بدستور سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”میرا خیال ہے کہ تم اس پر وقت برباد کرو گے، ہمارا پورا ماہر عملہ اسے ہر طرح سے چیک کر چکا ہے۔“

کفیل نے گھڑی دیکھی، جہاز کی پرواز میں صرف ڈیڑھ گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ عام طور پر فلائٹ سے آدھے گھنٹے پیشتر بورڈنگ شروع ہو جاتی ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اسے جو کچھ کرنا تھا، اس کے لئے صرف پینتالیس منٹ یا ایک گھنٹہ رہ گیا تھا۔ وہ تیزی سے پھر ٹرینٹل تھری (اس زمانے میں جناح ٹرینٹل وجود میں نہیں آیا تھا) کے ڈیپارچنگ لاؤنج میں دوبارہ گیا اور مذکورہ مسافر کے پاس نہایت آرام سے بیٹھ گیا۔ بڑے بھائی سے روداد سن لینے کے بعد بظاہر اس کا شبہ بے بنیاد تھا، پھر بھی اس کی چھٹی جس اسے بار بار افسار ہی تھی۔

”آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟“ کفیل نے مسافر کو مخاطب کیا۔

”امریکہ۔“ مسافر نے جواب دیا، پھر بولا۔ ”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”ایک خطرے کی سمت۔“

”کیا مطلب؟“ مسافر نے اسے نفرت سے گھورا۔

جواب دینے سے پیشتر کفیل نے احتیاطاً اے ایس ایف کے عملے کے ایک سادہ لباس والے کو اشارے سے بلا کر اپنے قریب ہی بٹھالیا تھا۔

”مطلب خود مجھے بھی نہیں معلوم لیکن.....“  
 ”آپ کا تعلق کسی ایجنسی سے ہے؟“ مسافر نے جس کا نام رحیم خان تصور کر لیا جائے  
 (یہ اس کا اصل نام نہیں تھا) اخبار کو پلیٹ کر چتر کے نیچے دباتے ہوئے غصے سے دریافت  
 کیا۔

”جی..... میرا تعلق ایک خفیہ برانچ سے ہے۔“  
 ”اوہ.....“ وہ ایک دم ہی بھڑک اٹھا۔ ”گویا آپ حضرات شرافت سے میرا پچھا نہیں  
 چھوڑیں گے۔ کیا سامان پر جہاز لوڈ ہونے کے بعد اور بورڈنگ مل جانے کے باوجود آپ کو  
 اس کا اختیار ہے کہ کسی مسافر کو بلاوجہ تنگ کریں؟“  
 ”شبے کی بنیاد پر ہر اقدام کیا جاسکتا ہے۔“

”اطلاعا عرض ہے کہ میرا سامان کھولا جا چکا ہے، اسے آپ کے کتے بھی سونگھ چکے ہیں،  
 اب کیا شبہ باقی رہ گیا؟“

”آپ کا بریف کیس خاصا قیمتی لگ رہا ہے۔“ کفیل نے بلاوجہ چڑے کے بریف  
 کیس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”کہاں سے خریدا تھا؟ خاصا قیمتی لگ رہا ہے۔“  
 ”اس پر سیورٹی والوں کا تصدیق شدہ ٹیگ بھی لگا ہے۔“ وہ جھٹکا کر بولا۔

”میں اسے دیکھ رہا ہوں، مگر.....“  
 ”تمہارے فرشتے بھی اب مجھے پریشان نہیں کر سکتے۔“ وہ دانت پیس کر بولا۔ ”تم  
 میری حیثیت سے واقف نہیں ہو ورنہ قریب آنے کی بھی حماقت کبھی نہ کرتے۔“  
 ”کیا آپ ہمارے افسران سے ہمارے رویے کی شکایت کریں گے؟“ کفیل نے بڑی  
 سادگی سے دریافت کیا۔

”صرف رپورٹ ہی نہیں، میں تم لوگوں پر ہتک عزت کا دعویٰ بھی کروں گا۔“  
 ”ایسی صورت میں تو میرے لئے اپنے شبے کی تصدیق اور ضروری ہوگئی ہے۔“ کفیل  
 عجیب انداز میں مسکرایا۔ ”جب مرنا ہی مقدر ہو تو پھر انسان کو مرنے سے پہلے اپنی حسرت تو  
 پوری کر لینی چاہئے۔“

”تمہارا شاید دماغ خراب ہو گیا ہے۔ گیٹ لاسٹ۔“ سوئڈ بوئڈ شخص اور تپ اٹھا۔  
 کفیل اٹھ کر دوسری جانب آگیا جدھر سوٹ کیس رکھا تھا۔ اس عمل کے دوران اس نے  
 جیب میں پڑا ہوا وہ سوا بھی جیب سے نکال کر ہاتھ میں دبا لیا تھا جو ایسے موقع پر نہایت  
 ہوشیاری سے کسی کا سامان چیک کرنے کے کام آتا ہے۔ دوسری جانب آنے کے بعد اس نے  
 اے ایس ایف کے ساتھی کو اشارہ کیا کہ وہ مسافر کو اپنی جانب متوجہ کر لے۔  
 ”محترم!“ اس نے کفیل کے اشارے پر رحیم خان سے کہا۔ ”جب آپ کے ہاتھ صاف“

ہیں تو تلاشی دینے میں نقصان بھی کیا ہے؟“  
 ”گوہ..... گویا تم دونوں کسی لمبی ٹپ کی خاطر مجھے گھیرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ ایک  
 پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

کفیل کے لئے بس اتنی ہی مہلت کافی تھی، اس نے نہایت مہارت سے سوا مار کر  
 بریف کیس کے ایک طرف جھوٹا سا سوراخ کیا، پھر سوائے کے اس حصے کو زبان پر رکھا تو اس  
 کا منہ کڑوا ہو گیا۔ اس نے اے ایس ایف کے ساتھی کو اشارہ کیا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر غسل  
 خانے کی طرف دوڑا۔ مسافروں کی اچھی خاصی تعداد اس کو دوڑتا ہوا دیکھ رہی تھی، لیکن وہ بڑی  
 مشکل سے اپنی تپ کو روک رہا تھا۔ غسل خانے میں جا کر اس نے تپ کی، پھر حلق صاف  
 کرتا ہوا دوبارہ رحیم خان کے قریب آگیا، جو ابھی تک صورت حال کو نہیں سمجھ سکا تھا۔

”میرے محترم خان صاحب! کیا آپ میرے ساتھ میرے کمرے تک جانا پسند کریں  
 گے؟“ کفیل نے بڑے مدہم لہجے میں کہا۔ ”پاکستان کی ایک مشہور ہیر وئن کے سلسلے میں آپ  
 سے کچھ تبادلہ خیال کرنا ہے۔“

”تم انتہائی ڈھیٹ اور.....“  
 ”بس کرو خان صاحب! ورنہ میں سب کے سامنے تمہاری شرافت کا بھانڈا پھوڑ دوں  
 گا۔“ کفیل کے لہجے میں کسی بھیڑیے جیسی غزاہٹ موجود تھی۔

رحیم خان ہیر وئن کے نام پر چونکا تھا، پھر بھی وہ غصے میں بھرا اٹھا، چتر کو ایک ہاتھ ڈالا،  
 بریف کیس دوسرے ہاتھ میں لے کر کفیل کے ساتھ چل پڑا۔ سی آئی پی (C.I.P) روم میں  
 پہنچنے کے بعد (جہاں بہت اہم شخصیات کو جانے کی اجازت ہوتی ہے) کفیل نے گھور کر رحیم  
 خان کو دیکھا، پھر ایک موٹی سی گالی دے کر بولا۔

”..... کی اولاد! تم بہت چڑھ چڑھ کر بول رہے تھے۔ اب بتاؤ کہ میں تمہارے ساتھ  
 کیا برتاؤ کروں؟“

”کس سلسلے میں؟“  
 ”ہیر وئن کے سلسلے میں۔“ کفیل غزاہٹ سے لپٹا۔ پھر اس نے اے ایس ایف کے ساتھی سے کہا  
 کہ اس کا اسپاٹ ٹیسٹ کٹ (Spot Test Kit) کمرے سے لے آئے۔  
 ”سنو!“ اس کے جانے کے بعد رحیم خان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”کشم کا تمام عملہ اور  
 ٹرینڈ ڈاگز (Trained dogs) بھی میرے سلسلے میں ناکارہ ثابت ہو چکے ہیں۔ اس کے  
 باوجود میں تم کو پچاس ہزار کیش دینے کو تیار ہوں۔“

”وہ کس خوشی میں؟“  
 ”اگر میری فلائٹ مس ہوگئی تو مجھے لاکھوں کا نقصان ہو جائے گا۔ میں ایک کاروباری

آدی ہوں اور کاروبار میں اگر ایک بار ساکھ خراب ہو جائے تو پھر مشکل سے بنتی ہے۔ پچاس ہزار تمہیں مفت میں مل جائیں تو کیا برا ہے؟“

”میرا شمار مفت خوروں میں نہیں ہوتا۔“ کفیل نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ ”پچاس لاکھ بھی میرے لئے بہت کم ہیں۔ اس سے زیادہ کی بات کرو۔“

”ٹھیک ہے، تم اپنا شبہ بھی دور کرلو۔“ رحیم خان آرام سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

اتنی دیر میں کفیل احمد نے سپاہی کو اس ملٹری کیپٹن کو بلانے کو بھیج دیا جو عام طور پر ٹرینڈ ڈاگ کا استعمال مخصوص مواقع پر کرتے ہیں۔ اے ایس ایف کے آدی کے آنے سے پہلے ملٹری کیپٹن کتے کو لے کر آگیا۔ کفیل کی درخواست پر اس نے ایک بار پھر کتے کو بریف کیس سونگھایا لیکن اس بار بھی کتے نے کسی خطرے کا سگنل نہیں دیا، کیپٹن کو ہمدردانہ نظروں سے دیکھ کر مسکراتا ہوا واپس چلا گیا۔

”اب تو تمہیں یقین آگیا کہ تمہارا شبہ بے بنیاد ہے۔“ رحیم خان نے سینہ تان کر کہا۔

”میں اب پچاس ہزار کی آفر بھی واپس لیتا ہوں۔“

کفیل رشوت کی اس گالی کو دوسری بار برداشت نہ کر سکا، اس کا الٹا ہاتھ پوری قوت سے فضا میں لہرایا اور پلک جھپکتے میں پانچ انگلیوں کے نشان ابھر کر رحیم خان کے چہرے پر واضح ہو گئے۔

”خزیر کا بچہ.....“ رحیم خان کسی زخمی تیندوے کی طرح جھپٹ پڑا۔ اے ایس ایف کے کارندے نے بمشکل بیچ بچاؤ کرایا۔ اس ہنگامہ آرائی کی خبر پلک جھپکنے میں پورے ٹریمنٹل میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ کفیل کا بڑا بھائی اپنے ماتحتوں کے ساتھ وہاں آگیا۔ رحیم خان کی اچھی خاصی دھنائی ہو گئی لیکن وہ کسی زخمی درندے کے مانند دھاڑ رہا تھا۔

”میں تم میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔ تمہیں اوپر والوں کو جواب دینا پڑے گا، میں تمہارے پورے محکمے کو ہلا کر رکھ دوں گا۔“

”اس سے پہلے میں تجھے زندہ ہی نہیں چھوڑوں گا۔“ کفیل احمد نے دوبارہ اس کی طرف بڑھنا چاہا، لیکن تین ساتھیوں نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ ہیروئن کا ذائقہ جو نیم کے بیج سے بھی زیادہ کڑوا ہوتا ہے ابھی تک اس کے منہ میں موجود تھا۔ اس کا ذہن اس وقت بھی اسی بات کی گردان کر رہا تھا کہ کہیں نہ کہیں ہیروئن ضرور موجود ہے۔

اسی وقت ایئر پورٹ اور سکیورٹی فورس کے علاوہ دوسرے عملے کے افراد بھی وہاں جمع ہو گئے۔ اچانک کفیل کی نظر ایک انتہائی ذمے دار شخص پر پڑی۔

”مسٹر رضوی!“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ”پلیز، اس کا سامان جہاز سے اُترالیں۔“

”میں اس کا مجاز ہوں، لیکن بغیر کسی ثبوت یا اتھارٹی کے میں ایسا نہیں کر سکتا، فلائٹ میں

اب صرف بیس منٹ باقی رہ گئے ہیں۔“

”کیا اس شخص کا سامان اُتروانے کی کوئی صورت نہیں ہے؟“

”ایک طریقہ ممکن ہے، وہ بھی اپنی ذمے داری اور آپ کی اتھارٹی پر کر سکتا ہوں۔“

”کس قسم کی اتھارٹی چاہئے آپ کو؟“ کفیل نے دریافت کیا۔

”آپ کو اپنے لیٹر ہیڈ پر باقاعدہ سیل لگا کر اور معتبر گواہوں کے دستخط کے ساتھ مجھے یہ

لکھ کر دینا ہوگا کہ مسافر اور اس کے سامان کو آپ اُتر دار ہے ہیں۔ جس کی تمام تر ذمے داری

آپ پر ہوگی اور سیاہ و سفید کے ذمے دار بھی آپ ہوں گے۔“

کفیل نے اسی وقت سپاہی سے اپنا لیٹر ہیڈ منگوا یا اور مطلوبہ تحریر لکھ کر دو گواہوں سے

دستخط کرائے اور آفیشل سیل لگا کر متعلقہ افسر کے حوالے کر دیا جس کے بعد وہ فوراً ہی C.I.P

روم سے باہر نکل گیا۔

”تم یہ کیا حماقت کر رہے ہو؟“ اس کے بڑے بھائی نے ایک طرف ملجھ جا کر اسے

سمجھایا۔ ”ہم سب اس کے تمام سامان کی تلاشی لے چکے ہیں۔ کشم ہاؤنڈ (منشیات کی خوشبو

سونگھنے کا سدھایا ہوا ماہر کتا) نے بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ سامان اُتر کر تم مصیبت میں پھنس

جاؤ گے۔“

”اگر میرا سامان جہاز سے اُترتا تو تمہاری ملازمت بھی برقرار نہ رہ سکے گی۔“ رحیم خان

دوبارہ چیخا۔ اس کے منہ سے بھی جھاگ نکل رہے تھے جو اس بات کا ثبوت تھے کہ اس کے

پاس کوئی قابل گرفت اشیاء نہیں ہیں۔

”تم مجھے ملازمت سے برطرف کراؤ گے؟“ کفیل نے اسے تحارت سے گھورا۔ ”تمہاری

یہ حسرت بھی اسی وقت پوری ہوگی، جب تم زندہ بچو گے۔“ کفیل ہاتھ جھٹک کر دوبارہ جھپٹ

پڑا۔ پھر قبل اس کے کہ لوگ اسے دوبارہ پکڑتے اس کا نپٹا گھونسا رحیم خان کے منہ پر پڑا اور

اس کے ہونٹوں سے خون کی لیکر اُبل پڑی۔

”پاگل ہو گئے ہو کیا؟“ اس کے بھائی نے سرزنش کی۔ ”اب بھی وقت ہے، اسے جانے

دو، کچھ نہیں ہوگا۔ ہم سب تمہارے حق میں گواہی دیں گے، لیکن اسے روکنے اور اس کے

سامان کو ان لوڈ کرانے کے بعد۔“

”کچھ بھی ہو، لیکن میں اس کے سامان کو ضرور روکوں گا اور یہ بھی کم از کم اس فلائٹ سے

نہیں جاسکے گا۔“ کفیل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا، پھر اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر تحکمانہ

لہجے میں بولا۔

”ان صاحب بہادر کو بریف کیس سمیت میرے کمرے میں گھسیٹ لاؤ۔“

کفیل اس وقت دیوانہ ہو رہا تھا، لوگ اس کے اصول اور غصے دونوں سے واقف تھے

اس لئے کسی نے درمیان میں ٹانگ پھنسانی مناسب نہیں سمجھی، کفیل تیزی سے C.I.P. روم سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ رجیم خان کے منہ سے اس وقت مغلظات گالیوں کا سیلاب اُڑ رہا تھا، لیکن چار مسلح سپاہیوں اور سکیورٹی کے عملے کی موجودگی میں اس نے ساتھ جانے میں کوئی مزاحمت نہیں کی۔ مارپیٹ اور کھینچا تانی میں اس کا حلیہ پہلے ہی بہت خراب ہو چکا تھا۔

رجیم خان کے کمرے میں پہنچنے کے بعد اس کا سامان بھی جہاز سے اُتروا کر کفیل کے کمرے میں پہنچا دیا گیا اور اس سے سامان ملنے کی تصدیق بھی کروالی گئی۔ اس کا بڑا بھائی پریشان پریشان اس کے ساتھ ہی تھا۔

”خدا کے لئے اپنی پگلوٹی سے باز آ جاؤ، ورنہ بحیثیت شفٹ انچارج کے میری ملازمت پر بھی بات آ سکتی ہے۔“

”ہمارا جیورسڈکشن (Jurisdiction) اور ہمارے اختیارات الگ الگ ہیں۔“ کفیل نے کہا۔ ”تم مطمئن رہو، ملازمت اگر گئی تو صرف میری جائے گی، جس کی مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔“

”تم میری بات بھی نہیں مانو گے؟“

”اس حرامزادے کے پاس ہیروئن ہے۔“ کفیل نے رجیم کو گھورتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

”کہاں ہے؟“ اس کے بھائی کو بھی غصہ آ گیا۔ ”صرف تمہاری زبانی جمع خرچ سے تو اس کو پھانسی کے پھندے پر نہیں لٹکا دیا جائے گا۔“

”خدا کے لئے بھائی! میں تمہاری منت کرتا ہوں۔“ اس نے ہاتھ جوڑ کر بڑے بھائی سے کہا۔ ”تم اپنے شیڈ میں جا کر کام کرو۔ کچھ بھی ہو جائے، اس وقت میں اپنے فرض کی ادائیگی میں اپنے باپ کی بات بھی نہیں مانوں گا۔“

کفیل کے بڑے بھائی نے آخری بار اسے غصے سے دیکھا، پھر کمرے سے مل کھاتا ہوا نکل گیا۔ رجیم خان کا سوٹ دوسوٹ کیس پر مشتمل تھا، جو چمڑے کے بنے ہوئے تھے اور ان کی رنگت بتا رہی تھی کہ پہلی بار استعمال میں آئے ہیں۔ رجیم خان اب بھی غصے میں بیچ و تاب کھا رہا تھا۔ کمرے میں اب اس کے کفیل اور چار مسلح سپاہیوں کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔

”اب بتاؤ، رجیم خان!“ کفیل نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اسے غصے اور نفرت سے گھورا۔ ”ہیروئن کہاں ہے؟“

”جہنم میں۔“

”میں تمہیں بھی جہنم میں پہنچا کر دم لوں گا۔“

”صاحب! اس کے سامان کی بجلیہ ادھیڑوں؟“ ایک سپاہی نے نئے سوٹ کیسوں کی طرف اشارہ کر کے سوال کیا۔

”نہیں..... فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”پھر مشیر نامہ کیسے بنے گا؟ گواہوں کے بیانات اور سیزر رپورٹ (Seizure Report) کیسے مکمل ہوگی، سر؟“

بات معقول تھی، کفیل کے ذہن میں اب بھی ہیروئن کا تصور رہ کر اُبھر رہا تھا۔ اُس کی چھٹی جس گواہی دے رہی تھی کہ اس نے ایک عجیب و غریب کیس پکڑا ہے لیکن اس کا ثبوت۔ ثبوت ابھی تک اس کے سامنے نہیں آ کا تھا۔ احتیاطاً اس نے دونوں سوٹ کیس زمین پر اوندھے گرا دیئے۔ ایک ایک چیز کو بنظر غور دیکھا، لیکن کوئی قابل اعتراض شے برآمد نہیں ہوئی۔ ایک سپاہی نے کفیل کے اشارے پر رجیم یار خان کے سامان کو انتہائی بے دردی سے دوبارہ سوٹ کیس میں ٹھونس دیا۔ رجیم خان ابھی تک غصے میں کھڑا بیچ و تاب کھا رہا تھا۔ پھر اس نے تھک ہار کر بیٹھنا چاہا لیکن کفیل نے غرا کر سپاہیوں کو حکم دیا۔

”اسے کھڑا رکھو..... یہ میری ملازمت لے گا۔ اس لئے فی الحال اس کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے۔“

کفیل نے ایک بار پھر بریف کیس کو میز پر رکھ کر دیکھا، اسے کھول کر اندر سے سارا سامان نکال کر دیکھا، جو ضروری کاغذات اور سفری ڈاکومنٹس پر مشتمل تھا۔ کچھ سوچ کر کفیل نے بریف کیس کے ایک مختصر ٹکڑے کو کاٹ کر علیحدہ کیا اور اسے ٹیسٹ ٹیوب میں ڈالا جس کے اندر ایک مخصوص قسم کا ایسڈ (Acid) موجود ہوتا ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ گلاس ٹیوب بھی اسپاٹ ٹیسٹ کٹ کے ساتھ ہی ملتی ہے اور اس کے اندر جو ایسڈ ہوتا ہے وہ ہیروئن ٹیسٹ کی تمام عزیز داروں کو بے نقاب کرنے میں نہایت موثر ثابت ہوتا ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ اگر اس میں ہیروئن، کوکین یا مارفین وغیرہ کو ڈالا جائے تو گلاس ٹیوب کے اندر موجود محلول کا رنگ ویلٹ (Velyet) ہو جاتا ہے۔

بریف کیس کے ٹکڑے کو ٹیسٹ ٹیوب میں ڈالتے وقت کفیل کا دل دھڑک رہا تھا، وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس کا شبہ غلط ہوا تو اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ ڈیپارچر لاؤنچ میں اسے قے ہونے کی وجہ کچھ اور بھی ہو سکتی تھی، ممکن ہے اس کے سُوئے میں ہیروئن کی ایک معمولی سی مقدار پہلے سے لگی رہ گئی ہو یا پھر مخبری کی اطلاع ہو جانے کے بعد بریف کیس میں رکھی ہوئی ہیروئن نکال دی گئی ہو اور اس کی محض ایک مختصر ترین مقدار نے، جو باقی رہ گئی ہو، اس کا منہ کڑوا کر دیا ہو۔ بہر حال کفیل کا دل اس وقت اُمید و نیم کی ملی جلی کیفیتوں سے دوچار تھا۔ جب بریف کیس کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹیسٹ ٹیوب میں گیا تھا۔ لیکن پھر دوسرے ہی

نہیں لگا سکتا تھا۔ کیا سمجھے؟“

”اتنا تو سمجھ ہی لیا ہے کہ تم ہیر و ن اسٹگل کرنے والے گروہ کے کوئی فرد ہو۔“

”ثبوت کیا ہے تمہارے پاس..... یہ ٹیسٹ ٹیوب۔“ رحیم خان نے بڑے خطرناک اور شاطرانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”تم نے میرا بریف کیس تباہ کر دیا، میری نگاہوں کے سامنے تم نے بریف کیس کے ایک ٹکڑے پر اپنے پاس پہلے سے موجود تھوڑی سی ہیر و ن لگائی اور مجھے ہلکے میل کرنے لگے۔ کھانے کمانے کا اچھا دھندا اختیار کیا ہے۔“

”کفیل کی کھوپڑی ایک بار پھر گھوم گئی۔ رحیم خان نے جو بکواس کی تھی، وہ سراسر غلط تھی۔ لیکن مال برآمد نہ ہونے کی صورت میں اس کے ذہن کی اختراع کفیل کے لئے ڈیپارٹمنٹل انکوائری کے راستے ضرور ہموار کر سکتی تھی، اس کی بنی بنائی عزت خاک میں مل سکتی تھی۔“

”سوچ رہا ہوں کہ تمہارے ساتھ سب سے مناسب برتاؤ کیا ہو سکتا ہے۔“ وہ دل میں اٹھنے والے دوسو سو کے باوجود ٹھوس آواز میں بولا۔

”مجھے جانے دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ بچہ سمجھ کر تمہیں معاف کر دوں گا، ورنہ.....“

”ورنہ کیا؟“

”تمہارے افسران بھی میری جیب میں پڑے ہوتے ہیں۔ کھانے کو صحت مند غذا نہ ملے تو انسان کمزور ہو جاتا ہے، لیکن تمہارے افسران خالص اور مرغن غذا کے عادی ہیں۔“

رحیم خان نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ”تم شاید اب میرا مقصد سمجھ گئے ہو گے۔“

”اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم چھوٹ جانے کے بعد میرے خلاف کسی حرامزدگی کا ثبوت نہیں دو گے؟“

”میں پٹھان ہوں اور پٹھان کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔“

”اسی لئے تو کہہ رہا ہوں، خان صاحب بہادر! کہ اب کھل جائیے، ورنہ میرے پاس اور بھی ذرائع ہیں آپ کو راہ راست پر لانے کے۔“

”کیا چاہتے ہو؟“ اس بار رحیم خان نے مدھم اور کمزور لہجے میں پوچھا۔

کفیل کا دل پھر تیزی سے دھڑکنے لگا۔ رحیم خان کے لہجے کی کمزوری اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ مجرم ہے لیکن ثبوت ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا۔ پتویشن نے عجیب معرکہ کی سی صورت اختیار کر لی تھی، جو ابھی تک حل نہیں ہو سکا تھا۔

”کوئی ایسی صورت نکالو میری جان! کہ ہمیں مرغن غذا بھی مل جائے اور تم بعد میں اپنی زبان بھی نہ کھول سکو۔“

”ہمارے کاروبار میں صرف زبان پر کاروبار ہوتا ہے۔ ایک دوسرے پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ تمہیں بھی کرنا پڑے گا۔“

لحے وہ فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگا۔ ایسڈ کا رنگ ویلوٹ ہو جانے کے بعد اب اس کا شبہ یقین کی صورت میں بدل چکا تھا۔ اس کے سپاہیوں نے اس کے حکم پر بریف کیس کے متعدد ٹکڑے کر ڈالے لیکن نہ تو اس کے اندر کوئی فالس باٹم (False Bottom) ملا نہ کوئی ایسا خلاف نظر آیا، جس کے اندر ہیر و ن موجود ہو۔

کفیل کی کیفیت اس وقت ایسی ہی تھی، جیسے اس کے ایک جانب پھولوں کی بیج ہو اور دوسری جانب خاردار راستہ۔ وہ کامیاب ہو جانے کے بعد بھی خود کو ناکام سمجھ رہا تھا۔ ایک لمحے تک وہ رحیم خان کو خالی خالی نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر اس نے سوچا کہ کبھی اگر سیدھی انگلی سے نہیں نکلا تو اسے ٹیڑھی کر کے بھی آزمانے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بات بھی اس کی فطرت کے خلاف تھی۔ لیکن اس نے حالات کے پیش نظر دل پر جبر کر کے سرسراتے لہجے میں رحیم خان سے کہا۔

”اب بتاؤ تم کس طرح اپنا اگلا سفر طے کرنا پسند کرو گے؟ ریل میں یا جیل میں؟“

”میں تمہاری باتوں کا جواب دینا پسند نہیں کرتا۔“ رحیم خان نے تملاکر کہا۔ ”اب بات تمہارے اوپر والوں کے سامنے ہوگی۔“

”ہیر و ن مل جانے کے باوجود تم ابھی تک کلف شدہ لباس کی طرح اکڑے ہوئے ہو۔“

کفیل دوستانہ انداز میں مسکرایا۔ ”ٹٹھے کے تھان کی طرح کھل جاؤ، رحیم خان! ورنہ تم یقیناً واقف ہو گے کہ میرا ٹاپ کیا ہے؟“

”کیا کر لو گے تم میرا؟“

”بات جب شرافت سے طے نہ ہو سکے تو پھر کمینگی ہی کا ایک ذریعہ باقی رہ جاتا ہے، وہی آزمائش گا۔“ کفیل کا لہجہ دوبارہ تلخ ہو گیا۔ ”میں تمہیں بے عزت کر کے کیرے کی مخصوص حالت میں تمہارے کچھ ایسے پوز حاصل کر لوں گا کہ زبان تو زبان، تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔“

”اس وقت میں تمہارے قبضے میں ہوں، کفیل صاحب! جو حسرت نکال سکتے ہو، ابھی نکال لو۔ کل اس کا موقع نہیں ملے گا۔“

”اونچی پہنچ معلوم ہوتی ہے۔ کیوں؟“ کفیل بے پروائی سے مسکرایا۔ وہ بڑے مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ کامیابی اور ناکامی کے دورا ہے پر کھڑا ہونے کے باوجود وہ مسکرا رہا تھا۔ اسے علم تھا کہ اگر وہ اس کیس کو ثابت نہ کر سکا تو اسے نہ صرف بے عزت کر کے ملازمت سے نکالا جاسکتا تھا، بلکہ سزا بھی ہو سکتی تھی۔

”لبی چوڑی بات چھوڑو۔“ رحیم خان نے جواب دیا۔ ”ہمیں اس بات کی اطلاع مل گئی تھی کہ کسٹم کو جبری ہو گئی ہے، ایسی صورت میں، میں جان بوجھ کر موت کے منہ میں چھلانگ



کے بدلے معاوضہ یا معاوضے کے بدلے مال فراہم کر دیتے تھے۔ لیکن رحیم خان کے اس سو روپے کے نوٹ میں ایک جدت پیدا کی گئی تھی۔ وہ درمیان سے بڑی خوب صورتی سے ٹرانسپیرنٹ ٹیپ سے جوڑا گیا تھا۔ نوٹ کے ایک حصے پر کچھ اور نمبر تھا اور دوسرے حصے پر دوسرا نمبر تھا۔ یقیناً ایسا ہی ایک اور نوٹ اس شخص کے پاس رہا ہوگا جس سے اپنی منزل پر پہنچ کر رحیم خان کو ملاقات کرنی تھی۔

”تمہارا کراماتی نوٹ رحیم خان!“ کفیل نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔ ”اس کے بارے میں تم کیا کہو گے؟“

”یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ یہ نوٹ مجھے اسی حالت میں ملا ہے اور یہ الزام بھی لگا سکتا ہوں کہ تم نے مجھے محض پھانسنے کی خاطر یہ آخری حربہ بھی استعمال کر ڈالا۔ صرف اس نوٹ کی وجہ سے تم میرا بال بھی بیکانہیں کر سکو گے۔“

”صاحب!“ سپاہی گل حمید نے کہا۔ ”اس کو دفتر سے چل کر گرم کرتے ہیں، شرافت سے یہ زبان نہیں کھولے گا۔“

”کیوں خان صاحب؟“ کفیل نے رحیم خان سے دریافت کیا۔ ”آپ کیا پسند کریں گے؟ ناپسندیدہ ذرائع کا استعمال یا شرافت کی زبان؟“

”یہ فیصلہ تمہیں اپنے لئے کرنا ہے، میرے لئے نہیں۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”اب تک تم نے جو کچھ کیا ہے، صرف مجھ سے مالی غنیمت اٹھانے کی غرض سے کیا ہے لیکن اس کے باوجود تم میرے قبضے سے کوئی ایسی ناجائز چیز برآمد نہیں کر سکے، جس کی بنا پر مجھے مجرم ثابت کر سکو۔“

کفیل نے ایک لمحہ غور کیا، حالات نے اب وہی سچویشن اختیار کر لی تھی کہ نگلو تو اندھا اور اُگلو تو کوڑھی۔ چوہے اور بلی کا کھیل ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ اس وقت بھی رحیم خان کو نگاہوں نگاہوں میں تول رہا تھا اور رحیم خان کسی آہنی چٹان کی طرح اس کے سامنے جما کھڑا تھا۔

”تم جیل جانا پسند کرو گے یا کوئی شخصی ضمانت پیش کرو گے؟“

”کیا مطلب؟..... کس جرم میں؟“

”شٹ اپ!“ کفیل گرج کر بولا۔ ”دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے، لیکن میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔ رہا ثبوت پیش کرنا تو وہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ جس طرح تم مجھ پر یہ الزام لگا سکتے ہو کہ میں نے بریف کیس کے ٹکڑے کو گلاس ٹیوب میں ڈالنے سے پیشتر اس پر اپنے پاس سے ہیر و دُن لگائی تھی اور سو روپے کا وہ ایک مگر دو مختلف نمبروں والا نوٹ بھی میں نے تمہیں پھانسنے کی خاطر تیار کیا تھا۔ اسی طرح ہیر و دُن کی ایک معقول مقدار بھی تمہارے سوٹ کیس سے برآمد ہونے کا کیس بنا سکتا ہوں۔“

کفیل کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ابھی تک اس نے رحیم خان کی جامہ تلاشی لینے کا کام سرانجام نہیں دیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک اس پہلو پر غور کرتا رہا، پھر کرسی سے اٹھا اور ایک سپاہی سے بولا۔

”گل حمید! تم اس کی تلاشی لو۔“

”اب تم بات خود بڑھانے کی کوشش کر رہے ہو۔“ رحیم خان نے کسمسا کر کہا۔

”مال کی قیمت یونہی تو نہیں لگائی جاتی۔ اسے ہر زاویے سے دیکھنا پڑتا ہے۔ کندن پر گھس کر دیکھنا پڑتا ہے کہ سونا نہیں کیرٹ ہے یا چوبیس کیرٹ کا۔ اس کے بعد ہی اصل مالیت کا اندازہ ہوتا ہے۔“

”بلایند کھینے کے فن سے ناواقف معلوم ہوتے ہو۔“

”تم جیسے دو چار اور خزانٹ اور گرگ جہاں دیدہ قسم کے آدمیوں سے واسطہ پڑا تو وہ بھی سیکھ جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ تم اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال لو۔ کل میری باری ہوگی۔“

سپاہیوں نے جامہ تلاشی لینے سے پہلے ہی رحیم خان سے کہا کہ اگر کوئی پرس اس کے پاس ہے تو نکال کر کفیل صاحب کی میز پر رکھ دے۔ رحیم خان نے مسکرا کر کفیل کو دیکھا، پھر ایک چرمی پرس جس کے اوپر اس کا نام بھی سنہری لفظوں میں لکھا ہوا تھا، جیب سے نکال کر میز پر ال دیا۔ پرس خاصا وزنی لگ رہا تھا۔ بڑے بڑے نوٹوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ باہر سے ہی نظر آ رہے تھے۔ سپاہی جامہ تلاشی کا کام انجام دے رہے تھے اور کفیل، رحیم خان کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا جس پر اضطراب کی ایک معمولی سی تلچھٹ بھی نہیں تھی۔ جامہ تلاشی مکمل ہو گئی تو رحیم خان نے فاتحانہ انداز میں مسکرا کر کفیل سے کہا۔

”تم کہو تو لباس بھی اتار دوں تا کہ تمہارے شے کی تصدیق میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔“

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔“ کفیل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ پھر کسی خیال کے تحت اس نے پرس کو اٹھایا، اندر سے تمام نوٹ نکال کر میز پر ڈال دیے اور ان کو ایک ایک کر کے اٹھا کر غور سے دیکھتا رہا، پھر سو روپے کا ایک نوٹ اٹکے رے شیٹ کی طرح اس کے ہاتھ میں دبا رہ گیا۔ وہ اس نوٹ کو بغور دیکھتا رہا، پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل کر گہری ہوتی چلی گئی۔ اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر رحیم خان کو بغور دیکھا، وہ اب بھی مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس کے مجرم ہونے کا ایک اور ثبوت کفیل کے ہاتھ میں تھا۔ یہ طریقہ بھی نیا نیا ایجاد ہوا تھا، عام طور سے دس روپے کے نوٹ کا پھٹا ہوا ایک ٹکڑا ایک شخص کے پاس ہوتا تھا اور دوسرا کسی اور کے پاس ہوتا تھا، جس کے ذریعے دونوں ایک دوسرے کی شناخت کر لیتے تھے۔ مال

”یہ سراسر ظلم ہے۔“ رحیم خان نے احتجاج کیا۔ کسٹم کاؤنٹر پر میرے سامان کی چیکنگ، اسکریننگ اور سدھائے ہوئے کتے کی ناکامی اس بات کا ثبوت ہے کہ میرے پاس کوئی مال نہیں ہے۔ پھر ایک اہم بات اور ہے۔ تم نے میرا سامان ایئر لائن کے ڈمے دار آفسر سے اپنی پرسنل اتھارٹی پر آن لوڈ (Unload) کرایا ہے۔ اس کے پاس تمہاری تحریر موجود ہے، جو میرے حق میں جائے گی۔ سامان چیکنگ اور اسکریننگ کے بغیر جہاز پر لوڈ نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے پاس بورڈنگ کارڈ ہے، یہ بھی تمہارے خلاف کام آئے گا۔ پاسپورٹ پر امیگریشن کی مہر بھی لگی ہوئی ہے۔“

”خاصے گھاگ معلوم ہوتے ہو..... پہلے کتنے ٹرپ لگا چکے ہو؟“

”اس کا جواب تم اپنے افسران سے پوچھنا۔“

کفیل سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے ایک آخری فیصلہ کر کے ایئر پورٹ کے ہی دو معزز گواہوں کو بلا کر ان کے سامنے تمام سامان کو سیل کیا، خاص طور پر بریف کیس کے ٹکڑوں کو اس نے ایک علیحدہ تھیلے میں بند کر کے اپنی سیل لگا دی تھی، جس کا تذکرہ مشیر نامہ میں موجود تھا۔ کاغذات کی جملہ کارروائی گواہوں کی موجودگی میں مکمل ہونے کے بعد مشیر نامہ پڑھ کر رحیم خان کو سنایا گیا، جس میں بریف کیس کے ٹکڑے کی ٹیسٹ چیکنگ کا حوالہ بطور خاص دیا گیا تھا۔ سوٹ کیس کے بارے میں اس نے یہ لکھا تھا کہ وہ انہیں بعد میں دوبارہ معزز گواہوں کی موجودگی میں چیک کرے گا۔ رحیم گل نے مشیر نامہ پڑھا، پھر مسکرا کر اس پر دستخط کر دیئے۔

”یہ آپ نے کیا کیا، کیا کفیل صاحب؟“ امیگریشن سے تعلق رکھنے والے گواہ نے دبی زبان میں کہا۔ ”یہ کارروائی تو آپ کے اپنے خلاف جائے گی۔“

”بعد کی بات ہے۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

اس کے بعد رحیم خان نے فون کر کے اپنے ضامن کو بلایا، کفیل نے ضامن کو دیکھا تو چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ ایک ریٹائرڈ سینئر پولیس آفسر کا بیٹا تھا، جو کاروباری اعتبار سے اپنی ساکھ بھی رکھتا تھا۔ فرض کر لیجئے کہ اس کا نام صلاح الدین تھا، اس کی تھوڑی بہت صاحب سلامت کفیل سے بھی تھی، چنانچہ اس نے مصافحہ کرنے کے بعد کہا۔

”کیا ایسا ممکن نہیں ہو سکتا کہ یہ سارا کھیل یہیں ختم کر دیا جائے؟“

”کھیل تو اب شروع ہو گا۔“ اس نے رحیم خان کی طرف دیکھتے ہوئے صلاح الدین سے کہا۔ ”اس دو کوڑی کے اسمگلر نے مجھے ملازمت سے برطرف کرانے کی دھمکی دی ہے۔“

میں نے اس چیکنگ کو قبول کر لیا ہے۔“

”میرا خیال ہے، رحیم خان آپ کی طبیعت سے واقف نہیں ہے، اس لئے۔“

”آپ تو واقف ہیں۔“ کفیل نے زہر مند سے جواب دیا۔ ”مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ رحیم خان کی شخصیات کے لئے تشریف لائے ہیں۔“

”میرا مخلصانہ مشورہ اب بھی یہی ہے کہ اس بات کو.....“

”پلیز مسٹر صلاح الدین!“ کفیل نے اس کا جملہ کاٹنے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ ضمانت فارم پُر کریں اور قانونی کارروائی کے بعد اسے ساتھ لے جائیں۔“

چنانچہ صلاح الدین نے ضمانت کے کاغذات کی ضروری خانہ پُر کی، پھر رحیم خان کو ساتھ لے گیا۔ جاتے وقت اس نے کفیل کو ایسی ہی نگاہوں سے دیکھا تھا، جیسے کہہ رہا ہو ”تم نے خود اپنے پیروں پر کلباڑی مار لی ہے، آفسر!“



رات بھر اس کا ذہن اس کیس پر ورک کرتا رہا، جسے اس نے پہلی بار بغیر کسی ناجائز اشیاء کے برآمد ہونے پر پکڑا تھا لیکن سوائے بریف کیس کے ٹکڑے کی رنگت گلاس ٹیوب میں جا کر ویلوٹ ہو جانے کے علاوہ اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا، اس کی چھٹی جس نے اسے بھی دھوکا نہیں دیا تھا۔ ماں کی دعاؤں نے ہمیشہ اس کا ساتھ دیا تھا، اس کی چھٹی جس بار بار اس کو یہی باور کرا رہی تھی کہ ہیر وئن کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہے، لیکن کہاں؟ یہ معاملہ ابھی تک اس کے ذہن میں نہیں آسکا تھا۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر اس نے ماں کو صورت حال سے آگاہ کیا، ماں نے حسب سابق اس کو دعائیں دے کر کہا۔

”ایک بات ہمیشہ یاد رکھو میرے چاند! جب کوئی کام خلوص دل سے کیا جائے تو خدا اس میں برکت ضرور دیتا ہے۔ تم پریشان مت ہو، خدا جو کرے گا، بہتر ہی کرے گا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ کیس تمہارے تمام کیسز کے مقابلے میں تمہارے لئے زیادہ فائدہ مند ہو گا۔“

وہ ماں کی بات سن کر خوش ہو گیا۔ آفیشل ایئر پورٹ ڈیوٹی کے علاوہ اسے روزانہ ایک گھنٹے کے لئے دفتر بھی اینڈ کرنا ضروری تھا، چنانچہ وہ ٹھیک نو بجے دفتر پہنچا تو خلاف توقع ڈی جی اور ایک اسٹنٹ ڈائریکٹر جو عام طور سے دس گیارہ بجے تک آرام سے دفتر آنے کے عادی تھے، موجود تھے۔ وہ اپنی میز تک گیا، لیکن کرسی پر بیٹھنے سے پیشتر ہی ایک سپاہی نے آکر اسے سیلوٹ کیا، پھر بولا۔

”سر کفیل! آپ کو ڈی جی صاحب نے طلب کیا ہے۔“

ڈی جی کی طلبی پر اس کا ماتھا ٹھکا، لیکن اس کا ضمیر صاف تھا، اس لئے وہ اسی وقت ڈی جی سے ملنے اس کے دفتر کی جانب روانہ ہو گیا۔ ڈی جی کے پی اے نے انٹر کام پر اندر اس

کے آنے کی اطلاع دی، پھر کفیل سے بولا۔

”صاحب نے دس منٹ بعد آپ کو بلایا ہے۔ تشریف رکھئے۔“  
کفیل خاموشی سے بیٹھ گیا، اس کی بائیں آنکھ پھڑپھڑانے لگی۔ وہ توہمات کا عادی نہیں تھا، پھر بھی اس وقت اس کے دل کے کسی گوشے میں خطرے کی کھنٹی ضرور بج رہی تھی۔  
”یہ آپ نے کہاں ہاتھ ڈال دیا، کفیل صاحب؟“ پی اے نے اس کے لئے چائے کا آرڈر دیتے ہوئے کہا۔ ”رجیم خان بڑے صاحب کا پرانا واقف کار ہے اور صلاح الدین بھی اس وقت اندر موجود ہے۔“

”سوہاٹ؟“ وہ حسب عادت معصومیت سے مسکرا کر بولا۔ ”کسی بہانے سہی، لیکن ہمارے افسران وقت پر دفتر تو پہنچ گئے، اس کا کریڈٹ بھی مجھے جاتا ہے۔“  
”آپ بلاشبہ ایک ذہین، فرض شناس اور ذمے دار آفیسر ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس بار آپ سے کوئی بھول ہو گئی ہے۔“  
”میں سمجھا نہیں؟“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”رجیم خان بہت غصے میں نظر آ رہا ہے، میں صرف ایک منٹ کے لئے اندر گیا تھا۔ وہاں یہی شکایت ہو رہی تھی کہ آپ نے کسی ذاتی مفاد کی خاطر اسے بلاوجہ پھانسنے کی کوشش کی ہے۔“

”ہمارا بھی پیٹ ہے، عدنان صاحب!“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”کبھی کبھی ہمارا دل بھی مرغا غذاؤں کو چاہتا ہے لیکن ترنوالے مجھے ہضم نہیں ہوتے۔ رہا بھول کا سوال تو انسان غلطیوں کا پتلا ہے، ہو سکتا ہے مجھ سے بھی جلدی میں کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔“

چائے کا کپ اس نے بڑی جلدی میں ختم کیا تھا، اس لئے کہ اندر سے انٹرکام کے ذریعے اس کا بلاوا آ گیا تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی اس کی کھوپڑی گھوم گئی۔ رجیم خان ایک صوفے پر اکڑا بیٹھا پائپ لی رہا تھا۔ اس کے برابر صلاح الدین بھی موجود تھا۔ دونوں نے اسے تنہیک آمیز نگاہوں سے گھورا تھا۔

”آپ نے کل کوئی کیس پکڑا ہے؟“ ڈی جی نے اسے خشکیں نظروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”جی ہاں.....“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”گلاس ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعے مجھے ہیروئن کا شبہ ہو گیا تھا۔“

”مال کیا برآمد ہوا؟“

”فی الحال کچھ بھی نہیں۔“

”کیا مطلب؟“ ڈی جی کی پیشانی پر آڑے ترچھے بل نمودار ہو گئے۔

”مجھے کیس پوری طرح انویسٹی گیٹ کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔“ اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

”وہاٹ نان سینس؟“ ڈی جی نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ ”جب کوئی ناجائز اشیاء برآمد ہی نہیں ہوئیں تو انویسٹی گیشن کس بات کی ہوگی؟“  
”میں عرض کر چکا ہوں کہ ٹیسٹ ٹیوب کے مطابق بریف کیس میں کہیں نہ کہیں ہیروئن موجود ہے۔“

”اور اب آپ اس بریف کیس کو جس کے ٹکڑے کئے جا چکے ہیں، مزید ٹکڑوں میں تبدیل کریں گے۔“  
”ہو سکتا ہے سر!“

”اس شخص نے مجھے وہاں بے شمار افراد کے سامنے سڑی سڑی گالیاں دی ہیں۔“ رجیم خان پیچ و تاب کھا کر بولا۔ ”میں ایک نہیں، دس بارہ گواہ پیش کر سکتا ہوں۔“  
”میں نے بھی کفیل صاحب کو سمجھانے کی کوشش کی تھی، سر! لیکن اس وقت موصوف کچھ زیادہ ہی غصے میں بھرے ہوئے تھے۔“ صلاح الدین نے ٹکڑا لگایا۔

”اس سے پہلے بھی آپ کی متعدد رپورٹیں آچکی ہیں۔“ اس بار اسٹنٹ ڈائریکٹر نے کہا۔

”ضرور آئی ہوں گی سر!“ اس کے لہجے میں تھوڑی سی تلخی آ گئی۔ ”جو شخص بھی ایمانداری سے کام کرے گا، اس کے خلاف شکایتیں آنا قدرتی امر ہے۔“  
”موجودہ کیس میں آپ نے کیا ایمانداری دکھائی ہے؟“ ڈی جی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

”میرے پاس وہ بریف کیس موجود ہے، جسے آپ کیمیکل ایگزامینر سے چیک کرا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سو روپے کا نوٹ جس پر مختلف نمبر موجود ہیں، میرے شبے کو تقویت پہنچانے کے لئے کافی ہے۔“

”ہیروئن کی مقدار کتنی ہے؟“ اسٹنٹ ڈائریکٹر نے دوبارہ ٹانگ اڑائی۔

”اس کا جواب مزید انویسٹی گیشن کے بعد ہی دیا جاسکتا ہے۔“

”یہ سراسر بہتان ہے۔“ رجیم خان نے احتجاج کیا۔ ”سو سو کے دونوں نکال کر اس نے میرے سامنے پھاڑے تھے، پھر انہیں اس طرح جوڑا تھا کہ ان دونوں کے ایک ایک نمبر بدل گئے تھے، یہ سب کچھ اس نے جان بوجھ کر کیا تھا۔“

کفیل اس بار بھی خون کے گھونٹ پی کر چپ رہا۔

”کیس کے کاغذات کہاں ہیں؟“

”میری فائل میں۔“

”اسے فوری طور پر داخل دفتر کر دیں۔“

”بہتر ہے۔“ اس نے بظاہر بڑی سعادت مندی سے کہا۔ ”میں اس کی تصدیق شدہ فوٹو کاپیاں ابھی فراہم کر دوں گا۔“

”میرے خیال میں اب آپ کا دل ملازمت سے بھر چکا ہے۔“ ڈی جی نے پہلو بدل کر کہا۔

کفیل خاموش ہی رہا۔

”کیا ممبر صاحب کو اس کیس کی رپورٹ بھیج دی جائے؟“

”آپ بھی بھیج دیں تو زیادہ مناسب رہے گا۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”میں ذاتی طور پر بھی مشیر نامہ، سیزر رپورٹ اور گواہوں کے بیانات کی نقل محترم ممبر کو روانہ کروں گا، اپنی تحریری رپورٹ کے ساتھ۔“

”کیا آپ براہ راست ممبر کے پاس کوئی آفیشل ڈاکومنٹ بھیجنے کے مجاز ہیں؟“

”جی نہیں۔ لیکن موجودہ کیس کی نوعیت کچھ ایسی پیچیدہ ہے کہ اس کا اعلیٰ افسروں کی نانچ

میں آنا بے ضروری ہو گیا ہے۔“

”بغیر کسی ثبوت کے۔“ رحیم خان نے کہا۔ ”کیا تم اس میں یہ لکھو گے کہ تم نے مجھے ہر اس سال کے کتنی رقم طلب کی تھی؟“

”مسٹر سسپیکٹ (Mr. Suspect)“ وہ رحیم خان کی طرف پلٹ پڑا۔ ”پلیز! آپ

ذرا محتاط انداز میں الفاظ کا استعمال کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کے علاوہ آپ براہ راست ڈی جی صاحب سے جو کہنا چاہیں، کہہ سکتے ہیں۔ مجھ سے گفتگو کرنے کا اب آپ کو کوئی حق

نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک مخلصانہ مشورہ اور بھی ہے، آپ یہاں کے علاوہ رشوت ستانی کے جھگے میں بھی میرے خلاف ایف آئی آر کٹوا دیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔“

”مسٹر کفیل!“ اسٹنٹ ڈائریکٹر نے اسے تنبیہ نظروں سے گھورا۔ ”آپ اس وقت ڈی جی کے سامنے پیش ہیں۔ کیا آپ کو آفیشل ڈسپلن کا کوئی خیال نہیں ہے؟“

”سوری سر!“ وہ سر دلچے میں بولا۔ ”اگر ایک ملزم کو یہ حق حاصل ہے کہ براہ راست میرے اوپر کچھ اُچھالے تو پھر فنڈ امٹل رائٹس کے تحت میں بھی اس کا جواب دینے پر مجبور

ہوں، ورنہ میری خاموشی نیم رضامندی بھی سمجھی جاسکتی ہے۔“

ڈی جی نے اس کو قہر آلود نظروں سے گھورا، پھر انٹرکام اٹھا کر پی اے سے کہا۔

”ممبر صاحب کے نمبر ملاؤ، مجھے بے ضروری بات کرنی ہے۔ اٹ! انا ٹاپ پرائیوی

(It is top priority)

کفیل بدستور سنجیدہ کھڑا رہا۔ دس منٹ بعد ڈی جی ٹیلی فون پر ممبر سے اس کے خلاف زہر اُگل رہا تھا۔

”لیس سر! مال کچھ برآمد نہیں ہوا۔ بلاوجہ ایک معزز شہری کو پریشان کیا گیا ہے۔ کاغذات کے بارے میں بھی اس کا کہنا ہے کہ اور بجٹل کے بجائے فوٹو کاپی (تصدیق شدہ) دے گا۔

لیس سر!..... لیس سر!..... جی ہاں! میں پوری طرح مطمئن ہوں کہ اس کیس میں طاقت کا ناجائز استعمال کیا گیا ہے۔ جی، مسٹر رحیم اس وقت میرے دفتر میں موجود ہیں۔ میں انہیں

پہلے سے جانتا ہوں، جناب!..... جی ہاں، سامان نہ صرف کسٹم سے کلیئر ہو چکا تھا بلکہ لوڈ بھی ہو چکا تھا۔ اسے ذاتی اختیار کے تحت مسٹر کفیل نے اپنی اتھارٹی پر آف لوڈ کر لیا ہے۔ بہتر

ہے، میں مسٹر رحیم اور مسٹر صلاح الدین کے بیان لے کر دیگر کاغذات اپنی رپورٹ کے ساتھ روانہ کر دوں۔ جی ہاں، موجود ہے سر!“

اس کے بعد ڈی جی نے بڑی نفرت سے کفیل کو مخاطب کیا۔ ”ممبر آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”لیس سر! کفیل اسپیکنگ۔“ اس نے ریسیور لے کر کہا۔ ”کچھ اہم شبہات ہیں سر! مجھے یقین ہے سر! کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہے۔ آئی ایم سوری سر! چونکہ ملزم اور اس کا ضامن دونوں

یہاں موجود ہیں اس لئے میں اپنے ٹرمپ کارڈز ڈسکلو نہیں کر سکتا۔ جی سر!..... لیس سر..... مجھے بھلا آپ کے حکم سے کیا انکار ہو سکتا ہے؟..... رائٹ سر!“

کفیل نے گفتگو ختم کر کے ریسیور دوبارہ ڈی جی کی طرف بڑھایا۔ ”ممبر صاحب آپ سے مزید بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”لیس سر!“ ڈی جی نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ ”میں بغیر آپ کے حکم کے اس کیس میں..... سوری سر!..... اوکے سر!“ ریسیور رکھ کر ڈی جی ایک لمحے تک ہونٹ چباتا رہا، پھر

اس نے پی اے کو بلا کر حکم دیا۔ ”مسٹر کفیل کے سپینشن آرڈر تیار کر لائیں۔ چارج شیٹ بعد میں تیار کی جائے گی۔ معطلی کے آرڈر میں آپ فی الحال ان ڈسپلن (In Dicipline) مروجہ قانون کا ناجائز

استعمال اور کسی سسپیکٹ کے ساتھ غلط طریقے سے پیش آنا اور نازیبا زبان استعمال کرنے کا ذکر ضرور کر دیں۔ اس کے ساتھ نصیر الدین کے ایئر پورٹ پر تعیناتی کے آرڈر بھی ٹاپ کر لائیں۔“

”اوکے سر!“ پی اے نے بڑی مستعدی سے جواب دیا، پھر باہر چلا گیا۔

”میرے بارے میں کیا حکم ہے سر؟“ کفیل الدین نے بدستور بے پروائی سے دریافت

کیا۔

”آپ کو ممبر صاحب کے حکم پر سسپنڈ کیا جا رہا ہے، اب آپ جا سکتے ہیں۔“  
”تھینک یو سر!“ اس نے سلام کیا، پھر باہر آگیا۔ اپنی میز پر بیٹھنے کے بعد اس نے اپنے  
با اعتماد سپاہی کو کاغذات کی فوٹو اسٹیٹ کے لئے روانہ کیا، پھر کچھ دیر بعد ان کا پیوں کو اپنے  
ڈپٹی سے تصدیق کرانے کے بعد داخل دفتر کر دیا۔

”یہ سب اچانک کیسے ہو گیا، مسٹر کفیل؟“ ڈپٹی کے لہجے میں طنز تھا۔ ”آپ کا شمار تو بے  
حد اچھے اور ایماندار افسروں میں کیا جاتا تھا اور ممبر صاحب تو آپ کو خاص طور پر پسند کرتے  
تھے۔“

”گاہک اور موت کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔“ ڈپٹی نے جو اس کے معطل ہونے پر یقیناً بہت خوش تھا، اسے  
جھوٹی تسلی دے کر کہا۔ ”میں کسی وقت ڈی جی صاحب کا موڈ دیکھ کر آپ کی سفارش ضرور  
کروں گا۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ جناب!..... لیکن میں خدا کے سوا کسی اور کی سفارش پسند  
نہیں کرتا۔ جو کچھ ہوتا ہے، منجانب اللہ ہوتا ہے اور وہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کا  
آخری حقدار ہے۔ جو فیصلے اس کی بارگاہ میں ہوتے ہیں، وہ زیادہ معتبر اور اہل ہوتے ہیں۔“  
”ضبط شدہ مال آپ مال خانے میں جمع کرادیں۔“

”بہتر ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا، پھر دفتر سے باہر آگیا۔ تین روز بعد  
اسے چارج شیٹ بھی مل گئی، جس میں ہر وہ چارج موجود تھا، جس کی بنیاد پر اسے سزا بھی ہو  
سکتی تھی اور ملازمت سے سبکدوش بھی کیا جاسکتا تھا۔

بعد ازاں اس نے فون پر ممبر سے ہونے والی گفتگو کے پیش نظر اپنی جامع رپورٹ تیار کر  
کے روانہ کر دی۔ اس نے اپنی رپورٹ میں سراغ رساں منشیات کے ماہر کشم ہاؤنڈ کی ناکامی  
کا سبب اینٹی ڈاگ اسپرے (Anti dog spray) قرار دیا تھا۔ اس نے واضح انداز میں  
یہ بات لکھی تھی کہ زمانے اور سائنس کی ترقی کے ساتھ جرائم پیشہ افراد نے بھی وہ ترقی حاصل  
کر لی ہے، جو ابھی تک قانون اپنے محدود ذرائع کی وجہ سے حاصل نہیں کر سکا۔ کتوں کے  
ذریعے منشیات کے کیس اس قدر آسان ہو گئے تھے کہ اس کا توڑ پیدا کرنے کی اشد ضرورت  
تھی۔ جس طرح اینٹی میزائل اور اینٹی ایئر کرافٹ کے نئے کامیابی کے ساتھ عمل میں آئے  
تھے، اسی طرح عین ممکن تھا کہ بین الاقوامی پیمانے کے اسمگلروں نے بھی اینٹی ڈاگ اسپرے  
ایجاد کر لیا ہو، جس کے آگے کتوں کی قوت شامہ ناکارہ ہو کر رہ گئی ہو۔ اس کے علاوہ اس نے  
بڑے یقین اور اعتماد سے لکھا تھا، بریف کیس میں اور دونوں سوٹ کیس میں بھی کہیں نہ کہیں

ہیروئن ضرور موجود ہے۔ آخر میں اس نے ممبر سے دست بستہ درخواست کی تھی کہ اس کیس کی  
تفتیش کے لئے انٹر پول کے ماہرین کو طلب کیا جائے، تاکہ آئندہ اس قسم کے کیمرز پکڑنے  
میں کسی دشواری اور ہزیمت کا سامنا درپیش نہ آ سکے۔



اپنی رپورٹ ارسال کرنے کے بعد کفیل بڑی بے چینی سے آنے والے کل کا انتظار کرتا  
رہا۔ ایک ہفتے بعد اس کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے اسے اپنے کمرے میں بلا کر کہا۔

”اور سائے کفیل صاحب! کیسی گزر رہی ہے؟“

”راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔“ اس نے ڈی، ایس کے طنز کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”سر! آپ سے ایک درخواست ہے۔“

”کہیے۔“

”اگر آپ یہ روز روز دفتر کی حاضری کی پابندی ختم کرادیں تو میں کسی تفریحی مقام پر جا

کر کچھ دن سکون سے گزار لوں۔“

”آپ کی انکوائری کا کیا ہوا؟“

”سپرنٹنڈنٹ سرفراز صاحب کو تفتیشی آفیسر مقرر کیا گیا ہے۔“

”کوئی پیشی ہوئی؟“

”انہوں نے خط لکھ کر مجھے بلوایا تھا اور اپنا دفاع کرنے کی دعوت دی تھی، لیکن میں نے

فی الحال ان سے بھی پندرہ دن کی مہلت مانگی ہے۔“

”میں نے اسی سلسلے میں آپ کو بلایا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ آپ کو کوئی مہلت دینے کو تیار نہیں

ہیں۔ آپ کو فوری طور پر مقررہ تاریخ پر ان کے روبرو پیش ہونا پڑے گا۔ اسی میں آپ کی

بھلائی ہے۔“

”کیا یہ مناصب نہ ہو گا کہ تفتیشی آفیسر تحریری طور پر مجھے اپنے ارادے سے آگاہ کر

دیں؟“ اس نے بے حد بنجیدگی سے کہا۔

”آپ میرے مشورے پر عمل کریں۔ ضد کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا، جو بات ایک

بار تحریر میں آجائے پھر اسے حذف کرنا ممکن نہیں ہوتا۔“

”ایسی صورت میں میرے اسی تفصیلی جواب پر بھی فیصلہ صادر کیا جاسکتا ہے، جو میں پہلے

تفتیشی آفیسر کو دے چکا ہوں۔“

”آپ کا کیا خیال ہے، کیا آپ کسی بلیک بیجک کے زور سے رحیم خان کے سامان سے

ہیروئن برآمد کر لیں گے؟“

”مجھے رونا ہوتا رہتا ہے سر! ہو سکتا ہے کہ میرا یہ کیس ایک تاریخ ساز کیس ہو۔“  
 ”جائے میں خواب دیکھنا عقل مندی کی دلیل نہیں ہے۔“ ڈی ایس نے اس بار دوستانہ انداز اختیار کیا۔ ”میری ڈی جی صاحب کے ساتھ آپ کے سلسلے میں بات ہوئی تھی۔ وہ آپ کی سابقہ کارکردگی سے بہت خوش ہیں، سارے اختیارات ان کے ہاتھ میں ہیں، آپ ایک مختصر سامعانی نامہ لکھ دیں تو کیس کی تفتیش ختم کر کے آپ کو ملازمت پر بحال بھی کیا جاسکتا ہے۔“

”کیا رحیم خان بھی یہی چاہتا ہے کہ کیس خاموشی سے ختم کر دیا جائے؟“  
 ”آپ اس کی فکر نہ کریں۔ رحیم خان کو راضی کرنا یا سمجھانا ڈی جی صاحب کا مسئلہ ہے۔“  
 ”معافی نامہ کے علاوہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ کفیل نے بظاہر بڑی سادگی سے دریافت کیا۔

”آپ اس سامان کو واپس کر دیں جو آپ کی کسٹڈی میں ہے۔“  
 ”آئی سی.....“ اس کی آنکھیں کسی آدم خور درندے کے مانند چمک اٹھیں۔ ”گویا رحیم خان کو بھی مال کی واپسی کی جلدی ہے۔ لیکن کیوں؟“  
 ”میری بات غور سے سنیں۔“ ڈی ایس کے تیور پھر بدل گئے۔ میں نے ڈی جی صاحب کو بڑی مشکل سے رضامند کیا ہے، اگر آپ نے میری بات.....“  
 ”نہ مانی تو مجھے ملازمت سے بے عزت کر کے برطرف کر دیا جائے گا۔“ کفیل نے ڈی ایس کا جملہ پورا کر دیا۔

”آپ خاصے سمجھ دار آفیسر ہیں، پھر بھی معاملہ کی تہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ رحیم خان، ڈی جی صاحب کا پرانا واقف کار ہے، اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ معاملہ اسی سطح پر ختم ہو جائے تو زیادہ مناسب ہے۔“

ڈی ایس کی باتوں نے کفیل کو اس بات کا مزید یقین دلا دیا تھا کہ اس کا ہیروئن کی موجودگی کا شبہ غلط نہیں ہے۔ رحیم خان نے یقیناً کوئی ایسا سائنٹفک طریقہ اختیار کیا ہوگا کہ ہیروئن ابھی تک منظر عام پر نہیں آسکی تھی۔ کالی بھیڑیں ہر جگہ میں اچھی خاصی تعداد میں ہوتی ہیں، جن کا ضمیر چند چمکتے سکوں یا بڑے بڑے نوٹوں کی خوشبو سے خرید لیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے جو رپورٹ ذاتی حیثیت سے ممبر کوروانہ کر دی تھی، اس کی بھنگ رحیم خان کو بھی مل گئی ہو اور وہ انٹرپول کے کسی ماہر کے آنے سے قبل ہی معاملے کو رفع دفع کرانا چاہتا ہو۔

”کس سوچ میں پڑ گئے آپ؟“ ڈی ایس نے اسے مخاطب کیا۔

”سوچ رہا ہوں کہ میں نے اپنا کتنا نقصان کیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”رحیم خان نے ایئرپورٹ پر اچھی خاصی بڑی رقم کی آفر کی تھی، جسے میں گنوا بیٹھا۔ مجھے سسپینڈ کیا گیا، جس کی وجہ سے میری ساری ریپوٹیشن بھی ملیا میٹ ہو گئی۔ پورے ڈیپارٹمنٹ والے میری جو عزت کرتے تھے، وہ اب کوڑیوں کے مول ہو گئی سپاہی جو پہلے میرے ساتھ دم دبا کر چلتے تھے، اب سینہ تان کر دندناتے پھرتے ہیں۔“ کفیل نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تو خیر ان باتوں کا عادی ہو چکا ہوں لیکن اگر میری جگہ کوئی اور آفیسر ہوتا تو اس کے دل پر کیا گزرتی؟“

”ملازمت میں اونچ نیچ ہونا پارٹ آف دی گیم ہے۔“ ڈی ایس نے جواب دیا۔ ”کل آپ باعزت طور پر بحال کر دیئے جائیں گے تو آپ کی پوزیشن پھر پہلے جیسی ہوگی۔ رہا ایئرپورٹ پر آپ کے نقصان کا معاملہ تو میں اس سلسلے میں بھی آپ کے کام آسکتا ہوں۔“  
 ”وہ کس طرح؟“ کفیل نے جان بوجھ کر اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ کر پوچھا۔  
 ”رحیم خان اب آپ کو پہلی آفر سے دوگنی رقم دینے کو تیار ہے۔“  
 ”یہ ایک نیا ٹریپ بھی ہو سکتا ہے۔“

”اس کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔“ ڈی ایس نے رازداری سے کہا۔ ”درمیان میں، میں آجاتا ہوں، پھر آپ مجھ سے اپنی امانت جس دن اور جس وقت چاہیں حاصل کر سکتے ہیں۔“

”میں دو ایک روز میں سوچ کر جواب دوں گا۔“

”اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟“

”اپنی روش کو بدلنے کی خاطر تو انسان کو برسوں تپسیا (کوشش) کرنی پڑتی ہے۔ میں نے تو دو ایک روز کی مہلت مانگی ہے۔“ کفیل نے بڑی معصومیت سے کہا۔  
 ”ٹھیک ہے، آپ غور کر لیں لیکن اس بات کا خیال رکھیں کہ دو روز بعد معاملہ میرے بس سے بھی باہر ہو جائے گا۔“

”ایک بات دریافت کر سکتا ہوں؟“

”پوچھئے۔“

”آپ کو اس کیس کو ہش اپ (Hush up) کرانے کے سلسلے میں کتنا فائدہ ہوگا؟“

”ڈونٹ بی کلی۔ اس قسم کی باتیں کھلے عام نہیں کی جاتیں۔“

کفیل خاموشی سے اٹھا اور مسکراتا ہوا واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ڈی ایس بی بی کی باتوں نے اس کو پھر یقین دلا دیا تھا کہ اس کا کیس تاریخ ساز نوعیت کا حامل ہوگا۔ لیکن کس طرح؟ یہ بات خود اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھی۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر رحیم خان

”لیکن ہیر وڈن آخر ہے کہاں؟“ ممبر نے بھی وہی سوال کیا جو لفیل نے ذہن میں راز  
اول سے چکارا ہاتھا۔

”یہ پورا سوٹ کیس اور بریف کیس ہیر وڈن سے بھرا ہوا ہے۔“ مارٹن نے پورے دثوق  
سے کہا۔

”وہ کس طرح؟“

”در اصل ہمیں کسی معتبر ذرائع سے اطلاع مل چکی ہے کہ کچھ بین الاقوامی اسمگلر،  
ایجنسیوں کو ڈانچ دینے کی خاطر ایک نیا اور انتہائی سائنٹیفک طریقہ اختیار کر چکے ہیں۔“ مارٹن  
نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ سوٹ کیس اور بریف کیس جس چمڑے سے  
تیار کیا گیا ہے، اس کو خام صورت میں ایک ایسے پلاسٹک ٹینک میں ڈالا گیا جس میں ہیر وڈن  
پاؤڈر کو محلول کی شکل دی گئی۔ چمڑہ چونکہ خام صورت میں تھا اس لئے وہ اس ہیر وڈن کو اپنے  
اندر جذب کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد اس چمڑے کا سوٹ کیس اور بریف کیس  
تیار کرنے کا عمل کیا گیا، جس کے بعد اس پر اینٹی ڈاگ اسپرے کیا گیا، پھر پالش کر دی گئی۔  
پالش کے بعد بھی ہو سکتا ہے کہ اس پر دوبارہ اسپرے کیا گیا ہو۔ بہر حال ایک محتاط اندازے  
کے مطابق ان دونوں سوٹ کیس اور بریف کیس کے اندر ہیر وڈن کی اتنی مقدار موجود ہے  
جس کی مالیت بیرونی کرنسی میں بھی کروڑوں سے زیادہ بنتی ہے۔“

”اور اب یہ ہیر وڈن پاؤڈر فارم میں کس طرح آئے گی؟“ ممبر نے دلچسپی لیتے ہوئے  
سوال کیا۔

”اس کے لئے ہم ابھی ریسرچ کر رہے ہیں اور بہت جلد اس فارمولے کو ڈی کوڈ کرنے  
کا طریقہ دریافت کر لیں گے۔“ مارٹن نے کہا، پھر بڑے ادب سے بولا۔ ”سرا! میں آپ سے  
درخواست کروں گا کہ یہ ضبط شدہ سوٹ کیس اور بریف کیس ہماری تحویل میں دے دیا جائے،  
جس کے لئے ہم آپ کی حکومت کے شکر گزار ہوں گے اور اس کے ذریعے ڈی کوڈ کرنے کا  
فارمولا تیار کرنے میں ہمیں مدد ملے گی۔“

”اوکے، میں کوشش کروں گا کہ حکومتی سطح پر آپ کی درخواست رد نہ ہو سکے۔“

تفتیش کو انتہائی راز میں رکھا گیا تھا تا کہ اس کی بھٹک کسی اور کو نہ مل سکے۔ مارٹن کی  
رپورٹ کے بعد رجیم خان کو اریسٹ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ ملک سے فرار ہو چکا تھا،  
اس لئے فوری طور پر اس کے ضامن صلاح الدین کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس تمام کارروائی نے  
محکمے کے بڑے بڑے افسران کے بھی کان کھڑے کر دیئے۔ خاص طور پر ڈی جی بہت  
پریشان تھا، لیکن ممبر نے اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کی، البتہ تادیبی کارروائی کے  
پیش نظر اور سزا کے طور پر اس کا تبادلہ ایک دور دراز علاقے میں کر دیا۔ ڈی جی کے علاوہ کچھ

بے قصور ہوتا تو بار بار اسے خریدنے کی خاطر مختلف ذرائع استعمال نہ کرتا۔

❖.....❖.....❖

انٹر پول کا چیف انسپکٹر مارٹن جوزف بڑی توجہ سے دونوں سوٹ کیس اور بریف کیس کو  
دیکھ رہا تھا۔ چیف انسپکٹر کے علاوہ ایک کیمیکل ایگزامینر بھی اس کے ساتھ باہر سے آیا تھا۔ یہ  
تمام کارروائی ممبر کے حکم سے آفیشل طور پر ایک بند ہال میں عمل میں آرہی تھی، جس کے باہر  
گارڈز کا سخت پہرا لگایا ہوا تھا۔ جس حال میں تفتیش کا عمل ہو رہا تھا، وہاں باہر سے آئی ہوئی  
ٹیم اور لفیل کے علاوہ کسی بھی رینگ کے کسی دوسرے آفیسر کو داخل ہونے کی اجازت نہیں  
تھی۔ حکومت کی طرف سے بھیجی ہوئی دعوت کو انٹر پول والوں نے خوشی سے منظور کر لیا اور  
آنے جانے کے اخراجات لینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

دو روز تک تینوں افسران سر جوڑے بیٹھے سوٹ کیس اور بریف کیس کے ٹکڑوں کو اُلٹتے  
پلٹتے رہے، سوٹ کیس اور بریف کیس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کئی بار میٹ نیوب سے  
گزارے گئے، ہر بار ان کا رنگ دلیوٹ ہو گیا، جو اس بات کا ثبوت تھا کہ ہیر وڈن کہیں نہ کہیں  
موجود ہے۔ تیسرے روز چیف انسپکٹر مارٹن جوزف کی نگاہیں چمک اٹھیں، اس نے لفیل سے  
ہاتھ ملاتے ہوئے بڑی گرم جوشی سے کہا۔

”میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں، مسٹر لفیل! آپ نے ایک ایسا کیس پکڑا ہے، جس کے  
سلسلے میں ہم ابھی اپنے افسروں کو ٹریننگ دے رہے ہیں۔ لیکن ایک سلسلے میں ہمیں بھی ابھی  
تک کامیابی نہیں ہوئی۔“

”وہ کیسا سر؟“

”اس ہیر وڈن کو دوبارہ پاؤڈر فارم میں لانے کا کیا طریق کار اختیار کیا جائے؟“

”لیکن سرا! ہیر وڈن ہے کہاں؟“

”اس کا جواب میں آپ کو اپنے کیمیکل ایگزامینر کی رپورٹ کے بعد ہی دے سکوں گا،

قبل از وقت میں کچھ نہیں کہوں گا۔“

پھر ایک ہفتے بعد اس ہال میں ایک شخص کا اور اضافہ ہو گیا۔ وہ شخص ممبر پورڈ آف ریونیو  
کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ پورے محکمے میں اس کیس کے سلسلے میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ پہلی بار کسی  
کیس کی تفتیش کے لئے بیرون ملک سے ماہرین کو طلب کیا گیا تھا اور اب ممبر بذات خود بھی  
اس تفتیش میں شریک تھا۔

”سرا! مارٹن جوزف نے ممبر سے کہا۔ ”یو مسٹ بی پراؤڈ آف مسٹر لفیل۔ اس آفیسر نے  
ایسا کیس پکڑا ہے، جو ابھی تک پوری دنیا کی کوئی ایجنسی بھی ڈیٹکٹ (Detect) کرنے میں  
کامیاب نہیں ہو سکی۔“

اور بڑی مچلیوں کے تبادلے بھی عمل میں لائے گئے تھے۔

چیف انسپکٹر کی کارروائی مکمل ہونے اور اس کی رپورٹ ملنے کے بعد کفیل کو باعزت طور پر بحال کر دیا گیا۔ حکومت کی طرف سے گولڈ میڈل اور کیش انعام سے بھی نوازا گیا۔ اس کے علاوہ مارٹن جوزف کی سفارش پر انٹرپول کی طرف سے بھی اسے پچاس ہزار ڈالر کا اپیشل ریوارڈ اور تعریفی سرٹیفکیٹ دیا گیا، جو اس کے اور حکومت دونوں کے لئے ایک بڑا اعزاز تھا۔ کفیل کو خوشی تھی کہ اس کی محنت رائیگاں نہیں گئی تھی۔ قدرت نے اسے اس کی ایمانداری پر نوازنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا تھا، چوہے بلی کا کھیل ختم ہو گیا تو کفیل نے ممبر سے مل کر کہا۔

”سر! میں ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔“

”کہو؟“

”آپ ازراہ نوازش میرا تالہ ایئرپورٹ سے کہیں اور کر دیں۔“

”کیوں؟“

”اس لئے سر! کہ وہاں سب کی نظریں لگی ہوتی ہیں۔“ وہ دبی زبان میں بولا۔ ”میری

وجہ سے دوسروں کو نقصان بھی ہوتا ہے۔“

”نی الحال آپ کا تبادلہ ممکن نہیں ہے۔“ ممبر نے اسے شاباش دیتے ہوئے کہا۔

”انٹرپول کی جانب سے سفارش کی گئی ہے کہ آپ جیسے ایماندار اور ذہین افراد کو ایئرپورٹ پر

ڈیپارچر ہی میں رکھا جائے۔“

”لیکن سر.....!“

”مجھے تمہارے اوپر فخر ہے، کفیل!“ ممبر نے اس کی بات سننے بغیر اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔ ”تم شاید اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں نے تمہاری معطلی کے آرڈر دیتے وقت کس اذیت کا سامنا کیا تھا۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ تمہارے والد نے تمہارے سلسلے میں مجھ سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ مجھے بھی یقین تھا کہ تم نے جو کچھ کیا ہے، وہ دیانتداری سے ہی کیا ہوگا۔“

”تھینک یو دیری، سر!“

”مجھے اُمید ہے کہ تم آئندہ بھی اسی طرح محنت سے کام کرو گے اور اپنے ملک کا نام بھی

روشن کرو گے۔“

”میں صرف کوشش کروں گا سر! کامیابی اور ناکامی خدا کے اختیار کی بات ہے۔“

”کل میں واپس جا رہا ہوں۔ جاتے جاتے تمہیں ایک خبر اور سنانا چاہتا ہوں۔“ ممبر

نے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے بڑے فخر سے کہا۔ ”تمہاری اعلیٰ کارکردگی کے عوض تمہیں ترقی

دے کر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز کیا جا رہا ہے۔“

”شکریہ سر!“ اس نے ممبر کو سلوٹ کیا، پھر ان کے دفتر سے باہر آ گیا!

اس کی ترقی کی خبر سن کر لڑنے لگے افسران کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگے تھے۔ ممبر کے تبادلے کے بعد اس کو کن دعواریوں کا سامنا کرنا پڑا، یہ ایک الگ کہانی ہے۔

(تمت بالآخر)



گل و گلزار سے راہ پر خارتک ایک مسافر بے نوا کی رودادِ حیات

# مُساَفر

## ناصر ملک

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مُساَفر..... زندگی مسافت..... اور اعمال زاد سفر ہوتے ہیں۔

وہ بھی آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا تھا۔ جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا۔  
جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان  
ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے، خاموش فضاؤں میں  
طوفان چھپے ہوتے ہیں..... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے تب  
ایسے میں مسافت طویل..... بہت طویل ہو جاتی ہے مگر مُساَفر ہر موڑ پر ایک نئی  
داستان رقم کر کے آگے بڑھتا جاتا ہے..... دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز  
کردینے والی ایک ایڈونچرس داستان مکمل سیٹ چار جلدوں میں شائع ہو گیا ہے

قیمت مکمل سیٹ -/1600 روپے

القريش پبلی کیشنز

سرکھروڈ، چوک اردو بازار لاہور

فون: 37652546 - 042-37668958